دِل سمندر آشنا

رشید انجم

دل سمندر آشنا

(افسانے)

مصنف

رشید انجم

(تفصیلات کتب)

نام کتاب : دل سمندر آشنا

مصنف : رشید انجم

سن اشاعت : فروری ۲۰۰۸ء

تعداد ۵۰۰ : 200/ روپے

سرورق : سیّد شبلی نعمانی (کراچی، پاکستان)

کمپوزنگ : محمد شاکر ندوی دیولی ضلع ودیشہ (ایم۔پی) M. 9826483548

ناشر : رشید انجم ۔ ۴۷/ کاشانہ اسلام پورہ، بھوپال 462001 ایم پی

فون : 0755-264611

موبائل : 09301081576

ملنے کے پتے :

: ۴۷/ کاشانہ، اسلام پورہ بھوپال 462001 ایم پی

: بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال 462001 ایم پی

: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

: روفی انٹرنیشنل۔ سکس فلور۔ کمرشیل سینٹر مسجد بند روڈ۔

محمد علی روڈ بمبئی -6

انتساب

عصری ادب کے ممتاز افسانہ نگار

جناب **نعیم کوثر** کے نام!

نام	:	عبدالرشید خاں (رشید انجم)
والدین	:	میاں عبدالرحیم خاں / سیدہ شفیعہ بیگم مرحومین
پیدائش	:	۱۰/فروری ۱۹۴۰ء بھوپال (مدھیہ پردیش)
تعلیم	:	بی۔اے آنرز۔
شادی	:	۲۸/مئی ۱۹۶۰ء ہمراہ بلقیس بیگم
ادبی سرگرمیاں	:	ابتدا شاعری سے ہوئی۔ تملیذ جناب ارشد صدیقی مرحوم اور جناب نصیر پرواز صاحب۔
		☆ ڈراموں اور ایڈونچرس ناول اور ارشد صدیقی ایک مطالعہ (ترتیب۔ نصیر پرواز اور رشید انجم) پر مشتمل ۱۴ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔
صحافت	:	۱۹۷۰ء میں "فلم دیش" (فلمی) ۱۹۷۴ء میں "سمجھوتہ" اور ۱۹۷۶ء "گل مُہر" ویکلیز بھوپال سے جاری کئے۔
		☆ ۲۰۰۳ء سے اردو پندرہ روزہ صدائے اردو بھوپال میں مدیر معاون
اسٹیج ڈرامے	:	ملک کے دیگر شہروں بشمول بھوپال گیارہ اسٹیج ڈرامے اسٹیج ہو چکے
اعزازات	:	ادبی اور فلمی خدمات کے لئے چھ اعزازات حاصل ہوئے۔

فہرست مضامین

(۶)

اردو افسانہ اور بھوپال۔ایک جائزہ

رشید انجم

کسی فلسفی سے پوچھا گیا۔"تمہارا کیا خیال ہے" نقاد مصور ہوتے ہیں'؟

فلسفی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔اس نے اسطرح تجزیہ پیش کیا۔"جو جس فن پر زیادہ بولتا ہے وہ اُس سے اُتنا ہی ناواقف ہوتا ہے۔فنکار اور نقاد میں فرق یہی ہے کہ نقاد میں حُسن زن نہیں ہوتا۔اس کا ذہن خشک ہوتا ہے۔وہ ہر شے میں عیب تلاش کرتا ہے اور جب عیب اُسے مل جاتے ہیں یا وہ نکال لیتا ہے تو یہی اسکی تسکینِ قلب کا باعث بن جاتے ہیں۔اُس کے برعکس فنکار (مصوّر) ہر شے میں قدرت کی صناعی دیکھتا ہے، دستِ قدرت کی نازک ہنرمندی کو تلاش کرتا ہے اور جب اسکے ہُنر مند ہاتھ فنِ مصوری کے رنگ اُبھارتے ہیں تو نگاہ و دل کو پُر کیف و پُر جمال فطری حسن کے مفہوم کی سوغات ملتی ہے، نقاد بولتا ہے جبکہ مصور خاموش زبان سے اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔"

گزشتہ صفحات میں، میں نے افسانے کی ساخت، اس کی ماہیت، اسکے عمل، اسکی ترسیل، اسکی مصالحانہ ترغیب، اسکے اسٹرکچر، اسکے توازن و غیر متوازن مزاج، اسکے بدلتے لہجے، اسکی ابتداء اور ارتقائی سفر کے ہمراہی قلمکاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اپنے کئی پیش رو تبصرہ نگار، تنقید نگار اور جائزہ نویسوں کی تحریرات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے طور پر ان کی نفی و پیروی کی ہے۔اُن میں وقار عظیم۔ڈاکٹر صادق، اطہر پرویز۔عاشور کاظمی وغیرہ کے نام نُمایاں ہیں۔میرے اس جائزے پر نقاد جسطرح چاہیں اسمیں عیب تلاش کرلیں، معتدل مزاج اُسمیں کچھ تخلیقی نظم وضبط کا حاصل جان لیں اور تبلیغ ادب کے پاسبان آنکھوں کی شہادت سے شمعِ بصیرت لے کر اُسے ادبی توقیر سے نواز دیں۔بہر حال میری یہ ایک کوشش ہے جس میں آبرو مند متاعِ سخن بھی ہے اور فن کی پرستش بھی، میں نے زبان کی میناکاری سے لفظیات کی نقش گری نہیں کی ہے۔یہ میرا عملی شعور ہے جس نے میری فکر و نظر کو اچھوتی لذت اور منفرد احساس کی تلاش کا فریضہ عطا کیا۔اور میں نے اپنی کوشش اور کاوش سے قلم شناس اعتبار دینے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔یہ اس وقت پتہ لگ پائے گا جب مبصر حضرات اسے تبصرہ کے زمرہ میں شامل کرلیں گے اور چشمِ بصیرت سے اس جائزے کو دیکھ اور پرکھ کر اس پر اظہارِ خیال کریں گے!

("اردو افسانہ ایک جائزہ" یہ مضمون انتساب سہ ماہی میں شائع ہونے جارہا ہے)

اس طویل تمہید کا مقصد اب بھوپال کے اس افسانوی ادب کا جائزہ پیش کرنا ہے جس کے بارے میں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تا حال گہرائی اور عمیق نظر سے اس کا جائزہ نہیں لیا گیا۔کچھ مضامین میری نظر سے گزرے ہیں مگر ان سے تشنگی قائم رہتی ہے۔کماحقہٗ ان تمام افسانہ نگاروں کو ان تمام کہانی کار ادبا کو ضابطہ تحریر میں نہیں لایا گیا جنھوں نے بھوپال میں افسانوی ادب کی افزائش کی اور ستائش سے محروم رہے۔میں نے ان تمام افسانہ نگاروں کی فکری اساس پر قلم اٹھایا ہے جنہوں نے افسانوی ادب میں کلیدی کردار ادا کیے ہیں۔ان کو بھی ضابطہ دیا ہے جنکی ابتداء افسانہ نگاری سے ہوئی مگر جلد ہی انہوں نے اس میدان

میں جوہر دکھانا غالباً تضیع اوقات جانا اور شعر وسخن کی سمت اپنے ذہن کو محوِ پرواز کر دیا۔ ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، جنھوں نے زمانہ طالب علمی میں ایک دو یا تین افسانے اپنے شوق کی تسکین کی خاطر لکھے اور کالج میگزین یا مجلہ سیفیہ میں شائع ہو کر مطمئن ہو گئے کہ چلو ہم نے بھی ادب کے لبوں پر اوس سجادی! آج انہیں کوئی نہیں جانتا اور نہ فاضل مضامین نگاروں نے اُن قلمکاروں کی کاوش تک رسائی پانے کی کوشش کی۔ شاید اسلئے بھی کہ وہ قلمکار، قد آور ادیبوں کی دنیا میں بونے ہیں۔۔ میں نے انہیں بونا نہیں سمجھا۔ اُن کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے اور روایتی صف میں ہوتے ہوئے بھی انہیں ضابطۂ ادب کی مجلس میں جگہ دے کر اُن کے نام تخلیقی ادب میں شمار کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ چونکہ انہیں ناپختہ قلمکاروں سے نئی فکری جدوجہد کا دریچہ کھلتا ہے اور نئی امیجری، تازہ بہ تازہ نشریاتی زندگی کے شعور کی سرگوشیاں عصری گونج بنتی ہیں اور تاریخ وجود میں آتی ہے جو ادب کا سرمایہ اور انسانی وراثت کی امین ہوتی ہے اور اسی سے قومیں نسلِ انسانی کا ضابطہ طے کرتی ہیں!

ملک میں جب افسانوی ادب نئے تجربات اور تازہ کار مشاہدات سے گزر رہا تھا تب بھوپال میں نئے ذہن، خیالات، فکر و احساس کی تابناکی سے روشن ہو رہے تھے۔ قلم جنبش میں تھا اور انگلیاں قلم کے توسط سے ادب کے چہرے پر بیباک نقوش ابھارنے کی کوشش میں سرگرداں تھیں۔ ایک طرف شاعری کے نئے جہان تلاش کئے جا رہے تھے، صحافت کے افق کو خورشید بدنی مل رہی تھی۔ تحقیق وتنقید کے میدان سر کئے جا رہے تھے تو دوسری طرف افسانے نئی جہت کے اسلوب تراشنے لگے تھے۔ رنگ اپنی زبان بول رہے تھے اور قاری ارتقاء کی نو دریافت شاہراہوں پر اپنے مانوس قدم رکھ چکا تھا۔ اسے لہجے کی روانی سمجھنے، تلفظ لکنت پہچاننے اور ادبی تعبیر کی متضاد سمتوں کو یکجا کرنے میں کوئی دقت نہیں رہی تھی۔ نیا گروہ اپنا ایک الگ قلعہ بنا رہا تھا تو روایتی شان نے بھی اپنے ادراک کے دروازے بند نہیں کئے تھے، گو کہ اس گروہ میں کچھ ایسے نام بھی تھے جو قلم برداشتہ نہیں تھے۔ قلم نے انگلی کی جنبش کو جسطرح قبول کیا لفظیات کا چہرہ ابھار دیا لیکن زیادہ تر ادیب لفظوں کی پیکریت اور قلم کی نشتریت سے بخوبی واقف تھے۔ اُن کے پاس خیالات وافکار کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ وہ تمام جدید وقدیم اسلحہ سے لیس تھے اور مبارزت کے ہر حربے سے نبرد آزما ہونا جانتے تھے۔ ان میں سید علی کوثر چاند پوری اور انعام اللہ خان قمر جمالی سرفہرست رہے۔ حالات، معاملات، سماجی مسائل کی پیچیدگیاں، عشق ومحبت کی دشت پیمائی، ادوار اور زمانے کی بدلتی سمتیں، تبدیل ہوتے ہوئے موسم، عصری شعور سے ذہنی آگہی میں پیدا ہوتی گونج، سیاست کے کھیل سے بدلتا معاشی اور غیر معاشی نظام، قدرت کے اسرار ورموز، مقدرات کے پاسنگ میں کبھی اوپر اُٹھتے کبھی نیچے گرتے انسان کے اعمال، مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی پاسبانی اور پامالی۔ تاریخ سے جُوتے ماضی کے رشتے۔ محاذِ شکست وریخت کی زمینوں میں گھونسلا ڈھونڈتے انسانی حوصلے۔ حال کی دہلیز پر قدم اٹھاچکے تفکرات اور مستقبل کے اندھیروں کے نادیدہ دروازوں پر اجالے کی دستک دیتی نئی اور بیدار نسل کی کاوش حیات! بھوپال کا بیدار ذہن اور روشن فکر وفن سے آگاہ قلم کاران مشاہدات اور تجربات سے جسقدر تیزی سے فاصلے طے کر رہا تھا اتنی ہی برق رفتاری سے اپنے افسانوں میں نئے موضوعات کی نمائندہ تراش خراش میں مصروف تھا!

بھوپال ہمیشہ سے علم وادب، شعر وسخن، دھرم ومذہب قومی وملی اور تہذیب وتمدن کی روایت کا قائل اور ایک جان دوستی پر مائل رہا ہے۔ اس شہر نے جہاں، جہان آشنا شعراء کو ہمہ گیریت بخشی وہیں نثری ادب کو اجتماعی صف میں جگہ دی۔ اس نثری ادب میں جہاں دیگر اصناف کو روئیدگی حاصل ہوئی وہاں افسانہ اور ناول کے افق پر بھی امکانات کے سورج طلوع

ہوئے۔ افسانوی فن کو پختہ کار انداز حاصل ہوا۔ محدود اور مخصوص نیز مروجہ افکار و خیالات نے نئی تحریکات نئے رجحانات اور تابہ کار بصیرتوں کو اس طرح قبول کیا کہ اردو ادب کا توازن بھی نہ ڈگمگایا اور متصادم ہونے کے مواقع سے بچ کر رہا۔ کوئی فکر، کوئی رجحان، کوئی جوش، کوئی ولولہ، کوئی خیال، کوئی سوچ جب ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہوتی ہے تو اُس نئے عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جنہیں اپنائے بنا ارتقائی اصول کی پابندی ممکن نہیں ہے۔ اسے ہم علمی تفتیش Literary Investigation کہہ سکتے ہیں اور یہ علمی تفتیش جب ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے تو واقعات کا تسلسل نئے باب کھولتا جاتا ہے اور ایک احساس جسے حقیقت کے گہرے شعور کی آگہی ہو، الفاظ کے شیشے سے فکر وادراک کے نئے موضوعات تراش لیتا ہے اور صفحۂ قرطاس پر ایسے کردار جی اٹھتے ہیں جو ہوتے تو ہمارے اپنے ہیں مگر ہم پہلی بار کسی کہانی کے توسط سے انہیں پہچان پاتے ہیں!

منشی پریم چند نے ۱۹۰۵ء میں اپنا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" لکھا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہونچا دیا تھا، اسکے ٹھیک تین سال بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں بھوپال کی مژگان ادب پر افسانے کی سرکش عبارت تحریر ہوئی۔ جب نیاز فتحپوری، بھوپال کے قدرتی مناظر کی دلنشیں وادی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی ماحول سے اتنا متاثر ہوئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ یہ زمانہ گویا اس آغاز کی تمہید تھا جو اپنے جلو میں ایک ناقابلِ فراموش افسانوی ادب کی کائنات کا سلسلہ کریں لئے قافلہ در قافلہ چاند نگر کو فتح کرنے نکل چکا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری کے عالمانہ ذہن اور دوررس نگاہوں نے اس شہر کی علمی زرخیزیت کو پہچان لیا اور چونکہ اُن کی ذات تسلیم شدہ قلم کی صداقت اور دانش و علم کی علم بردار تھی، لہٰذا انہیں کی کوششوں سے بھوپال کی ادبی فضاؤں میں افسانے کی نئی آواز اور جدید لہجے کی صدا جاگ اُٹھی!

سید علی کوثر چاند پوری ۱۵ سال کی نوخیز عمر میں بھوپال آگئے۔ اسی زمانے میں علامہ نیاز فتحپوری اردو ادب کو نئے جہانوں کی سیر کرانے کا عزم کر چکے تھے۔ اس کاروان عزم و عمل میں جو سب سے پہلے شامل ہوا وہ سید علی کوثر چاند پوری تھے جنہوں نے بھوپال کے افسانوی ادب میں اپنی نمائندگی درج کرائی اور سپاہیانہ شان سے اردو کا پرچم اٹھائے افسانے کی مسافرت پر نکل کھڑے ہوئے۔ علامہ نیاز فتح پوری ۱۲ سال قیام کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں بھوپال کو خیر آباد کہہ گئے لیکن بھوپال نے اس عمارت کو فلک بوس کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی جس کی بنیاد نیاز فتح پوری اور سید علی کوثر چاند پوری ڈال چکے تھے!

اس کاروانِ عزم و عمل میں جن پاسبان ادب نے مسافرت کی صعوبتیں برداشت کیں اُن میں سید محمد یوسف قیصر، سید ذوالفقار الحق، محوی صدیقی، مفتی انوار الحق، اور ارشد تھانوی کے نام شامل ہیں:۔

محترمہ یاسمین افتخار نے اپنے مضمون "بھوپال میں افسانہ۔ ایک جائزہ" (مطبوعہ فکر و آگہی بھوپال نمبر ۱۹۹۶ء) میں بہتر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں سید علی کوثر چاند پوری کے بعد جن نمایاں ناموں کا ذکر کیا ہے، وہ مذکورہ بالا اصحاب ہیں۔

محترمہ یاسمین افتخار لکھتی ہیں

"افسانہ نگاروں کی اس کہکشاں کے چمکنے کا وہی زمانہ تھا جو پہلی جنگِ عظیم کا دور تھا۔
جنگِ عظیم نے تمام زندگی پر جو اثرات مرتب کئے اُن کی جھلک ان

افسانہ نگاروں کے فن میں موجود ہے اور یہی ان کی امتیازی شان ہے''۔

بھوپال کے افسانوی ادب نے ہر دور میں زمانے کی شدائد کو پوری طرح محسوس کیا۔ سرخ تحریک نے جب اپنا پرچم بلند کیا تو طبقاتی نظام میں شور برپا ہو گیا، کیمونزم نے سرمایہ دارانہ نظام کے ناقابلِ تسخیر قلعوں میں سیندھ لگائی تو مزدور پیشہ طبقہ اپنی روشن اور تابناک منزلوں کا پتہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس تحریک نے جہاں آدمی کو نچلی سطح سے اُٹھا کر اونچی صف میں لا کے سرمایہ دارانہ نظام Capitalism کے برابر لا کھڑا کرنے کی انقلابانہ Ism کو جنم دیا وہیں ہندوستان کی فرسودہ روایتیں، بندھی ٹکی، فرسودہ زندگی میں آتشی، بیداری کا نیا نغمہ سنائی دیا۔ پردوں میں مقید چہرے جلوہ گر ہونے لگے تو کہانیوں میں بھی تنوع آیا اور اُس میں پر شوخ تاثراتی لطافت کا حسن کار قلم اُبھر کر نئے افق روشن کر گیا۔

محترمہ یاسمین افتخار نے اس سماجی بیداری کے عکاس جن قلمکاروں ذکر کیا ہے اُن میں ابوسعید بزمی اور قدوس صہبائی کو سر فہرست رکھا ہے چونکہ دونوں قلمکاروں میں وہی دو آتشہ کیفیت پائی جاتی تھی جو خواجہ احمد عباس کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان قلمکاروں کی شہ پا کر جن اصحاب نے اس صنف میں اپنے جوہر آزمائے ان میں اختر سعید خاں، محمد علی تاج، عشرت قادری، منظور سروش، شاغل فخری اور عنبر چغتائی کے نام لئے جا سکتے ہیں!

چونکہ اختر سعید خاں، محمد علی تاج، اور عشرت قادری کے خمیر کی اُٹھان شاعری سے ہوئی تھی اسلئے بہت جلد انہوں نے افسانے کو چھوڑ کر شاعری کے میدان فتح کرنا شروع کر دئے!

افسوس کہ آج ان حضرات کا افسانوی سرمایہ میسر نہیں ہے۔ جس سے اندازے قائم کئے جا سکتے کہ اردو شاعری کے ان شہسواروں نے کہانی میں کیا گُل کھلائے تھے!

دوسری جنگِ عظیم، پہلی جنگِ عظیم کی دھمک سے پیدا ہوئی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کی ہولناکیاں زمانے گزرنے کے بعد بھی ایک طویل حادثاتی، ظلم و سفاکی اور نسل انسانیت کی خوں آشام داستانیں چھوڑ گئی تھی۔۔ غالباً یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو ایک احتجاج کی شکل میں قائم کیا اور نہ صرف مرکزی اردو زبان نے اس کا پُر جوش خیر مقدم کیا بلکہ عالمی ادب پر بھی اسکے نقوش ثبت کئے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بھی اس تحریک نے توانا اور جنوں ساماں تائیدی کردار ادا کیا۔ آزادی سے قبل یعنی انضمام سے پہلے جن قلم کاروں نے افسانے پر توجہ دی ان میں علامہ محوی صدیقی کا نام ابتدائی دور میں لیا گیا ہے۔ محوی صدیقی مرحوم نے بچوں کے لئے ہلکے پھلکے انداز میں جو کہانیاں لکھیں وہ فنی اعتبار سے تو افسانہ نہیں بن سکیں لیکن مرحوم کی تحریر میں سلاست اور اصلاح پسند انداز رہا جو بچوں کے معصوم ذہنوں پر خوشگوار تاثر مرتب کرنے میں کامیاب ہوا۔

ابوسعید بزمی بھوپال کے نثر نگاروں میں اس دور کا اہم نام تھا۔ مرحوم اخبار سے بھی وابستہ رہے اور صحافت کو پیشے سے زیادہ صحافت کو ایماندارانہ رویوں سے اپنایا۔ مرحوم نے افسانے بھی لکھے جو ۱۹۴۶ء میں ''زندگی کے جائزے'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد نعمان خان نے ان کے کچھ افسانوں ''زندگی کے دو ورق''۔ ''زندگی کی امنگیں'' ''رفیقِ زندگی'' ''عید کی قربانی'' اور ''کیا یہ سچ ہے'' کا جائزہ لیتے ہوئے جو تبصرہ پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوسعید بزمی کے ان افسانوں میں حقیقت آفرینی تو ہے لیکن رچاؤ کی کمی ہے اور ان میں اصلاح کے ساتھ صحافیانہ رنگ اسقدر نمایاں

ہوا ہے کہ وہ افسانے کی ساخت پر کامل نہیں اترتے (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد، صفحہ ۱۶۰)

ابوسعید بزمی بھی اسی کاروانِ ادب کے مسافر تھے جس میں سید علی کوثر چاند پوری شامل تھے۔ ان کے ساتھ جو تیسرا اہم مسافر شامل ہوا وہ قدوس صہبائی تھے۔ قدوس صہبائی نے اسی دور میں اپنی افسانوی زندگی کا آغاز کیا تھا جب ترقی پسند تحریک کی انقلابی دستک ذہن کے کواڑ پر گونج پیدا کر رہی تھی، ۱۹۳۳ء سے ان کا ادبی سفر شروع ہوا، وہ بیک وقت جرنلسٹ بھی تھے اور Translater بھی۔ موپاساں کے افسانوں کو بہت آسان زبان دے کر قدوس صہبائی نے اردو قالب میں ڈھالا تھا، یہ تمام تراجم ''ولولے'' کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے'' کروٹیں '' ''زلزلے ''اور ''اندھیرے'' ۱۹۴۵ء میں اور اسی سال ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''نئے خاکے'' بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں ''چھالے'' ''سات کنوارے''
۔ ''منتخب افسانے ''اور ''پریم پجارن'' اسکے بعد میں شائع ہونے والے مجموعے تھے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان ان کے افسانوں کا مجموعی جائزہ لیتے لکھتے ہیں'' اسطرح قدوس صہبائی نے ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو کر زندگی اور سماج سے متعلق مختلف مسائل کو افسانوں میں پیش کیا ہے اور وہ اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں'' (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد، صفحہ ۱۶۷)

۱۹۴۴ء میں ترقی پسند تحریک نے جب بھوپال میں اپنی پرچم کشائی کی تو اسکی سلامی کو جو ہاتھ اٹھے وہ صحافی، شاعر اور افسانہ نگاروں کے ہاتھ تھے۔ ان میں دو نام بے حد نمایاں تھے۔ قمر جمالی اور سلمان الارشد۔ سلمان الارشد کو چونکہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں جنرل سکریٹری کا عہدہ تفویض ہوا تھا، لہٰذا انہوں نے اس عہدے کا پاس بھی رکھا اور ترقی پسند مصنفین کی روشن و تابناک ساخت بھی قایم کرنے میں اپنے تازہ کار ذہن سے افسانوں کو جدید لہجے کی تراش خراش دی تھی۔ ان کے افسانوں میں رومانیت بھی ہے اور سماجی مسائل بھی۔ سلمان الارشد کا اولین افسانوی مجموعہ ''تصورات'' دوسرا ''سوز حیات'' اور تیسرا ''ناسور'' ۱۹۴۴ء میں بھوپال سے اور چوتھا مجموعہ ''جھوٹے سپنے'' بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ ایک ناولٹ ''رنگین راتیں'' بھی اسی دوران شائع ہو کر دادو تحسین پانے میں کامیاب رہا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد سلمان الارشد نے اختر جمال اور اسد محمد خان کی طرح پاکستان میں بودوباش اختیار کر لی اور جلد ہی وہاں کی ادبی دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے لگے۔

قمر جمالی اس تحریک کا اہم نام ہی نہیں بے حد نمایاں وجود بن کر ابھرے۔ انہوں نے اپنے لکھنے کا آغاز افسانے ہی سے کیا تھا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا تھا کہ تقریباً سو سے زیادہ افسانے انہوں نے لکھے تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ادبی رسالہ میگزین یا ہفت روزہ ایسا رہا ہو جسمیں ان کا کوئی افسانہ شائع نہ ہوا ہو۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ ''کشتی'' ۱۹۴۲ء میں روزنامہ ''ندیم'' کی ہفت روزہ اشاعت میں شائع ہوا۔ محمود الحسینی صدیقی اسکے مدیر ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ مسلسل افسانے لکھتے رہے۔ مقامی اخبارات ''ندیم'' ''افکار ''اور بھوپال ٹائمس نے بھی اس زمانے میں ان کے افسانے تسلسل سے شائع کئے تھے۔ '' سکندر محل'' ''بچکولے ''''چھکڑا'' ''پردے کے پیچھے ''اور ''پہلو'' یہ چند افسانے تھے جو قمر جمالی مرحوم کی یادداشت میں محفوظ رہے۔ ورنہ وہ خود اپنے افسانوں کی فہرست فراموش کر چکے تھے۔ افسوس ان کا نہ تو کوئی افسانوی مجموعہ شائع ہوا اور نہ انہوں نے بذاتِ خود انہیں محفوظ رکھا۔

کوکب جمیل اور عنبر چغتائی بھی اسی دور کے افسانہ نگار تھے۔عنبر چغتائی نے کئی افسانے لکھے جو افسانے کی مروجہ ساخت پر کھرے اُترے۔ڈاکٹر محمد نعمان خان نے ان کے صرف دو افسانوں ''پسِ پردہ'' اور ''کسک'' کے حوالے دیئے ہیں ۔ ''پسِ پردہ'' ماہنامہ افکار بھوپال کی جلد ایک کے شمارہ ایک میں شائع ہوا تھا (افسوس سنہ نہیں دیا گیا)۔ ''پسِ پردہ'' کا بیانیہ دلچسپ بھی ہے اور موضوع میں اثر آفرین شدت بھی۔''کسک'' میں عنبر چغتائی نے صنفِ مخالف کے نازک نفسیاتی مسئلہ پر افسانے کا رنگ چڑھایا تھا۔

کوکب جمیل ترقی پسند مصنفین کے اہم رکن تھے۔ تقسیم وطن کے بعد انہوں نے بھی پاکستان منتقل ہونا بہتر سمجھا۔ دورانِ قیام بھوپال ان کے کئی افسانے ملک کے اہم ترین شہروں کلکتہ، دہلی، بمبئی اور بھوپال سے شائع ہونے والے جرائد میں شائع ہو چکے تھے جنہیں خاطر خواہ پذیرائی ملی تھی۔ ڈاکٹر محمد نعمان خان نے ان کے افسانوں پر مجموعی تاثر اسطرح پیش کیا ہے۔

'' کوکب جمیل کے بیشتر افسانے رنگ و آہنگ کے حامل ہیں، انہوں نے سنجیدہ مسائل کو موضوع بنایا ہے، ترقی پسند نظریات کے حامل ان کے افسانوں میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے''

میں نے کوکب جمیل کے افسانے پڑھے۔ان کے افسانوں میں بے شک ترقی پسند نظریات ہیں۔ اصلاح اور فلاح کا پہلو بھی نمایاں ہوا ہے مگر ترقی پسند نظریات میں سرخ تحریک کی گونج بھی واضح طور پر سنائی دیتی ہے جو فرسودہ سماجی مسائل اور آدمی کی کمزور روشِ حیات کی دلالت کرتی ہے۔

ابراہیم یوسف مرحوم کامیاب ڈرامہ نویس تھے۔اپنے ابتدائی دور میں مرحوم نے افسانہ بھی لکھا جو'' فاختہ '' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔اس ایک افسانے کے بعد انہوں نے کوئی اور افسانہ نہیں لکھا۔

اسد محمد خان نے افسانے کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔وہ ایک توانا دستخط بن کر اُبھرے۔ترقی پسند مصنفین کے رکن ہونے کا انہوں نے اسطرح ثبوت دیا کہ ان کی کہانیاں سطر در سطر اس تحریک کی پاسبانی کرتی نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوں میں جدیدیت تحریک کی طرح نہیں ذہنی میلانات کی مانند اپنا وجود بیان کرتی ہے۔ان کے یہاں روایات کا انحراف بھی ہے اور ان کا احترام بھی ۔پاکستان منتقل ہو کر وہ اپنے بھوپال اسکی تہذیب اور وطن کی سوندھی معاشرت کو نہ بھلا سکے۔ان کے افسانوں میں آج بھی بھوپال مصدقہ پیکر کی طرح منظر بہ منظر موجود ہے۔

رشدی اسی کارواں کے مسافر تھے۔اے آر رشدی کے نام سے جانے گئے۔روزنامہ افکار کے مدیر بھی رہے۔ان کے انگریزی سے اردو زبان میں منتقل تراجم، ادبی و نیم ادبی مضامین بھی باقاعدگی سے روزناموں میں شائع ہوتے رہے۔اپنے ہم عصروں کی تحریک میں شامل ہوئے تو افسانے کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا۔افسانے لکھے جو مختلف عنوانات سے شائع ہوتے رہے۔بعد ازاں انہیں ''ساز و برگ '' کے عنوان سے یکجائی طور پر کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔اس مجموعے میں شامل افسانے رومانیت کی چاشنی میں گوندھے گئے ہیں۔کہیں کہیں اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہوا ہے۔

رشدی کے ہی ہم عصر سعید بھوپالی اور سید ذوالفقار الحق بھی تھے۔سید ذوالفقار الحق کے دو افسانوی مجموعے ''راز کی باتیں '' اور ''ستاروں سے آگے '' اور سعید بھوپالی کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''دوزخ ''شائع ہوا تھا۔یہ دونوں افسانہ نگار محض افسانہ نگار تھے۔ان کے یہاں علمیت کی کمی بھی ہے اور ان کے افسانے کماحقہٗ افسانے کی مروجہ ساخت سے محروم بھی ہیں۔

اس دور کے جن نوجوان قلم کاروں نے ترقی پسند تحریک کی شدت اور طاقتور روشن خیال نظریات سے بھوپال میں افسانہ نگاری کی فضا قایم کی ان میں ابراہیم یوسف، ڈاکٹر عرفان، مقصود عمرانی (مقصود عمرانی نے آفاق مسعود کے قلمی نام سے افسانے لکھے۔ افسوس ان کا کوئی افسانہ موجود نہیں رہا) متین شامی، رشید فاروقی، مقصود عرفان، شہاب مالوی، آصف شاہمیری، ظہور نشتر، اشتیاق عارف، ظہور ہاشمی، سعید بھوپالی، شاغل فخری، سید قمر الحسن، جوہر قریشی، اختر روف، اختر جمال، زہرہ جمال، شاہمیر راہی، کبیر کوثر، مفتی صدیق (خادم ہندی) منظور سروش، اسد محمد خان، اختر سعید خان، محمد علی تاج، عشرت قادری، مقصود عرفان، مقصود عمرانی کے نام اہم تھے۔ اور اشتیاق عارف نے ابتداء تو افسانہ نگاری سے کی مگر تاج، اختر سعید خان اور عشرت قادری کی روش اختیار کرتے ہوئے اشتیاق عارف صحافت اور ماحی دونوں حضرات شاعری کی جانب متوجہ ہو گئے۔ دیگر افسانہ نگاروں نے جو کچھ بھی لکھا وہ شائع تو ہوا لیکن آج زیادہ تر ان افسانہ نگاروں کی نگارشات محفوظ نہیں ہیں۔

اوپر دی گئی فہرست میں کسی بھی افسانہ نگار کا افسانہ محفوظ نہیں ہے۔ صرف شاہمیر راہی کا ایک افسانوی مجموعہ ''نئے راستے'' (مطبوعہ ۱۹۵۱ء) دستیاب ہے ماحی افسانہ نگاروں نے شوقیہ افسانے لکھے اور کسی ادبی محفل اور یا افسانوی نشست میں سنا کر تسکین حاصل کی اور وقتی طور پر مطمئن ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور وطنِ عزیز کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس تقسیم سے جو حالات رونما ہوئے ان کا اثر ملک گیر پیمانے پر ادب نے بھی قبول کیا شاعری کے ساتھ اس سلگتی اور قہر آمیز شوریدگی پر موضوعاتی افسانے اور کہانیاں بھی لکھی گئیں لیکن بھوپال کا افسانوی ادب (چند کو چھوڑ کر) غیر متاثر ہی رہا۔ یہاں جو افسانے لکھے گئے ان میں تقسیم ملک اور اس سے پیدا شدہ نفرت کی تپش، فسادات کی خونی بُو، ہندو مسلم اور سکھوں کے درمیان لہو رنگ منافرت و خون آشام تصادم، ان لرزہ خیز حقائق میں بھوپال براہِ راست یا بالواسطہ ملوث نہیں ہوا اور نہ اس منافرت کی چنگاری سے یہ خطۂ ارض تپیدہ ہوا۔ صرف اخبارات (وہ بھی اردو کے) تھے جو سنی ہوئی خبریں شائع کرتے تھے۔ ذرائع ابلاغ محدود تھے،

مواصلاتی سلسلہ دراز نہیں تھا۔ سرحدوں اور ان سے ملحق مواضعات و شہروں میں اور

نو مولود ملک میں کیا کربناک واقعات رونما ہوئے ان کی اڑتی اڑتی خبریں بھوپال کا محدود ترین باشندہ (آبادی) سن پاتا تھا یا راجستھان و گجرات کے سرحدی شہروں سے ہجرت کرنے والے بھوپال میں پناہ گزیں ہوتے تو اپنی بربادی کی داستان سناتے۔

یہ کسی قصے یا کہانی سے زیادہ اصلیت اسلئے نہیں رکھ پائیں کہ دوسروں کی زبان سے ادا ہوئی تھیں۔ یہ انسان کی فطری سرشت ہے کہ جب تک وہ خود چوٹ نہ پائے اسکے درد اور تکلیف کا احساس اسے نہیں ہوتا۔ بھوپال کا افسانہ بھی اس سچائی سے محروم رہ گیا۔

ان سب کے باوجود بھوپال افسانے سے محروم نہیں رہا۔ تقسیمِ ملک کے بعد اسد محمد خان، کوکب جمیل، زہرہ جمال اور سلمان الارشد وغیرہ کے نو مولود پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد جو خلا افسانوی دنیا میں پیدا ہوا تھا، اسے نئے گروہ نے اپنے قلم کی توانائی سے پُر کیا۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان ''اردو افسانہ'' کے باب میں بھوپال کے افسانے پر تجزیاتی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۱۹۵۰ء کے آس پاس اردو افسانہ میں نئے تبدیل شدہ حالات کی وجہ سے ایک نیا موڑ آیا اور یہ صنف جدید تعلیم سے آراستہ افراد کے ہاتھوں میں آ گئی جسکی وجہ سے اس میں نئے حالات واقدار کی روشنی میں کچھ نئے تجربات ہوئے۔ حصولِ آزادی کے بعد تقسیم وطن، جمہوری نظامِ حکومت کا قیام، فسادات اور سیاسی کشمکش اور دیگر عوامی مسائل نے اردو افسانہ کو زندگی اور سماج سے مزید قریب کردیا، چنانچہ اب اس میں نہ تو خالص رومانیت تھی نہ تصور پرتی، نہ جانب داری اور نہ نعرہ بازی اور نہ مذہبی طوالت و یکسانیت کا عیب"۔ (بھوپال میں اردو افسانہ انضمام کے بعد صفحہ ۱۷)

آزادی کے بعد اس قافلۂ زرنگار اور کاروانِ جاں فروشاں میں شامل ہو کر جو توانا دستخط اپنی تحریرات سے وسیلہ بنے وہ تعلیم کی اعلیٰ اقدار کے حامل تھے۔ ان کے مزاج، تخیل اور فکر میں روشن سی خود شناسی بھی تھی اور صداقت بدنی بھی۔ ان کے افسانے دنیا زاد تھے۔ تماشہ زا نہیں۔ ان میں تنوع آنا اسلئے ضروری تھا کہ وہ حالات و معاملات کا تجزیہ اپنے مشاہدات سے کرنے میں آزاد بھی تھے اور غیر جانب دار بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ذہن عیب پرور نہیں، عیب جو رہے۔

بھوپال میں افسانوی ادب کا آغاز ۱۹۱۵ء میں ہوا تھا۔ یہ داغ بیل تھی جو علامہ نیاز فتح پوری کے ہاتھوں بھوپال کی ادبی کیاری میں ڈالی گئی تھی۔ اس لحاظ سے بھوپال میں افسانوی ادب کی عمر تقریباً ۹۲ سال (1915-2007) قرار پاتی ہے۔ اس بانوے سالہ مسافت میں اردو افسانہ مسلسل، بلا رُکے اور اپنے اعصاب پر تکان غالب لائے بنا ارتقائی منزل پر گامزن چلا آرہا ہے۔

آزاد ملک میں انضمام کے بعد جمہوریت کے قیام اور پنج سالہ ارتقائی منصوبہ بند تحریک نے جہاں سیاسی بیداری کا ظہور کیا تو آدمی کا شعوری منظر نامہ بھی بدلا۔ بھوپال نے گاہے گاہے ان اثرات کو قبول کیا تو شاعری اور کہانی کے مزاج میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس تبدیلی نے نئے افق روشن کئے اور بھوپال میں افسانے کا لہجہ بدلا۔ اس بدلے لہجے کی پاسبانی میں نعیم کوثر کا نام سرِفہرست رہا۔

اُن کی پہلی تخلیق "یتیم بچے کی عید" ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ نونہال دہلی میں شائع ہوئی تھی اور ۱۹۴۸ء سے 2007 (آزاد ہند میں) تک تقریباً ۶۰ سالہ ادبی سفر انہوں نے طے کیا ہے اور وہ ایسے تنہا افسانہ نگار ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے والد کوثر چاندپوری کی افسانوی وراثت کو قائم رکھا بلکہ اپنی عمر کے ۷۲ ویں سال میں نئے اور اچھوتے موضوعات سے اردو افسانے کو اظہار کی تیز سرگوشی دے کر تخلیق کا انتخاب بناتے آرہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے "خوابوں کا مسیحا" (۱۹۹۹)۔ "کال کوٹھری" (۲۰۰۱) اور "اقرار نامہ" (۲۰۰۶) شائع ہو کر نہ صرف قاری کے ذوق پر کھرے اُترے بلکہ اہلِ علم و دانش سے بھی سراہے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں روایتی پاسداری بھی ہے۔ اور کہانی کی تیز رفتاری بھی۔

یہ بھی افسانہ نگار خال خال ہی سنجیدگی متانت اور کہانی کو عقل و ذہن کی میزان پر تول کر افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کر پائے۔ ہندوستان میں آزادی کی فضا ہموار ہو چکی تھی اور غلامی نجات کی لگار پر تھی۔ اس متذبذب دور میں کہانی تجربات کی نقش گری سے تخلیقی شعور کی عیسیٰ نفسی پانے کو بیتاب تھی۔ ملک میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اور سعادت حسن منٹو وغیرہ نے یہ جہان فتح کئے اور اپنی گھن گرج سے اردو کے قاری کو چونکا دیا اور عملی شعور سے ان تجرباتی

موضوعات کوقلم کا افتخار عطا کیا جس میں عصری آگہی کی وسعتیں تھیں، جن میں لفظوں کی تجارت نہیں تھی، تکنیک، معیار، تناسب اور افسانے کا توازن ایک Craft Manship (فن پر قادر) کی افادیت کا مظہر تسلیم کیا گیا۔ بھوپال میں کوثر چاند پوری ہی ایک نمایاں بلکہ ملک گیر افسانہ نگار کا بھرم قایم رکھ سکے۔ وہ بھوپال کے تنہا افسانہ نگار تھے جن کے افسانے ملک بھر کے اردو جرائد (اور تقسیم کے بعد پاکستان میں بھی) شائع ہوئے تھے جنھیں اردو قاری ذوق وشوق سے پڑھتا بھی تھا۔ تقسیم ملک کے بعد بھی اسی شدومد سے افسانوی ادب کو اپنے قلم سے افکار وتخیلات کی جولانیاں دینے میں مصروف ہے۔ نہ انکا قلم تھکا اور نہ اعصاب مضمحل ہوئے۔ وہ تنہا ایسے قلمکار (بھوپال کے) شمار ہوئے جنہوں نے عمر کے آخری پڑاؤ پر بھی اپنے قدموں کو مضبوطی سے جمائے رکھا۔ آج ان کا (افسانے، ناول اور دیگر اصناف) کا مکمل سیٹ صرف اقبال لائبریری میں محفوظ ہے۔

آزادی سے قبل کبیر کوثر نے بھی چند افسانے لکھنے پر اکتفا کیا لیکن آزادی کے برسوں بعد ان کا افسانوی مجموعہ ۱۹۸۶ء میں، مشعل کے عنوان سے شائع ہوا۔ وہ دہلی منتقل ہو گئے، محراب ڈائجسٹ کی ادارت کی اور قرآن کا منظوم ترجمہ کرنے میں عمر صرف کردی۔ اوران کے یہاں افسانے کی نازک سی عصر آگاہ ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

مظفر حنفی نے ایک زمانہ (اپنا ابتدائی دور) بھوپال میں گذارا۔ افسانے لکھے اوران کے افسانوں کے تین مجموعے "اینٹ کا جواب" (۱۹۶۷)۔ "دوغنڈے" (۱۹۶۹) اور "دیدہ حیراں" (۱۹۷۰) شائع ہوئے۔ ان افسانوی مجموعوں کی پذیرائی بھی ہوئی اور کرشن چندر نیز فراق گورکھپوری جیسے ممتاز افسانہ نگار وشاعر اور کنہیالال کپور جیسے طنز ومزاح نگار نے مظفر حنفی کے افسانوں پر لایق تحسین تبصرے کئے تھے۔ یہ اس دور میں شائع ہوئے جب مظفر حنفی ۱۹۶۰ء میں افسانہ نگاری سے تائب ہوکر شاعری کے اعلیٰ منصب پانے میں کوشاں تھے۔

بھوپال میں جو نیا ادبی گروہ تیار ہوا ان میں ایک اہم نام شفیقہ فرحت کا بھی ہے۔ گوانہوں نے افسانوں پر اپنی زیادہ اور بھرپور توجہ صرف نہیں کی لیکن بہر حال افسانے لکھ کر افسانہ نگاروں کی صف میں ضرور شامل ہو گئیں۔ چند افسانے مثلاً "رشتہ پہچان کا"

"اللہ میگھ دے" "منظور ہے" "کیوں" "زندگی اے زندگی" "آپ نے کھانا کھالیا" "ساتواں طبق" "زندگی کا کباڑخانہ" اور "آخری شب کے ہم سفر" شفیقہ فرحت کی جولان طبیعت کے گواہ ہیں چونکہ ان کے خمیر میں طنز ومزاح کا عنصر کچھ زیادہ ہی شامل تھا، اسلئے ان کے افسانوں میں بھی کہیں طنزیہ کہیں مزاحیہ حد تک سنجیدگی موجود ہے۔ انکے افسانوں میں لفظیات میں پیچیدگی نہیں ہے۔ سادہ سا بیانیہ کافی حد تک تاثیر لئے ہوئے ہے۔ فکر کی اساس پر یہ کہانیاں ضرور ہیں لیکن فنی تنظیم اور فنکارانہ حساسیت کا جمال نہیں ملتا اس لئے دیرپا اثر قایم نہیں رکھ پاتیں۔

قیوم جاوید عرصہ تک مقامی روزناموں میں طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھتے رہے جن میں شگفتگی ہوا کرتی تھی۔ ان کالموں کی وجہ سے ہی ایک ادبی حلقہ ان سے واقف ہوسکا تھا۔ اسی دوران انہوں نے افسانوں پر بھی توجہ دی اور "دوسرا جنم" "قتل گاہ" اور "گوری اتری گنگا پار" افسانے لکھے۔ ان افسانوں میں نوآموزیت صاف جھلکتی ہے اور بیانیہ پر قلم کار کی گرفت مضبوط بھی نہیں ہے۔

عیسیٰ صدیقی مرحوم اس گروہ میں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے دور کا ممتاز نام بن کر ابھرے۔ حمیدیہ کالج کے میگزین میں ان کے افسانے، جب تک یہ شام نہیں ڈھلتی'' بے آواز آدمی کی کہانی'' اور ''میں ایک بھلا آدمی'' تواتر سے شائع ہوئے'' میں نے انہیں ایک ادبی نشست میں افسانہ پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ افسانے کا نام بھی حافظے میں محفوظ نہیں ہے ہاں اس افسانے پر انہیں خاطر خواہ پذیرائی ملی تھی۔ بعد میں کچھ افسانے پڑھنے سے یہ احساس ہوا کہ ان کے افسانوں میں حرکت و عمل کی ترغیب بھی تھی اور عصری ذہن کی گونج بھی۔ ان کے افسانے نہ صرف عنوانات کے لحاظ سے بلکہ موضوع کے اعتبار سے بھی قاری کو مصالحت پر آمادہ رکھتے تھے اور دانشوروں کی توجہ بھی مبذول کرلینے کا ہنر جانتے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ ان کی ذہانت افسانوں کی نوک پلک درست کر پاتی وہ راہی ملک عدم ہو گئے۔

صابر ادیب ایک عرصہ دراز سے اس صنف سے منسوب ہیں۔ بہت سلجھے ہوئے مزاج کے انسان ہیں۔ جس طرح ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کا پرتو جھلکتا ہے، وہی آئینہ پرور جمال ان کے افسانوں میں بھی ملتا ہے۔ بہت سادگی سے وہ اپنی بات کہنا جانتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''خط کے جواب میں'' 1960 میں ماہنامہ جلتے دیپ کانپور میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کی اشاعت نے انہیں حوصلہ دیا وہی حوصلہ آج تک برقرار ہے۔ ملک کے بیشتر رسائل کے علاوہ بھوپال سے شائع ہونے والے ماضی قریب کے جریدوں نے بھی آپ کے افسانے شائع کئے۔ ''ٹوٹے رشتوں کا کرب'' پہلا افسانوی مجموعہ 2001 میں بھوپال سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۴ مختصر افسانے شاملِ اشاعت ہیں۔ ان افسانوں میں صابر ادیب کے قلم کی سادگی سی مگر باتاثیر پرکاری ہے۔ ان طبع زاد افسانوں میں ہر موضوع زندگی کا آئینہ بند ہے۔

صابر ادیب آج بھی اس استقلال اور سلامت روی سے اپنی کہانیوں کو جذب و کیف دینے میں مصروف ہیں۔

تاریخ نئے باب کھول رہی تھی۔ ہندوستان میں سماجی اور سیاسی بیداری آچکی تھی ۱۹۵۶ء میں بھوپال کو مدھیہ پردیش کی راجدھانی بننے کا شرف حاصل ہوا تو اردو ادب نے اپنے داستان فکر کو صورت گری سے آشنا کیا۔ شاعری یہاں کے مزاج کا عام آہنگ رہی تو کہانی کا آہنگ

(۱) شاہمیر راہی (۲) ست پرکاش سنگر (۳) اطہر حسن صابری (۴) رشید فاروقی (۵) آزاد نقوی (۶) آصف شاہمیری (۷) فضل تابش (۸) قمر احسن (۹) شمیم کوثر (۱۰) یعقوب یاور کوئی (۱۱) مختار شمیم (۱۲) آفاق احمد (۱۳) شمیم احمد (۱۴) کوثر صدیقی (۱۵) انجم سلمانی (۱۶) اظہر راہی (۱۷) گھنشیام تومر (۱۸) ایم۔ رفیق (۱۹) جاوید محمود (۲۰) علی عباس امید (۲۱) نثار راہی (۲۲) اقبال مسعود (۲۳) اختر رؤف (۲۴) مظفر رئیس (۲۵) منان سلیم (۲۶) رشید انجم (۲۷) محمد خالد عابدی (۲۸) فیاض رفعت (۲۹) اخلاق اثر (۳۰) مقصود اصغر (۳۱) اقبال جعفری (۳۲) مشرف الحسینی (۳۳) معین الدین فاروقی (۳۴) امجد علی (۳۵) سکندر ضمیر (۳۶) سید ظہور الاسلام (۳۷) احد پرکاش (۳۸) خلیق صدیقی (۳۹) اشفاق الرحمن قریشی (۴۰) ہارون ایوب (۴۱) جاوید یزدانی (۴۲) بدر واسطی (۴۳) علی متقی دسنوی (۴۴) اسد مہدی (۴۵) اقبال مجید (۴۶) شاہد کمال (۴۷) سکندر ضمیر (۴۸) صابر ادیب (۴۹) اکرام اشعر (۵۰) اجلال مجید (۵۱) عرفان پرویز (۵۲) اطہر شکیب (۵۳) حسن مسعود (۵۴) ایم۔اے۔ عارف (۵۵) شہریار مدنی۔

ان میں کچھ افسانہ نگار راہی ملک عدم ہوئے اور کچھ اس صنف سے تائب ہو گئے۔ جو قلمکار آج بھی اس فن سے وابستہ ہیں اور مستقل ان کے افسانے کتابی شکل میں بھی اور ملک کے بیشتر رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں نعیم کوثر۔ رشید انجم۔ اقبال مسعود۔ سکندر ضمیر۔ نثار راہی۔ ڈاکٹر اخلاق اثر۔ پروفیسر اظہر راہی۔ اقبال مجید کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ میں نے بھوپال کے تازہ کار گروہ میں اقبال مجید صاحب کا بھی ذکر کیا ہے۔ صرف ذکر وہ بھی صرف اسلئے کہ انہوں نے ۳۲ سالہ اپنے قیام بھوپال میں متعدد افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے اور کئی افسانوی مجموعے بھی یہیں رہ کر شائع ہوئے، اہلِ بھوپال نے ان کی قدر و منزلت میں کسی بھی بخل یا کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ انہیں ادبی حیثیت سے بھی نوازا اور مالی حیثیت سے بھی مستحکم کیا، یہیں رہ کر انہوں نے ملک گیر اعزازات حاصل کئے اور جب بھی انہیں کوئی اعزاز دیا گیا اہلِ بھوپال، شعر و ادب کے پاسبانوں نے ان کی توقیر میں اضافہ بھی کیا اور اظہار مسرّت بھی۔ آج بھی وہ بھوپال میں رہائش پذیر ہو کر آسودہ حالات زندگی کے حامل ہیں لیکن موصوف نے اہلِ بھوپال اور سرزمینِ بھوپال کو کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا جسمیں شکر گزاری بصارت ہوتی ہے۔ میں اپنے اس بیان کا ثبوت ان کے ہی لکھے ایک خط کے اقتباس سے دینا چاہوں گا جو سہ ماہی ذہنِ جدید شمارہ نمبر ۴۴ جلد نمبر ۱۵ جون تا اگست ۲۰۰۶ء کے صفحہ نمبر ۱۹۵ پر شائع ہوا تھا۔

"میں تو پہلا قدم رکھنا تو دور ٹھیک سے اٹھا بھی نہیں پایا ہوں۔ شاید اسلئے کہ بھوپال جیسے چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہوں۔ یہ شہر سو ہاتھوں سے آپ سے سو چیزیں تو لے لیتا ہے لیکن ایک چیز بھی اسکے پاس دینے کے لئے نہیں ہے۔ یہاں تمنا کے قدم کو خود کو رکھنے کے لئے ایک سوٗت جگہ بھی ملنا مشکل ہے"۔ ایک سوٗت جگہ بھی ملنا مشکل ہے اور ایک چیز بھی اسکے پاس دینے کے لئے نہیں ہے۔ ان سطور پر غور فرمائیے۔ میں زبان سے کہی گئی ایسی کوئی بات یہاں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ صرف ان کے لکھے طویل خط کے اقتباس سے آپ حضرات اندازہ کر لیجئے کہ میں نے اقبال مجید کو کیوں بھوپال کے افسانوی ادب سے خارج کر دیا۔ اگر میں ان کے اس صریحاً ناشکر گزار عمل سے چشم فراموشی اختیار کر کے اوروں کی طرح مدح سرا ہو جاتا تو گویا میں بھوپال کی ادب نوازی نہیں شخص نوازی پر کبھی اپنی جبینِ نیاز نہیں رکھ پاتا۔ آپ حضرات ایماندارانہ تجزیہ کیجئے کہ کیا واقعی اقبال مجید نے بھوپال کے ادبی حلقوں، ادبی سرزمین اور اہلِ بھوپال کے مخلصانہ عمل نیز بھوپال کی مٹی سے کچھ نہیں پایا؟۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کی فہرست میں فضل تابش مرحوم کا ایک افسانہ "جناؤں کے جنم کے بعد" دستیاب ہو سکا جو بھوپال سے نکلنے والے اردو ماہنامے شناخت میں شائع ہوا تھا۔ اپنی شاعری کی طرح فضل تابش نے اس افسانے میں افسانے کے آزاد اور چمکدار ماحول سے کہانی کے خدوخال ابھارے ہیں جنہیں ترسیل کی آسانیاں ملی ہیں۔ کہانی میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔ افسوس وہ اس جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے اور دوسری اصناف مثلاً شاعری اور ڈرامہ پر اپنی صلاحیتوں کے جوہر آشنا ہوئے۔

سیفیہ کالج بھوپال میں علم کی وہ درسگاہ ثابت ہوئی جس نے اپنے ہر طالب علم کو مستقبل کی ایک روشن کائنات کی شاہراہوں پر گامزن کیا۔ اس درس گاہ میں دیگر فیکلٹیز کے ساتھ شعبۂ اردو (اردو ڈپارٹمنٹ) کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی۔ اردو شعبہ سے جو طلبا وابستہ ہوئے انہوں نے نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی اپنی علمیانہ صفات سے اردو زبان و ادب کی تبلیغ کا خیرہ کن فرض انجام دیا۔ شعبۂ اردو اس کالج کا بہت معتبر اور مستند شعبہ ثابت ہوا اس شعبے نے اردو کی مروجہ اصناف مثلاً شاعری،

فلسفہ، تنقید، تاریخ، نثر کے ساتھ افسانوی ادب میں بھی پیش رفت کی۔ ایک مجلہ بھی شائع کیا گیا جسمیں طلبا کی تخلیقات کی اشاعت سے نہ صرف ان کے حوصلہ مند مستقبل کی راہیں کھلیں بلکہ ایک ترقی پذیر ذہن کی نشوونما بھی ہوئی۔

(۱) سید ساجد ندوی (۲) جلیل الرحمن صدیقی (۳) این۔ ایم خان (۴) افسر سعید خان (۵) ڈی آر تکوار (۶) حلیم اللہ خان (۷) اعجاز رسول (۸) سید ظہور الاسلام وہ نام ہیں جنہوں نے دوران تعلیم شوقیہ افسانے لکھے۔ مجلۂ سیفیہ میں (جلد اول و دوم ۔۶۴۔ ۶۳ ۔۱۹۹۶۲) اور مجلۂ سیفیہ پنجم ۱۹۶۶ و ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی مصروفیات زندگی میں بھول گئے کہ ان کا رشتہ کبھی قلم سے بھی رہا تھا۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ان نوآموز طلبا کو ادب سے متعارف کرنے اور کہانی کے امکانات سے ذہنوں کو جلا دینے میں سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بے حد ہمدردانہ اور نمایاں رول ادا کیا تھا۔ ورنہ ایک نسل اس صنف سے محروم رہ جاتی۔ میں یہاں ان قلمکاروں کے افسانوں کی تفصیل دینا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ ان قلمکاروں نے اس روایت کو کسطرح قایم رکھا۔

۱۔ احمد قریشی ۔۔۔۔۔۔ نقل راچہ عقل
۲۔ اخلاق اثر ۔۔۔۔۔۔۔ یہ گھر یہ گلیاں
۳۔ منان سلیم ۔۔۔۔۔۔۔ دو آنکھیں دو تالاب
۴۔ معین الدین ۔۔۔۔۔۔۔ غلط فہمی
۵۔ منصور احمد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شمع بجھ گئی (مجلۂ سیفیہ جلد اوّل شمارہ اول ۶۲۔۶۱ء)
۶۔ کنواری ماں ۔۔۔ اخلاق اثر
۷۔ روبی ۔۔۔ ڈی آر تکوار
۸۔ کچے دھاگے ۔۔۔ حلیم اللہ خان
۹۔ یہ گل تپش دل سے کھلا کرتے ہیں ۔۔۔ جلیل الرحمن صدیقی
۱۰۔ سماج کے جھوٹے بندھن ۔۔۔۔۔ اعجاز رسول
۱۱۔ رقص کرنا ہے تو ۔۔۔۔ سید ظہور الاسلام
۱۲۔ ہے جرم ضعیفی کی سزا ۔۔۔ اقبال مسعود
(مجلۂ سیفیہ۔ جلد اول و دوم ۔۶۴ ۔۶۳ ۔۱۹۶۲ء)
۱۳۔ یادوں کے سائے ۔۔۔ این ایم خان
۱۴۔ سرخ گلاب ۔۔۔ افسر سعید خان
۱۵۔ پہچان ۔۔۔ سید ساجد ندوی
۱۶۔ اے صبا تو بھی آئی تو پریشاں آئی ۔۔۔ جلیل الرحمن صدیقی
۱۷۔ کتا کانفرنس ۔۔۔ نثار راہی

(مجلہ سیفیہ جلد پنجم ۶۷۔۱۹۶۶ء)

اخلاق اثر اور اقبال مسعود نے اور نثار راہی نے کالج سے نکلنے کے بعد بھی اس صنف ادب میں اپنا مقام بنائے رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے بنیادی مسائل نے بھی جگہ حاصل کی اور مردہ روشوں سے انحراف کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ باقی قلمکاروں نے اپنے متذکرہ بالا افسانوں میں محبت، عشق اور سماج کے روایتی انداز پر ہی اپنی تحریروں کو لفظیات کا پیراہن دیا ہے اور تو آموزی منہ سے بولتی ہے۔ کالج کی زندگی پر بہر حال حقیقی زندگی حاوی ہوگئی اور وہ سب ہی اس ڈگر سے ہٹ گئے۔ صرف سید ظہور الاسلام شاعری کی صف میں آشامل ہوئے۔ اخلاق اثر نے افسانے پر ہی اکتفا نہیں کیا انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تحقیق کے مراحل بھی سر کئے اور پر وقار مقام پانے میں کامیاب ہو گئے۔

سیفیہ کالج کے اس دور کے دو اہم نام اور ہیں نثار راہی اور اقبال مسعود۔ نثار راہی نے وکالت کے پیشے کے ساتھ اردو افسانے میں پیش رفت کی۔ متعدد افسانے شائع ہوئے اور دو مجموعوں کے مالک بھی بن بیٹھے۔ انہوں نے کسی اور صنف کی طرف توجہ مبذول نہیں کی ان کے برعکس اقبال مسعود نے زندگی کی آزمائش روش پر جب قدم رکھا تو وہ دور واقعی ان کی آزمائش کا دور تھا۔ زندگی ہاتھ تھامنا بھی چاہتی تھی اور دور بھاگنا بھی مگر یہ اقبال مسعود کی مستقل مزاجی ہی تھی جس نے ان کی ہمراہی قبول کی اور کسی بھی صعوبت میں ساتھ نہ چھوڑا۔ تعلیم کے ساتھ فکر معاش کی جستجو اور فکر معاش کے ساتھ مستقبل کو بنانے سنوارنے اور کسی ایک روشن اور پائیدار مرکز پر اپنے وجود کو قایم کرنے کا حوصلہ ہمیشہ ان کے ارادوں کا معاون رہا۔ اقبال مسعود سیلف میڈ انسان ہیں۔ اس لئے ان کے افکار میں گرمی بھی ہے اور شبنمی حرارت بھی۔ صحافت، تبصرہ نگاری اور مختلف ادبی وصحافتی اداروں میں ملازمت نے جہاں ان کے مزاج کو صیقل کیا وہیں قلم کی آبرومند حرمت کو اخلاقی ضابطہ بھی دیا۔ انہوں نے شاعری بھی کی ہے مگر افسانوی ادب سے ان کا مصالحانہ رشتہ جوں کا توں قایم ہے اعلیٰ متقی دسنوی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے بیٹے ہیں اسد مہدی معروف نقاد مہدی جعفر کے صاحبزادے بھوپال ادب کے آئینے ہیں، ڈاکٹر محمد نعمان نے ان دونوں نوجوان فکشن رائٹر کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ اسد مہدی کے چار افسانوں کا ذکر اس تذکرے مین کیا گیا ہے، گمشدہ مکان، پلاسٹر" سامنے کا اندھیرا" اور "راستے کا تیسرا پہر" یہ افسانے مفاہیم، پہچان اور پاکستان کے جریدے خیابان میں شائع ہوئے تھے۔ (کب اور کس دور میں حوالہ نہیں ہے) علی متقی دسنوی کی کہانیاں صرف ذکر تک محدود ہیں۔ نعمان صاحب نے انکی ایک بچی کہانی "یوریکا" کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ نعمان صاحب کی یہ کتاب تقریباً ۱۵ سال قبل شائع ہوئی تھی اور غالباً اس کی اشاعت سے قبل ہی یہ دونوں افسانہ لکھنا چھوڑ چکے ہوں گے۔ دونوں آئندہ نسل کے نمائندہ ثابت ہو سکتے تھے لیکن زندگی کی فکر معاش نے انہیں اسطرح مجبور کیا کہ وہ ادب سے کنارہ کشی پر مجبور ہو گئے۔

مدھیہ پردیش میں اردو کے ۲۵، مطبوعہ اردو اکادمی مدھیہ پردیش (۱۹۸۱ء) میں دو افسانہ نویسوں کا ذکر ملتا ہے ڈاکٹر ٹی اے قادری اور عزیز الحسن۔ یہ دونوں کب افسانے میں شامل ہوئے اور کب الگ ہو گئے افسوس انکی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔ اسلئے صرف نام دینے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

چونکہ بھوپال کی زمام حکومت بیگمات کے ہاتھ میں رہی، ان بیگمات نے جہاں عورت کی فطری شرم وحیا کو ملحوظ رکھا وہیں معاشرت اور مشرقی تہذیب اور اخلاق کی پاسداری بھی کی۔ عورت کو زمانے کی اعلیٰ قدروں اور حرکت وعمل سے روشناس کرانے میں ان بیگمات نے نمایاں کارہائے انجام دئے۔ یہ بیگمات پردے میں رہنے کے باوجود روشن دل روشن اخلاق روشن دماغ اور روشن کردار کے ساتھ عورت کی آزادی کی حامی رہیں۔ وہ بذات خود بھی شعر وسخن اور دیگر اصناف ادب میں دلچسپی

رکھتی تھیں اس لئے ان کی مقلدانہ تحریک سے عورتوں کا جو آزاد گروہ تیار ہوا اس نے نہ صرف شعری افق پر اپنے قدم ثبت کئے بلکہ نثری میدان خاص کر افسانوی ادب میں اپنی ذہنی طہارت اور وسعت بیان کی قوت سے تفہیم وادراک کے آئینے تراشے جن میں اردو کا وہ چہرہ نمایاں ہوا جس سے بعد کی نسلیں ضیاء بار ہوئیں۔

ان خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایسے نام بھی شامل ہیں جنہوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ان خواتین میں سے کچھ ایک نے ناول بھی لکھے اور ناولٹ بھی لکھے اور افسانوں سے اپنی وجودی صداقت کا وہ زینہ تیار کر دیا جو بلندی تک پہونچ کے ختم نہیں ہوتا بلکے پروں کو پرواز کی قوتوں کا عمل فراہم کرتا ہے۔

محترمہ یاسمین افتخار نے ان نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کی ایک مختصر فہرست اپنے مضمون میں شامل کی ہے لیکن میری تحقیق نے اس فہرست کو کافی طویل کر دیا ہے۔

محترمہ یاسمین افتخار کی فہرست میں یہ نام ضبط تحریر میں آسکے ہیں۔

(۱) زہرہ جمال (۲) اختر جمال (۳) گل رُخ سلطان (۴) شاہ رخ سلطان

(۵) ماہ رخ سلطان (۶) پروین رشدی (۷) سعیدہ سلمٰی (۸) حمیرہ اقبال (۹) صفیہ قریشی (۱۰) رفعت سلطان اور (۱۱) حسن بانو تبسم۔

یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے افسانوں کی نوک پلک درست کرنے اور حسن جمال عطا کرنے میں بہترین قلم کی ضیا فتیں دیں۔ زہرہ جمال بمبئی چلی گئیں اور اختر جمال نے پاکستان میں بود و باش اختیار کر لی دیگر خواتین یا تو چند افسانے لکھ کر خاموش ہو گئیں کہ گھر گرہستی ان کے نزدیک اہم قرار پائی یا آگے بڑھنے کے موقعے نہیں مل سکے۔ اسلئے ان پر تبصرہ ممکن نہیں اسلئے کہ ان کا نہ تو تعاون حاصل ہو سکا کہ کچھ مواد فراہم ہو سکتا تا کہ تبصرہ کرنے اور جائزہ لینے کی آسانیاں مل سکتیں۔

دور رول اور بعد کے دور میں جن خواتین افسانہ نگاروں کے نام میری فہرست میں شامل ہوئے ہیں ان میں (۱) شفیقہ فرحت (۲) وسیم بانو قدوائی (۳) حمیرہ اقبال (۴) رضیہ حامد (۵) بنت مسعود (۶) انور سلطان (۷) مہر فاطمہ (۸) قمر انشا (۹) شمیم احمر (۱۰) ڈاکٹر پری بانو (۱۱) فرحت جہاں (۱۲) کوثر جہاں کوثر (۱۳) ذکیہ سلطان حزیں (۱۴) انور جہاں (۱۵) سلطانہ حجاب (۱۶) کشور جہاں (۱۷) پروین کوثر (۱۸) بلقیس جہاں۔

شفیقہ فرحت نے جلد ہی طنز و مزاح کو اپنا اسلوب بنالیا۔ وسیم بانو قدوائی ناول کی جانب متوجہ ہو گئیں اور متعدد ناول شائع ہو کر ان کی شہرت کا باعث بن گئے! ڈاکٹر رضیہ حامد نے افسانے کو چھوڑا نہیں ہے مگر صحافتی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف کم ہی توجہ دے پاتی ہیں۔

موجودہ خواتین افسانہ نگاروں میں فرحت جہاں، رفعت سلطان، ڈاکٹر پری بانو، کوثر جہاں کوثر، سلطانہ حجاب پابندی سے افسان لکھتی ہیں اور رسائل اہتمام سے ان کے افسانے شائع کرتے ہیں۔ ان میں سے رضیہ حامد (لمحوں کا سفر) فرحت جہاں (باز یافت) کوثر جہاں کوثر (جادو نگری) کے افسانوی مجموعات شائع ہو کر تاریخ علم ادب میں جگہ بنا چکے ہیں۔

یہ ایک اجمالی جائزہ ہے جسمیں میں نے کوشش کی ہے کہ دور قدیم سے دور حاضر تک سلسلہ قایم رہے اور افسانہ نگاروں کی خدمات کا ربط منقطع نہ ہو پائے۔ میری تحقیق جستجو کاوش کے مطابق ابتک کے تمام افسانہ نگاروں کے نام اس جائزے میں پیش ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی نام سہواً رہ گیا ہو اور اسکا تذکرہ نہ ہو پایا ہو تو از راہ کرم میری تصحیح فرمائیں، ممنون ہوں گا۔

کفارہ

اماں بی نے ابھی تلے دانی کھولی ہی تھی کہ ڈیوڑھی میں کسی کے آنے کی آہٹ ابھری۔ انھوں نے ڈیوڑھی کی طرف رُخ نہیں کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ سٹر پٹر کس کی ہوسکتی ہے؟ تخت کی سفید اور بے داغ چاندنی پر پاجامے کا کپڑا پھیلا ہوا تھا اور اس پر نازک مگر تیز دھار کی قینچی رکھی ہوئی تھی، انھوں نے تلے دانی کو کھولنے کا ارادہ ملتوی کردیا اور وہیں سے آواز لگائی۔ ''تاج دلہن۔ لو وہ مائی ملی آگئی۔ بڑا انتظار تھا نا تمہیں اُس حرافہ کا؟۔ اور تاج دلہن چولہے پر چڑھی ہانڈی پر ڈھکن ڈال کر لپک جھپک باورچی خانے سے نکلیں اور اماں بی کے پاس آ ٹھہریں۔

''کون۔ خیرن آئی ہے۔؟ پر کہاں۔ سارا آنگن تو سونا پڑا ہے۔ آپ بھی اماں بی۔'' اشتیاق مایوسی میں بدل گیا۔

''کیا میں اس کی سٹر پٹر نہیں پہچانتی؟ دیدوں میں ہوائی کا پٹ پڑ جائے تو پاؤں کی چاپ بھی بے ڈھنگی ہو جاتی ہے۔۔ میں نے ابھی ابھی سنی ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ تاج دلہن کچھ بولتیں سفید ٹوپی والے برقعے میں لپٹا ایک جسم ان کے پاس آ کے رُک گیا۔ ''لو خود ہی دیکھ لو''۔ تاج دلہن نے جو پلٹ کر دیکھا تو واقعی وہ خیرن ہی تھی۔

''کہاں مرگئی تھی نواب زادی۔'' تاج دلہن بھڑ کر بولیں۔ کچھ اور سلواتیں ان کے دہن سے ادا ہوئیں کہ برقعے میں جنبش ہوئی اور ایک ہاتھ نے نقاب الٹ دیا۔ پل بھر کو آنگن میں اُترتی شوخ سی دھوپ کے ہاتھوں سے کرنوں کا پیالا چھوٹ گیا۔ خیرن کا چہرہ ایسے ہی روشن ہوا تھا جیسے شفتالو کے درخت کی اونچی پھنگ پر انگور کا رس بھرا خوشہ چھپا اُٹھا ہو۔

''کم بخت ماری۔ تیرے خصم کو اتنی بھی چاہت نہیں ہوتی کہ نظر کا کاجل ہی تجھے چھوا دے۔'' تاج دلہن اسکے چمکیلے شعائی چہرے اور لانبی پلکوں سے جھانکتی سیاہ آنکھوں میں مچلتی نازک سی بجلی کی تاب نہ لا کر بولیں اور اس سے پہلے کہ خیرن کچھ کہتی، اماں بی نے دس سلواتیں سنا ڈالیں۔

''موت پڑی۔ تجھے اتنا بھی احساس نہیں کہ گھر میں کتنے کام ہوتے ہیں۔ ایک اکیلی تاج دلہن بچوں کو سنبھالیں۔ میاں کا خیال کریں یا گھر میں بھی جان ڈالتی پھریں۔ ناس پیٹی جب دیکھو خصم کے کولہے سے چمٹی رہتی ہے۔ ایسی ہی چاہت ہے تو گھر گھر کیوں ہنڈاتی پھرتی ہے۔'' اس نے اماں بی کی سلواتوں کا برا نہیں مانا۔ راحت خیز مسکراہٹ سے آنکھیں بھی چمک چمک اُٹھیں۔

''آداب کرتی ہوں اماں بی'' آواز میں بھی بلا کی کھنک تھی۔ اس نے سر پر جمی ٹوپی کو کھینچا اور بُرقعہ اتار کر تخت کے کونے پر رکھ دیا۔ معمولی ساٹن کی شلوار اور اس پر نیلا جھلملاتا تنگ کرتا اور گلے میں ململ کا نیلا ہی دوپٹہ۔ تنگ کرتا جسم کا ہر نشیب و فراز اسکی اٹھان کو روک پانے سے معذوری ظاہر کر رہا تھا۔ سیاہ گھنیرے بال اتنے لانبے کہ وہ اگر چاہے تو انھیں اوڑھ کر سو جائے۔ کم بخت ایک بھونچال تھی۔ اسکی نگاہ کی ایک کروٹ سے نوجوان حواسوں کی دنیا تہہ و بالا ہونے سے بچ نہیں سکتی تھی۔ اسے خود بھی اپنا ادراک تھا۔ اس لئے وہ اپنا سارا مال و متاع سفید ڈھیلے ڈھالے برقعے میں پوشیدہ رکھتی تھی لیکن پرچونی کی دوکان یا سبزی والے سے سودا سلف خریدتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے جب وہ مجبوراً اپنا نقاب الٹتی تو راستے قدموں کی چاپ اگلنا بند کر

دیتے۔ راہ چلتے اوباشوں کے ہی نہیں شریفوں کے چہرے بھی فق ہو جاتے۔ جنھوں نے اسے اسطرح بے نقاب دیکھ لیا اُسے برقعے میں بھی پہچاننے لگے اور اسکی گزرگاہ میں اکثر اوباش نگاہیں اسکی منتظر رہنے لگیں مگر خیرن نے کبھی ان کا نوٹس نہیں لیا۔ اکثر وہ اپنے راستے بدل دیتی اور کسی گلی سے ہوتی ہوئی وہاں پہونچ جاتی جہاں اسے پہونچنا ہوتا۔

"بس بس۔ زیادہ چاپلوسی نہ کر۔" اماں بی نے منہ بنا کر کہا۔ "جیتی رہ"۔ دعا بھی دے ڈالی کہ ان کا غصہ واجبی بھی تھا اور وقتی بھی۔

"یہ بتا ہفتہ بھر سے کہاں تھی؟"۔ تاج دلہن سے صبر نہ ہو سکا۔

"بس دلہن بی کیا بتائیں۔ نصیب سے کون جیتا ہے۔" ایک آہ نے اسکی آنکھوں میں اُترتے ستاروں کو روک دیا۔

"کیا ہوا؟۔ تیرے بچے تو ٹھیک ہیں؟"۔

"ہاں دلہن بی۔ شکر ہے"۔

"اور تیرا میاں؟"۔

"وہی تو ہم کہنے جا رہے تھے!"۔ اسکی شوخی عود کر آئی اور ستاروں نے پھر آنکھوں میں جھلملانا شروع کر دیا۔

"بس اب زیادہ مٹھاپن نہ دکھا۔ جا تاج دلہن کا ہاتھ بٹا۔ ہفتہ بھر سے اکیلی ہے بے چاری۔" اماں بی کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور شفقت بھی۔

"تو ہم بھی کوئی فارغ نہ بیٹھے تھے۔ سارے ہفتے تری بھنا رہے۔" خیرن اِٹھلا کر بولی اور تاج دلہن نے صاف محسوس کیا کہ اسکے اس بول میں کتنے ہی کنول کھل کھلا اُٹھے۔ وہ بے چین ہو گئیں ہفتہ بھر کی مصروفیت جاننے کے لئے۔ ہفتہ بھر کی ساری کلفتیں بھول گئیں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ اب کی بار وہ اسکی وہ خبر لیں گی کہ۔۔۔۔ مگر یہ بھی وہ جانتی تھیں کہ اس پر کچھ ہونے سے رہا۔ وہ تو چکنا گھڑا تھی۔ کیا مجال جو ایک بوند بھی اسکی مٹی جذب کرتی ہو۔

"اچھا اماں بی، میں جاتی ہوں۔ ہنڈی چڑھی ہے چولہے پر۔"

"ہاں جاؤ۔ ساتھ میں اس مال زادی کو بھی لیتی جاؤ۔ مگر سنو تو" تاج دلہن جاتے جاتے ٹھہر گئیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اماں بی کو دیکھا۔

"یہ کپڑا میں نے نکال لیا ہے۔ تمہیں جب فرصت ہو تو اسکا ارہبی پاجامہ کاٹ دینا۔ پھر ترپ تو میں لوں گی"۔

"یہ کام تو ہم کر دیں گے اماں بی"۔

"تو کرے گی؟"۔

"تو نہ کر سکتے۔ پچھلی بار ہم نے ہی آپ کے کُرتے کی ترپائی کی تھی۔ یاد ہے نا آپکو؟"۔ اُسکی ہنسی میں بلا کی شوخی گھلی ہوئی تھی۔

"ارے ہاں۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے نگوڑے مارے۔ یہ کیا پہنے بیٹھی ہوں"۔ یکایک ان کے لہجے اور آواز میں اپنا پن عود کر آیا۔ "پر تو ابھی جا۔ کام نپٹا لے۔ پھر آجائیو"۔ اور خیرن تاج دلہن کے عقب میں باورچی خانے میں پہونچ گئی۔ تاج

دلہن نے ہنڈی کا ڈھکن اُٹھایا۔ چمچے سے سالن نکال کر سونگھا۔

''شکر ہے جلا نہیں''۔ انہوں نے آدھا مگا پانی اور ڈال کے ڈھکن چھپا دیا۔

''خیرن۔ پیپے سے آٹا نکال کے گوندھ لے۔ پندرہ روٹی پکانا ہے۔ اسی حساب سے گوندھ لینا''۔ خیرن نے پرات میں آٹا نکالا، نمک ملایا اور پانی ڈال کر گوندھنے لگی۔

''ہاں اب یہ بتا یہ پورا ہفتہ کہاں رہی؟''۔ تاج دلہن چھری سے پیاز کی پرت اتارتی ہوئی بولیں۔ خیرن نیچے فرش پر پٹلے پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی اور تاج دلہن پاس میں ہی بچھی میز پر رکابی میں کرسی پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھیں۔ ''جس جس گھر میں تو کام کرنے جاتی ہے، وہ سب یہاں آکر ٹوہ لیتے رہے جیسے ہم نے تجھے بیگار میں بند کر رکھا ہے۔ کس کس کو مطمئن کرتی۔ تُو غائب ہی ایسی ہوئی۔ بتا تو یہ مہینہ بھر کہاں رہی ہے''۔ تاج دلہن کے لہجے میں بلا کا اشتیاق تھا۔ جیسے کوئی سہیلی اپنی نو بیاہتا سہیلی سے اسکی پہلی رات کا قصہ سننے کو بیتاب ہو۔ ''اس بار تیرا نکھٹو میاں تجھے کہاں کی سیر کرا لایا ہے؟''۔

''شملہ''۔

''شملہ۔۔اور اس موسم میں؟''۔

''پیار کی تو ایک ہی رُت ہووے ہے دلہن بی پیار اور صرف پیار''۔ خیرن کے انگ انگ سے ایک ان کہی لذت کرن بن کے پھوٹ رہی تھی۔ ''ہم اسی موسم میں ہی تو پہلی بار شملہ گئے تھے۔ وہ کیا کہے ہیں آپ کے یہاں''۔

'ہنی مُون''۔ تاج دلہن کی آواز میں بھی لذت سمٹ آئی مگر اِس لذت میں ایک حسرت بھی تھی۔ ایک تشنگی بھی تھی۔

''ہاں وہی۔ مُون پر۔۔ وہ تو کہیں اور جا رہے تھے پر میں نے کہا شملہ چلو وہاں کا شہد ایک دم خالص ہووے ہے سنا ہے ''۔ تاج دلہن ہنی مون کی اس انوکھی تشریح پر مسکرا پڑیں۔

''تو بس ہم دونوں شملہ چلے گئے۔ جانتی ہیں دلہن بی، پورا ایک مہینہ۔ مہینے کے تیس دن اور تیس راتیں۔۔ ہائے''۔ خیرن نے اسطرح اپنا رُخ بدلا کہ تاج دلہن کو احساس ہی نہیں ہو سکا۔ اب اسکے چہرے کا دایاں گال ہی وہ دیکھ سکتی تھیں۔

''پورے تیس دن رہی تھی وہاں؟''۔ تاج دلہن کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔ ایک سہرن سی حسرت زدہ لذت بن کے ان کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جلدی سے چھری اٹھائی اور پیاز کاٹنے میں خود کو مصروف کر لیا۔ ان کے کان خیرن کی طرف ہی لگے ہوئے تھے، وہ ساری کہانی سن لینا چاہتی تھیں۔

''پھر کیا ہوا''۔

''لوٹے تو گھر گرہستی نے جکڑ لیا۔ پھر بچے۔''

''پہلا تو بیٹا ہے نا؟''۔

''نا۔ پہلی بیٹی ہے، اسکے بعد بیٹا ہے''۔

تاج دلہن نے کٹی پیاز کو رکابی میں لیا۔ چھلکے ڈسٹ بن میں ڈالے اور رکابی میں پانی ڈال کر پیاز کی تیزی کو کم کرنے لگیں۔ دھو کر رکابی کا پانی نتھار لیا اور رکابی لے کر پھر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"خیرن۔ ذرا نمک اٹھا دے۔ اچھا تو رہنے دے۔ میں لے لوں گی"۔ انہوں نے نمک دانی سے پیاز پر نمک چھڑکا اور اس پر دہی کی پرت جما کر خیرن سے پھر مخاطب ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا؟"۔

"برس گزر گئے۔ ہم کہیں نہ جا سکے۔ گھر کی چار دیواری نے ایسا باندھا کہ شہد کب گڑ بن گیا، پتہ ہی نہ چلا۔ اب بچے ہاتھ منہ کے ہوئے، تھوڑا پیسہ جڑا تو ان کا پیار پھر امڈ پڑا اور ہم۔ شملہ چلے گئے"۔

"اور بچے؟"۔

"انہیں مکان مالک کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ کوئی اپنا تو ہے نہیں یہاں اور پھر جڑا پیسہ بھی اتنا نہ تھا۔ ابھی چھوٹے ہیں۔ بڑے ہوں گے تو اپنی پوتھی آپ ہی لکھ لیں گے"۔ خیرن کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں الٹی پڑی آٹے کو گوندھنے میں تیزی سے چل رہی تھیں۔

"تو ہفتے بھر شملہ میں ہی رہے تم دونوں؟"۔ پیاز پر پودینے کو کترتی ہوئی تاج دلہن نے پوچھا۔ "کیسا لگا اس بار؟"۔

"بس برسوں کی یادوں کو جھولی میں چن چن کے بھرتے رہے۔ بھی جگہوں کو دیکھا جہاں ہم پہلی بار گئے تھے۔ آہ۔ آپ سب کا دھیان نہ ہوتا تو ہم اور وہاں رہتے"۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں اچانک ہی ٹپکیں اور گیلے آٹے میں اسکی مٹھیوں کی زد میں آ کے چور چور ہو گئیں۔

"بہت چاہتا ہے نا وہ تجھے؟"۔

"کون؟"۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ کس کا ذکر کر رہی تھی۔

"ارے وہی۔ تیرا میاں"۔

"بہت"۔ وہ سنبھل گئی۔ ہلکی سی بھراہٹ جو آواز میں آئی تھی، پھر شوخی میں چھپ گئی۔

"دلہن بی۔۔ کیا آپ کے میاں بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں؟"۔ وہ رُخ بدل کر ان کو دیکھتی ہوئی پوچھ بیٹھی۔ تاج دلہن کو بھروسہ نہیں تھا کہ وہ اچانک یہ سوال کر بیٹھے گی۔ اس اُفتاد سے وہ پل بھر کو چپ رہ گئیں۔ جواب تو دینا ہی تھا۔ کرسی سے اُٹھیں اور ہانڈی کا ڈھکن کھول کر اسمیں چمچہ چلانے لگیں۔ اب ان کی پشت خیرن کی طرف تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے تین بچے ان کی چاہت کی گواہ جو ہیں"۔

"تو آپ کو وہ کہیں لے کے نہیں گئے کبھی؟۔ پہلی بار بھی نہیں؟"۔

"ہاں گئے تھے۔ شادی کے فوراً بعد ہی گئے تھے۔ مگر وہ ایک شادی تھی۔ خاندان کی شادی، اسکے ہنگامے، سارا خاندان ایک ہی گھر میں جمع تھا۔ میں نئی نئی دلہن تھی۔ سب ہی مجھے دیکھنے کو بیتاب رہے مگر۔۔۔"

"مگر کیا دلہن بی؟"۔

"اس بھرے پُرے شادی کے گھر میں ہمیں الگ سے کمرہ بھی نہیں مل سکا۔ وہ مردانے میں رہتے اور میں زنان خانے میں۔ بیچ میں لق و دق صحن۔ پھر دالان اور اسکے بعد مردان خانے کی یہ بڑی دیوار حائل۔ جب تک ہم وہاں رہے یہی چلتا رہا۔

دوبارہ انہیں تو تب دیکھا جب ہم واپسی کے لئے ریل میں بیٹھے"۔

"تو کیا آپ کا ہنی مون نہیں ہوا؟"۔

"اب تو اسے ہی ہنی مون سمجھ لے۔" وہ آہ بھر کر بولیں

"اور پھر بعد میں؟۔۔۔"

"بعد میں کیا۔ یہاں بھی وہی رہا جواب ہے۔ یہ صبح کو ملازمت پہ جاتے تو شام کو ہی لوٹتے۔ ہمیں جو چند گھڑیوں کا ساتھ ملتا تو بس وہی صبح کی کرن طلوع ہونے کے پہلے تک۔ بچے ہوئے تو ان کی دیکھ بھال، دکھ بیماریاں، گھر کے کام کاج۔ بس زندگی کا اہم پڑاؤ طے ہو چکا اور اب تو۔" وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ برسوں کے جمع دھوئیں کو اگل کر خود کو ہلکا پھلکا کر لینا چاہتی تھیں۔ گھر میں نہ تو نند تھی نہ پڑوس میں کوئی ہم عمر سہیلی۔ ایک اماں بی ساس کم ماں زیادہ۔ شوہر نے تعلیم اتنی پائی تھی کہ محبت کی لطافت سے خود کو محروم کر بیٹھے تھے۔ بس ایک فطری اشتہا جب بدن میں تشنج پیدا کرتی تو چند لمحوں کو قربت میں بدل جاتی۔ بچے جب چھوٹے رہے تو وقت پر لگا کر اڑ جاتا مگر اب وہ اسکول چلے جاتے تو سارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ اتنی بڑی حویلی جو دور تک سردار صاحب کی بڑی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ اسمیں صرف یہ دو عورتیں اور دن پہروں میں بدلتا ہوا۔ خیرن آتی۔ گھر کا سودا سلف بھی اسی سے منگوالیا جاتا اور پھر وہ بھی چلی جاتی۔ حویلی میں ایک ٹی وی سیٹ ضرور تھا مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ میاں کو اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی کہ وہ اسے درست کرالائیں۔

دھواں دھیرے دھیرے حلق سے خارج ہو رہا تھا۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ خیرن ہے تو دو ٹکے کی معمولی نوکرانی۔ گھر کی صفائی کرتی ہے۔ جھوٹے برتن تن سے اترے میلے کپڑے دھوتی ہے اور بدلے میں مہینے کی تنخواہ کے علاوہ غذا کے نام پر چند روٹیاں، بچا کھچا سالن ترکاری باندھ کر لے جاتی ہے۔ لباس بھی وہ وہی پہن لیتی ہے جو تاج دلہن پرانے کے نام پر اسے بخش دیتی ہیں جنہیں وہ بنا کسی ملال کے ہنسی خوشی قبول کر لیتی ہے۔ بچوں کے جو کپڑے چھوٹے ہوئے وہ بھی خیرن کو مل جاتے تھے۔

وہ اکثر خود کا اور اس کا موازنہ کرتیں تو خود کو اسکے مقابل ہلکا محسوس کرتی تھیں۔ وہ بھی تین بچوں کی ماں تھیں۔ میاں معقول عہدے پر ملازم تھے۔ ہر ماہ پوری تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر لا کے رکھ دیتے تھے۔ مصروف ضرور رہتے لیکن تاج دلہن نے ان کی چاہت میں کبھی کمی محسوس نہیں کی۔ بس وہ والہانہ پن وہ دیوانگی نہیں تھی جو ہر عورت اپنے شوہر سے پانے کی طلبگار رہتی ہے۔ ہر آسائش موجود مگر نہ جانے کیوں وہ خود کو خیرن سے کم ہی آنکتی تھیں۔ آئینہ ان کے چہرے کا صحیح عکس تو پیش کر دیتا تھا اور وہ خوب جانتی تھیں کہ وہ تازگی، وہ شگفتگی اور وہ چمک جو انہیں خیرن کے پورے سراپے میں موجزن لگتی تھی، اس کا عشر عشیر بھی تاج دلہن خود میں نہیں پاتی تھیں۔ اور یہی وہ لمحہ ہوتا جب ایک نفرت کا لاوا ان کے مساموں سے ابل پڑنے کو بیتاب ہو اٹھتا اور اُن کا جی چاہتا وہ اس کا سارا شباب نوچ کر چولہے میں ڈال کے کوئلہ بنادیں۔ کام تو وہ بھی کرتی تھیں مگر خیرن کی بہ نسبت کم چونکہ یہ کام ان کا اپنا ہوتا تھا۔ اپنے گھر کا ہوتا تھا لیکن پانچ سات گھروں کی جھوٹن دھونا، وقت پر نہ ہونے پر جھڑکیاں سننا اور ان کے عوض قلیل سا معاوضہ پانے کے باوجود اس کی خندہ پیشانی میں کوئی بھی کمی نہیں نکال پایا تھا۔ وہ حسد اور رشک سے اکثر تلملا

جاتیں مگر پھر اپنے اور اسکے طبقاتی فرق کو بجھ کر خود کو سمجھا لیتیں۔

''لائیے اماں بی۔ آپ کا پاجامہ چھانٹ دوں''۔ وہ تخت کے پاس آٹھہری۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی اذان کان میں پڑتے ہی اماں بی نے تازہ پانی سے وضو کیا جو نہ جانے کب خیرن ان کے لوٹے میں بھر کر دالان کے اُس در میں رکھ گئی تھی جہاں پٹلے پر بیٹھ کر اماں بی ہمیشہ وضو کیا کرتی تھیں۔ یہ ان کا پانچوں وقت کا معمول تھا۔ سردیوں میں ان کے لئے گرم پانی تیار رہتا۔ نماز وہ وقت پر ہی پڑھتی تھیں۔ دالان میں چھ در تھے جن کی وسیع اور موٹی دیواریں پتھروں کی مضبوط تراشیدہ کھمبا نما وصلیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ان دروں میں چقیں پڑی ہوئی رہتیں جو گرمیوں میں دوپہر ہوتے ہی کھول دی جاتیں۔ دالان میں ٹھنڈا سا ملگجا اندھیرا اتر آتا۔ فرشی پنکھا چلتا رہتا جسے مردانے میں کام کرنے والا شبراتی کام سن چھوکرا کھینچا کرتا۔ انہیں سیلنگ فین کی ہوا راس نہیں آتی تھی یا اس فرشی پنکھے سے ان کے جذبات جڑتے تھے جو ان کے شوہر کے زمانے سے اس جگہ موجود تھا۔ یہ اسکی ڈیوٹی تھی۔ یہ ڈیوٹی تب تک ختم نہ ہوتی جب تک برسات کے چھینٹوں اور پھواروں سے آنگن کی تپتی زمین نمی نہ اگلنے لگتی اور جسم سے بہتے پسینے کو ہوا کے خوشگوار جھونکے اپنے لمس سے جذب نہیں کر لیتے۔ وہ جب تھک جاتا۔ ہاتھ ڈوری کھینچتے کھینچتے شل ہو جاتے اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو وہ نتیجے کی پرواہ کئے بنا پائنتیں پڑ کر سو جاتا۔ ہوا نہ لگنے سے گرمی کی شدت محسوس ہوتی تو اماں بی اٹھ بیٹھتیں اور جب دیکھتیں کہ وہ معصوم سو گیا ہے تو ممتا کے دباؤ سے مسکرا دیتیں اور ہاتھ کے پنکھے سے اس پر بھی ہوا کرتے ہوئے خود بھی سو جاتیں۔

اماں بی ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ خیرن کی آواز پر ان کی توجہ بٹ گئی۔ تسبیح کے دانوں کو چوم کر قرآن مجید کے جزدان پر رکھا اور مصلیٰ کھولتی ہوئی بولیں۔

''سب کام ہو گیا؟''۔

''کام ہی کیا اماں بی۔ چند روٹیاں اور ایک ہنڈی۔ برتن جو تھے وہ بھی مانجھ دیئے۔ صاف صفائی سے نچیت ہو کر ہی تو آئی ہوں''۔ اسکے اسی سلیقے سے تو وہ خوش ہو جایا کرتی تھیں اور ساری کدورت ہوا ہو جایا کرتی تھی۔

''اچھا لے۔ یہ قینچی اور یہ ناپ کا پاجامہ۔ دیکھ اس سے ایک انچ ادھر سے ادھر نہ ہو۔''

خیرن نے ان کا پاجامہ پھیلے ہوئے کپڑے پر رکھا اور چند ہی پلوں میں اسی پیمائش پر کاٹ دیا۔ اماں بی نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

''تو اتنی چتر ہے تو کپڑوں کی سلائی کیوں نہیں کرتی؟ اسے لاج نہیں آتی تجھ سے گھر گھر کام کراتے ہوئے۔ سچ بتا؟ پیتا پلاتا تو نہیں ہے؟''۔

''ارے نہیں اماں بی۔ اس نے تو آج تک بیڑی بھی نہیں سلگائی۔'' وہ پٹاخ سے میاں کی طرفداری کرنے لگی۔

''کوئی اور شوق ہوگا۔ جوا۔ سٹہ۔ کہاں اڑاتا ہے وہ اپنی کمائی؟۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ وہ ایک چھدام بھی تجھ پر خرچ کرتا ہو''۔ اماں بی نے اسکے لباس کو دیکھتے ہوئے تنقیداً کہا۔ انہوں نے تو کبھی نیا کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا اسے۔

''لائیے سوئی دھاگہ۔ میں ترپ دیتی ہوں''۔ وہ اماں بی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ اماں بی نے تلے دانی

سے گئی اور سوئی نکال کر خیرن کو پکڑا دی۔ اس نے بڑا سا تاگہ ڈالا۔ دونوں سروں کو برابر کر کے گٹھان لگائی اور ترپائی کرنے لگی۔
اسی درمیان تاج دلہن سینی میں سلیقے سے کھانا لئے آگئیں۔ سینی اور کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں تخت پر رکھ دیں۔
''اماں بی۔ آپ کھانا کھا لیجئے۔'' صراحی سے گلاس میں پانی بھر کر پاس رکھی تپائی پر رکھ دیا۔
''ہاتھ دھوئیں گی؟''۔
''ابھی تو نماز پڑھی ہے''۔ انہوں نے روٹی کا نوالہ توڑا اور سالن میں بھگو کر منہ میں ڈال کے چبانے لگیں۔
''اس کے ہاتھوں میں کچھ ہے تاج دلہن۔ روٹی تو ایسی پکاتی ہے کہ نوالہ منہ میں آتے ہی حلق کی طرف چھلانگ مارتا ہے۔ ایک تم ہو''۔
''کیوں میں نے کیا کیا؟''۔
''تمہاری سینکی روٹیاں تو انگلیوں کے قابو میں ہی نہیں آتیں''۔
''لو بھلا۔ اب آپ بھی عیب نکال بیٹھیں''۔
''یہ عیب نہیں سلیقہ ہے۔ آج میرا پیٹ لگتا ہے بھر جائے گا''۔ اماں بی کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ دیکھ کر تاج دلہن بھی ہنس دیں۔ خیرن اپنے کام میں مصروف تھی۔ جب تک اماں بی کھانا ختم کرتیں خیرن کا کام پورا ہو چکا تھا۔
''لیجئے اماں بی۔ آپ کا پاجامہ سل گیا''۔
اماں بی نے چٹکی میں پکڑ کر پاجامہ اٹھایا۔ اسکی ترپائی پر تنقیدی نظر ڈالی اور تعریف و تحسین سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ تاج دلہن نے سلفچی میں ہاتھ دھلائے اور اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھ بھی دیئے۔
''اچھا اماں بی۔ میں جاتی ہوں۔ ابھی دو گھروں کا کام باقی ہے''۔ تاج دلہن نے جاتے ہوئے کہا۔
''تیری پوٹلی میز پر رکھی ہے۔ لیتی جانا''۔ خیرن نے برقعہ جسم پر ڈالا۔ کھانے کی پوٹلی اٹھائی اور سلام کر کے جانے کو ہوئی تو اماں بی نے روک لیا۔ ''اری اچھال دیدہ۔ تنک ٹھہر جا''۔ انہوں نے تلے دانی سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے۔ ''رکھ لے۔ یہ معاوضہ نہیں ہے ری۔ تیرے سلیقے اور وفاشعاری کا انعام ہے۔ بچوں لئے کچھ لیتی جانا''۔ خیرن کی آنکھوں میں تشکر کے ویران سے سناٹے کانپے اور وہ جلدی سے سٹر پٹر کرتی چلی گئی۔
خیرن کوئی دو برس پہلے ملازم رکھی گئی تھی۔ محنت، ایمانداری اور سلیقہ گھر کے افراد کو گرویدہ کر لینے کو کافی تھا۔ ۳۵۔۳۶ کا سن یوں تو عورت کو ڈھلان کی طرف لے جاتا ہے مگر خیرن تو اس سن میں بھی کسی کسائی عورت تھی۔ تاج دلہن اس سے ہمیشہ خوف زدہ رہتی تھیں۔ مرد کی نگاہ کا کیا بھروسہ؟ لاکھ شریف سہی، ٹپکتے رس کو چاٹنے کے لئے زبان ہونٹوں پر آ ہی نکلتی ہے۔ ان کے میاں جب گھر میں نہ ہوتے تب تو کوئی خوف نہیں لیکن کسی چھٹی والے دن وہ کہیں نہیں جاتے تھے اور اس دن تاج دلہن کا دل حلق میں بیٹھ رہتا۔ اور جلدی ہی اسکو چھٹی دیدی جاتی۔
اُس دن خیرن ان کے بیڈروم کی صفائی میں مصروف تھی۔ دوپٹہ پلنگ پر پڑا تھا اور شلوار کو نیفے میں کھرس رکھا تھا۔ تاج میاں اچانک ہی آگئے۔ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئے تو وہ اسٹول پر کھڑی جھاڑن سے چھت میں لگے سیلنگ فین کو صاف

کر رہی تھی۔ اونچے پائینچوں سے کھلی پنڈلیاں مٹھائی کے تھال کی طرح سجی مکھیوں کو رس چوسنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ چھت اونچی تھی اور جھاڑن چھوٹی۔ گردن اونچی کر کے ہاتھوں کو سیلنگ فین تک پہونچانے کی کوشش میں اسکے پنجے اُٹھ جاتے اور تنگ کرتی میں انمول رتن نقب زن کو سیندھ لگانے کے اشارے کرنے لگتے۔ اب ایسے میں کوئی کافر ہی ہوگا جو دو رکعت شکرانے کے پڑھنے کے لئے وضو کرنے میں وقت ضائع کرے۔ تاج میاں دروازے میں ہی کھڑے رہ گئے جیسے کاٹ مار گیا ہو۔ خیرن بے خبر صفائی کرتی رہی پھر اس نے جب اپنا رُخ پھیرا تو سونے پہ سہاگا ہوگیا۔ گرمی کا موسم، ہوا کا گزر مفقود۔ خیرن کی گردن سے پسینہ بہہ بہہ کر کرتی میں ایسا جذب ہوا کہ کرتی پیٹھ سے چپک کر رہ گئی اور تاج میاں کا ایمان اللہ کی بنائی بیش بہا نعمت کا ذائقہ چکھنے کو بالشت بھر آگے دوڑا کہ تاج دلہن نے یہ منظر دیکھ لیا۔ وہ نہ جانے کب شوہر کے پیچھے کھڑی یہ نظارا دیکھ رہی تھیں۔ اپنے میاں کے ندیدے پن کو جھوٹی رکابی میں نوالا ڈبونے کے لئے تیار دیکھا تو خطرہ بھانپ گئیں۔ فوراً خود پر قابو پایا اور مصلحت سے بولیں۔

"ارے آپ کب آگئے؟"۔ اور تاج میاں یوں لرز گئے جیسے کسی نیوز چینل کے کلوز سرکٹ کیمرے نے ان کے سارے تاثرات ٹیلی کاسٹ کردیئے ہوں۔ آدمی معقول تھے۔ بات جو اصل تھی زبان پر لے آئے۔

"ایک ضروری فائل بھول گیا تھا"۔ آگے بڑھ کر کباٹ کھولا۔ فائل نکالی اور نظریں ملائے بغیر تیزی سے چلے گئے۔

خیرُن کو پتہ ہی نہ چلا کہ اسکی نیاز کے کونڈے سے کوئی بے نیاز ہی چلا گیا"۔

"تیرا کام ہوگیا؟"۔

"ہاں دلہن بی"۔ وہ اسٹول سے اترتی ہوئی بولی۔ "اُف فوہ گرمی نے تو جان ہی نکال لی"۔

"اور تو نے میری"۔ تاج دلہن تڑاک سے بولیں۔ "مال زادی دوپٹہ تو ڈالے رہا کر"۔

اِتنی گرمی میں؟"۔ پائنچے برابر کرتی اور دوپٹہ سے پسینہ پونچھتی ہوئی خیرُن نے منہ بنا کر کہا۔

"تجھ میں گرمی بہت ہے۔ دیکھ تو چہرہ کیسا تپ گیا ہے۔ اتنی آگ تیرے اندر کہاں سے بھر گئی؟"۔

"پتہ نہیں"۔

"کبھی کبھی کسی اور کنویں سے بھی دو چار چلو پانی کے ڈال لیا کر اپنے بدن پر"۔ بات بہت عامیانہ سی تھی مگر تاج دلہن نے یہ عامیانہ بات کہہ کر خیرن کے اس راز کو جاننے کی کوشش کی جو افواہ بن کر ادھر اُدھر سے کانوں میں پڑ جایا کرتا تھا۔

"نا دلہن بی۔ خیرن کے کنویں کی جگت ایک ہی ہے"۔ وہ بھی حرفوں کی بنی تھی۔ تاج دلہن اسکے راز کو جانتی ہوں یا نہ جانتی ہوں مگر خیرُن ان کی بات کا مطلب اچھی طرح جان گئی۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "جب تک اُسی جگت سے میٹھا پانی ملتا ہو تو کاہے اور کے کنویں میں جھانکیں"۔ خیرُن کا جملہ ذومعنی تھا لیکن اس کا مفہوم وہی تھا جو تاج دلہن نے سمجھا۔

اسکے بعد تاج دلہن اور چوکنا ہوگئیں۔ ہفتے کے چھ دن ہی اس سے کام لینے لگیں۔ اتوار کو شوہر گھر میں رہتے تھے۔ خیرُن کی اس دن چھٹی ہونے لگی۔

خیرُن نے کبھی کسی کے طنز، کسی کی پھبتی اور کسی کی گالی کا برا نہیں مانا تھا۔ ایک زمانے سے وہ دشنام سہتی آ رہی تھی۔ مرد کی

ہوسنا کیاں اکثر اسے اندر سے زخمی کر جاتی تھیں اور ان زخموں کی ٹیسیں اٹھائے ایک گھر سے دوسرے گھر ایک محلے سے دوسرے محلے عمر کی راہیں پھلانگتی رہی۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام تک اسکی بندھی ٹکی مصروفیت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ دوپہر کو گھر آتی۔ شوہر پر محبت کی نظر ڈالتی۔ اسکی طبیعت پوچھتی۔ بخار تو نہیں ہوا؟ کھانسی تو نہیں آئی؟ اور وہ ہر بات کا انکار کرتا جاتا۔ اسٹو جلا کر کھانا گرم کرتی اور بہت سلیقے سے سینی میں رکھ شوہر کے پاس آبیٹھتی۔ پہلا نوالہ شوہر کے منہ میں رکھتی اور دوسرا خود کھاتی۔ جب تک کھانا چلتا رہتا دونوں ایک دوسرے کو والہانہ پن سے دیکھتے رہتے۔ خیرُن کی آنکھوں میں محبت صرف محبت کے چراغ روشن رہتے۔ محبت تو شوہر کی آنکھوں میں بھی ہوتی مگر اس محبت میں حزن وملال بھی کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ کھانے سے نچنت ہو کر گھڑی بھر کروہ شوہر کی بانہوں میں لیٹ جاتی۔ اپنا سر اسکے کشادہ سینے پر رکھ دیتی۔ ساری دنیا اس حصار کے باہر رہ جاتی۔ یہ حصار ایک پناہ گاہ بھی تھا اور اسکی عزت کا محافظ بھی۔

"خیرُن"۔

"ہاں"۔

"تو مجھے چھوڑ دے"۔

"کیوں؟"۔

"تیرا بگڑا ہی کیا ہے۔ مجھ سے اچھا مرد مل جائے گا"۔

"پر تم تو نہیں مل پاؤ گے۔ میں جیسی بھی ہوں، تمہاری آغوش میں خوش ہوں"۔

"اور جو میں مر گیا تو"۔

"تو میں بھی کہاں زندہ رہ پاؤں گی"۔

اماں بی نے اُس دن جو سجدے میں سر رکھا تو پھر نہ اُٹھا سکیں۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ رشتے دار اور آس پڑوس کے جمع ہو گئے اور چند گھڑیوں میں ہی اماں بی آبائی قبرستان میں دفن ہو گئیں۔ تخت بے وجود ہو گیا اور وہ دالان بھی جس کی ساری برکتیں اماں بی کے دم سے اُترتی تھیں۔ خیرُن نے تاج دلہن کو بھی سنبھالا اور بچوں کو بھی لیکن اس آزردہ ماحول میں بھی تاج دلہن خیرُن کی چلت پھرت سے چوکنا رہیں۔ سوگوار دنوں میں تاج میاں بھی تو گھر کے ہو کے رہ گئے تھے۔

اور پھر ایک دن خبر آئی کہ خیرُن بیوہ ہو گئی۔ خبر لانے والے نے گھر کا پتہ اور قبرستان کا پتہ بتا دیا تھا۔ دوسرے گھروں کی عورتیں بھی جا رہی تھیں، تاج دلہن بھی ان کے ہمراہ خیرُن کے گھر پہونچ گئیں۔ میت کو غسل دے کر کفنایا جا چکا تھا۔ آنگن اور چھوٹا سا دالان عورتوں سے بھرا تھا اور باہر چند مرد جمع تھے۔ تاج دلہن نے دیکھا، سوکھے مرجھائے پھولوں کی مانند خیرُن عورتوں کے درمیان تھی۔ اس کی شادابی کو جیسے عفریت نے چوس لیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بالوں میں راکھ پڑ گئی تھی۔ اچانک باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔ جنازہ تیار ہے۔ کچھ عورتوں نے خیرُن کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس بے جان سے جسم کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی جنازے کے پاس لائیں اور اسکے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دیں۔ کسی خاتون نے کہا"۔ بیٹی۔ اللہ رسول کو درمیان میں لا اور

مہرنان ونفقہ سب کچھ معاف کردے“۔خیرن تو ایک ٹک اپنے شوہر کے اس مردہ چہرے کو دیکھتی رہی جو کفن سے نکلا ہوا تھا۔

”بیٹی۔شریعت یہی کہتی ہے۔معاف کردے۔کہہ دے تو نے اپنا مہر اپنے سارے واجب حقوق معاف کئے“۔اور تاج دلہن نے دیکھا، اسکی ہمت عود کر آئی اور منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے۔

”جاؤ۔میں نے سب کچھ معاف کیا“۔وہ جنازے سے لپٹ کر رو پڑی۔

جنازہ چلا گیا۔عورتیں بھی جانے لگیں۔تاج دلہن کو نہ جانے کس کی تلاش تھی۔ان کی آنکھیں برابر کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئیں تو ایک خاتون سے پوچھ ہی لیا۔”سنئے۔کیا آپ یہیں آس پاس ہی رہتی ہیں؟“۔

”جی۔یہ میرا ہی مکان ہے“۔خاتون شائستگی سے بولیں۔

”اور خیرُ ن“۔

”وہ کرایہ دار ہے مگر ہم اس سے کرایہ نہیں لیتے۔اسکے عوض وہ گھر کا کام کردیتی ہے“۔

”اس کے بچے نظر نہیں آرہے؟“۔

”آپ؟“۔

”میں بڑی حویلی سے آئی ہوں“۔

”تاج دلہن۔خیرن آپ کی اکثر تعریف کرتی ہے۔آپ کی والدہ۔شاید؛

”جی وہ میری ساس تھیں“۔

”اوہ۔بہت افسوس ہوا تھا ان کے انتقال کی خبر سن کر“۔خاتون تاسف سے بولیں۔

”آپ نے بتایا نہیں۔خیرن کے بچے۔۔۔۔۔۔“

”وہ تو کبھی ہوئے ہی نہیں“۔

”کیا مطلب“۔

”شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔خیرن نے دو چار راتوں کا ہی سکھ اٹھایا تھا کہ وہ حادثہ ہوگیا“۔

”حادثہ“۔

”خیرن کا شوہر بجلی گھر میں لائن مین تھا۔اس دن کھمبے پر چڑھا کام کررہا تھا کہ نہ جانے کیسے تاروں میں کرنٹ آگیا اور بجلی کے جھٹکے سے وہ نیچے گر گیا۔بجلی کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ جان تو بچ گئی مگر اس کا نچلا دھڑ بالکل مفلوج ہوگیا۔کسے کہتے ہیں پندرہ سال۔اور خیرن۔وہ تو ایسی بیوی نکلی جس کی وفا پرستی کی مثال نہ تو مذہب دے سکتا ہے نہ تاریخ“۔

تاج دلہن پر تو مانو گھڑوں پانی پڑ گیا۔انہوں نے اپنے شکوک کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ خیرُ ن کو اماں بی کا وہ تخت سونپ دیا جسکے تقدس اور پاکیزگی کو صرف خانہ کعبہ کا غلاف ہی چھو سکتا تھا۔

☆☆☆

سدھارتھ

سورج مغرب میں آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔اسکی زرد اور نرم کرنیں منظر کو دلکش بنا رہی ہیں۔ہوا میں نرم سی خنکی ہے۔ شاہزادہ سدھارتھ محل کے جھروکے میں کھڑے منظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ گلابی ہونٹوں پر پھول جیسی مسکراہٹ اور آنکھوں میں پُر تجسس اور خوابناک سی چمک ہے۔یکا یک اُن کی نگاہ بہت سے لوگوں پر پڑی جو ایک ہی لباس میں ملبوس، اوپری جسم برہنہ اور ستر پوشی کرتی سفید دھوتی، پیر ننگے آہستہ آہستہ کوئی اشلوک پڑھتے بھیڑ کی شکل میں محل کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔سدھارتھ تھوڑا جھک کر دیکھتے ہیں۔بھیڑ کے درمیان جنازہ ہے جسے چار لوگ کاندھوں پر اٹھائے چل رہے ہیں۔سفید کفن میں لپٹی لاش غم زدہ لوگ، اپنے ہی کسی عزیز کے بے جان جسم کو اٹھائے مسان کی سمت چلے جا رہے ہیں۔کل تک۔کل ہی کیوں کچھ گھڑی پہلے تک یہ بے جان شخص مسکراتا زندگی کی دوڑ میں شامل رہا ہوگا۔خاندان سے جڑا خاندان کے افراد کے مسائل، ان کے دکھ سکھ، ان کی خوشی اور غم میں شریک رہا ہوگا اور اب؟۔کچھ پل بیتے ہیں، آگ اسے جلا کر راکھ بنا دے گی جو چار لوگ اسے اٹھائے لئے جا رہے ہیں، اُن میں سے صرف ایک شخص کی مٹھی میں اسکی راکھ سما جائے گی۔اُف! بس یہی ہے انسان کی ابتداء اور انتہا؟۔اگر یہی انتہا ہے تو ابتدا کیوں ہے؟ انت کے لئے آرمبھ کیا معنی؟۔

سدھارتھ اس منظر کی اصلیت کو جان کر کانپ اٹھتے ہیں اور چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لرز جاتی ہیں۔آنکھوں میں خوابناک چمک کی جگہ غم جھانکنے لگتا ہے اور ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ کے بجائے خشک سی لرزش آجاتی ہے۔اچانک انہیں احساس ہوتا ہے جیسے وہ اکیلے نہیں ہیں۔پلٹ کر دیکھتے ہیں۔اُن کی ماں اور کپیلا دستو کی مہارانی مہامایا کھڑی ہیں۔چہرہ پر ممتا کا نور ہے اور آنکھوں سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔

سدھارتھ تعظیم دیتے ہیں۔مہامایا ان کے بازو پر اپنا ملایم ہاتھ رکھ کر دعا دیتی ہیں۔

"خوش رہو"۔

"آپ نے کیوں زحمت کی؟۔مجھے بلا لیا ہوتا؟"۔

"ہم یہ دیکھنے آئے تھے کہ تم تیار ہوئے یا نہیں؟"۔مہامایا نے ان کے سراپے پر نظر ڈالی۔اور شاکی لہجے میں بولیں۔"مگر تم تو ابھی جوں کے توں ہو۔نہ لباس بدلا نہ خود کو سنوارا؟"۔

"وہ کس لئے؟"۔

"تمہیں یاد نہیں؟ آج جشنِ بہار ہے"۔

"اوہ۔ہاں۔یاد آیا"۔

"تو پھر اب تک تم اسی حالت میں ہو۔وقت کتنا گزر گیا۔کن خیالوں میں گم ہو جان عزیز"۔

"خیال۔تجسس۔فکر۔زندگی کی حقیقی بنیادیں ہیں ماں"۔سدھارتھ کا لہجہ فکر انگیز ہو گیا۔

"اُن کی سنگینی ہی سوچ کو جنم دیتی ہے۔ماں! آپ مجھے معاف کریں۔میں جشن میں شریک نہیں ہو پاؤں گا"۔

"کیوں؟"۔ کس لئے۔ کیا طبیعت ٹھیک نہیں؟"۔ مہامایا کی ممتا تڑپ اٹھی!

"بیمار ضرور ہوں مگر کسی مرض کے سبب سے نہیں"۔

"اوہ۔ میں سمجھی"۔ بیٹے کے مزاج سے وہ خوب واقف ہیں۔ انہیں اطمینان ہوا کہ بیٹا بیمار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کی طرح اُس نے سنجیدگی کو اپنے اوپر طاری کر رکھا ہے۔

"اچھا۔ تم ٹھہرو۔ میں یشودھرا کو بھیجتی ہوں"۔ مہارانی نے ایک نگاہ بیٹے پر ڈالی اور اس سے پہلے کہ سدھارتھ اُن سے یہ کہہ پاتے کہ یشودھرا کے آنے سے بھی اُن کی بے چینی دور نہیں ہوگی، مہارانی کمرے سے نکل کر چلی گئیں۔!

سدھارتھ دریچے سے پھر نگاہ نیچے ڈالتے ہیں۔ سلطنت کے وزیر، امیر اور اکابرین، زرق برق لباسوں میں ملبوس شاندار سواریوں، گھوڑوں، ڈولیوں میں سوار محل آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کی عورتیں بھی ہیں۔ آریائی لباس، سینوں کے ابھار چند انگل چوڑی تنگ چولی سے ڈھکے، کھلے پیٹ اور ناف سے لے کر پیروں تک اور بھڑ کیلے، اشتہا انگیز ملبوسات دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ سدھارتھ کے ہونٹوں پر بے جان سے مسکراہٹ آگئی جس میں استہزائیہ عنصر شامل ہے۔ انہیں لگا جیسے یہ لوگ قابلِ دید نہیں ہیں۔ نہ قابلِ شوق ہیں نہ قابلِ نگاہ و دل کے مرکز ہیں۔ نہ قابلِ نفرت ہیں اور نہ ہی قابلِ اعتنا بلکہ۔ اُن پر ترس آتا ہے۔ یہ قابلِ رحم لوگ ہیں۔ انہیں نہیں معلوم یہ کن منزلوں کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ یہ نہیں جانتے، اُن کی پرواز چٹانوں پر بسیرا نہیں کر پائے گی۔ یہ تو تنزل کی جانب محوِ سفر ہیں۔ نشیب میں اپنی زندگی کا کارواں لئے جا رہے ہیں۔!

اُنہوں نے پھر دیکھا! گھوڑا گاڑیاں اور فینسیں محل سرا کے داخلی دروازے پر ٹھہر چکی ہیں اور فینسوں سے خواتین اتر اتر کر اندر جا رہی ہیں اور گھوڑا گاڑیوں سے مرد۔ یہ پہریدار اُن کے قدموں تک جھک جھک کر تعظیم دیتے، ان کی اگوائی کرتے اُن سے مختلف ہیں۔ اُن کے لباس بھی مختلف ہیں۔ مختلف ہی نہیں بلکہ مختصر ترین ہیں۔ نہ جسموں پر کوئی آبھوشن ہیں نہ لباس میں (اگر اسے لباس کہا جائے تو) کوئی بھڑ کیلا پن ہے۔ ایک دھوتی ان کی ستر پوشی کرتی ہوئی۔ سروں پر لمبے بال جن پر پگڑی کے نام پر دو بل دیتا کپڑا۔ پیر برہنہ، پاپوش سے محروم۔ ہاں ایک زیور ضرور ہے، کانوں میں کنڈل جو انہیں غلام ہونے کی پہچان دیتا ہے۔ آہ۔ انسان انسان کے درمیان یہ تفریق کیوں؟۔ کیوں کوئی آقا تو کوئی غلام؟ کوئی ظالم ہے تو کوئی مظلوم؟۔ کوئی دھنی ہے تو کوئی نردھن؟۔ کسی کے پاس زندگی کی ہر آسائش ہے تو کسی کے پاس زندہ رہنے کے لئے چند لقموں کی غذا بھی نہیں۔!

سدھارتھ دل برداشتہ ہو کر دریچے سے ہٹ آئے۔ انہوں نے اپنے لباس پر نگاہ ڈالی۔ خوابگاہ کی سجاوٹوں کو دیکھا۔ دروازے پر مستعد پہریداروں کو مستعد محسوس کیا۔ اپنے ہاتھ کی طاقت اور زبان سے ادا ہوئے کلمات کی اہمیت کو سمجھا۔ ہاتھ، جن کی ایک تالی پر دسیوں گردنیں جھکائے، نگاہیں فرشِ راہ کئے غلام اُن کے حضور باریاب ہونے میں پل کی دیر نہیں کرتے۔ زبان، جس سے ادا ہو الفظ تقدیر بدلنے پر قدرت رکھتی ہے۔ یا خدا! تو نے تو انسان کو آزاد پیدا کیا تھا۔ اُسے آزاد ہی رہنے دیا ہوتا۔ کیوں کسی میں اہنکار تو کسی میں نر بلتا دیدی۔ کسی کو پُر قوت کیا اور کسی کو نادار کر دیا۔

وہ کچھ اور بھی سوچتے اور اسی تانے بانے میں الجھے رہتے کہ اُن کی شریکِ زندگی یشودھرا اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اُن کے نزدیک آٹھہری۔ سدھارتھ نے کمزور اور پھیکی سی مسکراہٹ سے یشودھرا کا استقبال کیا۔ اُن کی مزاج پرسی کی لیکن یشودھرا تو اپنے شوہر کو ساتھ لے جانے آئی ہیں۔ روایتی اخلاق کی فی الحال ضرورت نہیں سمجھتیں!

"یہ کیا؟ آپ نے ابھی تک شاہی لباس نہیں پہنا؟" ان کے لہجے میں پیار بھی ہے اور شکایت بھی۔ سدھارتھ محسوس ضرور کر لیتے ہیں مگر اس کا اظہار ان کے نزدیک تضیع اوقات کے ساتھ ان کے لئے خطرناک بھی ہے۔ جذبات میں بہہ کر بیوی کے نزدیک آنا یا اسکی خوبصورتی کی تعریف کرنا بیوی کو بڑھاوا دیتا ہے جسے وہ خطرناک ہی تصور کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جو فرائض ان پر عائد کئے گئے تھے، فطری تقاضوں کا جو رشتہ انہیں سلطنت کی جانب سے عطا کیا گیا تھا اُسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ کہیں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ کوئی انگلی اٹھا سکتا ہے کہ ایک آریہ شاہزادے نے والدین کی اطاعت سے روگردانی کی ہو؟ یا اُن کی آرزو پوری کرنے میں کوتاہی برتی ہو یا بستر پر موجود بیوی کے جذبات کا احترام نہ کیا ہو؟ یہ سب سوچتے ہوئے سدھارتھ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔ آسمان پر اڑتے پرندے کی مانند آزادی کا لمس ان کے مساموں میں تازگی کا احساس جگا دیتا ہے۔ مگر زندگی کا مقصد آسمان کی اُڑان ہی تو نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ سلطنت کے تخت پر تمکنت سے بیٹھ کر اپنے ہی جیسوں کی قسمت کے فیصلے کرتے رہیں۔ میدانِ جنگ بھی نہیں جہاں ایک آدمی کی فتح اُسے ہزاروں ہزار لوگوں کا قاتل بنا دے۔ بھلے ہی وہ خود کو فاتح کہے مگر ہوگا وہ قاتل ہی۔ سفاک درندہ صفت قاتل!

انہوں نے یشودھرا کی طرف دیکھا جو اُن کا لباس نکال کر رکھ رہی ہیں۔ اس وقت یشودھرا کتنی خوش ہیں۔ سارا تیج اُن کے چہرے پر سمٹ آیا ہے اور یہ تیج یشودھرا کے بے پناہ حسن میں اضافہ کر رہا ہے جسکی تشریح الفاظ میں ممکن ہی نہیں اور سدھارتھ جیسے اپنی ذات میں سمٹے، بندھے اور محدود شخص کے لئے ممکن بھی نہیں ہے۔

"یہ دیکھئے آریہ شہزادے"۔ یشودھرا نے منتخب شدہ لباس اُٹھا کر اپنے شوہر کے جسم سے لگا کر کہا۔ "آج کے جشن میں یہ لباس آپ پر خوب سجے گا۔ جب آپ اسے پہن کر جشن میں شریک ہوں گے تو ہر نگاہ آپ اور صرف آپ کو دیکھے گی"۔

"اور جب ہر نگاہ مجھے دیکھے گی، اس نگاہ میں میرے لئے بہت کچھ ہوگا، احترام بھی، التزام بھی، تکریم بھی، تحسین بھی اور کچھ ایسی نگاہیں بھی ہوں گی جن میں آریہ شہزادے کی وجاہت کا حصول بھی ہو۔ چاہت بھی ہو۔ طلب بھی ہو۔ نفسانی خواہش بھی ہو۔ تب تم کیا کرو گی یشودھرا۔ تب تمہارے جذبات کیا ہوں گے؟"۔

"یہ کہنا مشکل ہے"۔ یشودھرا نے منہ بنا کر سوچتے ہوئے جواب دیا۔ یشودھرا کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ ابھر آئی جس سے اُن کا سارا چہرہ کھل اُٹھا۔ "اتنے لوگوں کی بھیڑ میں ہزاروں نگاہیں ہوں گی۔ ان میں چند نگاہوں میں چھپے تاثرات کو پہچاننا کیسے ممکن ہوگا آریہ پتر؟۔ ہاں تب مجھے فخر اور انبساط کا احساس ضرور ہوگا۔ میں اپنی قسمت پر رشک کروں گی کہ میں اس شخص کی تنہائی کی ساتھی ہوں جو ہزاروں لوگوں میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے"۔

سدھارتھ نے یشودھرا کے سراپے پر نظر ڈالی اور وہ اُن سے قدرے دور چلے گئے۔ مبادا جذبات لو دے اُٹھیں۔ دور ہو کر بے اختیاری ان کی نظر پھر بیوی کو نہار اٹھی۔ یشودھرا کی جوانی ایسی نہیں ہے کہ جسے نظر چرا کر دیکھا جائے۔ بے پناہ مقناطیسی کشش کا حامل حسن۔ ایک مکمل اور ناقابلِ تردید حسن۔ قدرت کی صناعی کا بیش بہا خزانہ جس نے سدھارتھ کی نوعمر زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ دل نشیں آگ جو تپش دے کر خواہشات کی تکمیل چاہتی ہے۔ جو دور سے انگار لیکن قرب پا کر کلیوں سے زیادہ نرم، شوخ اور نرمل۔

یہ تو کتابِ فطرت ہے۔ ضروری اور لازمی۔ اس کتاب میں کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ نہ کسی مستند آسمانی صحیفہ اس تحریر کا عکاس

ہے۔ہاں صرف تصور کی آنکھ سے پڑھا جاسکتا ہے۔جذبات کا شعور اسے دیکھ سکتا ہے۔خواہش اور رگوں میں دوڑتے لہو کی گرمی اسے پہچانتی ہے۔

سدھارتھ نے تشنہ لبی کو اندر ہی جذب کر لیا۔تیاگ، پہلے اپنی نفسانی خواہشات کا لازم ہے۔پہلے ہر اس شئے سے فرار لازم ہے جو اسے اپنی جانب راغب کرتی ہو۔بلاتی ہو، کھینچتی ہو!

اِن دنوں یشودھرا کا حسن کچھ اور نکھر گیا ہے۔جسم بھر سا گیا ہے۔جب وہ بیاہ کر پہلی بار اس خوابگاہ میں آئی تھی تو تب کتنی نازک اندام اور پھول سی کومل تھی لیکن اِدھر چند دنوں میں ہی اسکے روپ میں ایک انوکھی دل کشی پیدا ہو گئی ہے۔ایک عجیب سی من موہنی، کچھ کہتی سی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر رہی نہیں کسی کسی چولی، نیچے سے پھیلا ہوا پیٹ کچھ زیادہ ہی اُبھر آیا ہے۔کیا یہ اُبھار اسکی ناپختہ، نوخیز جوانی پر ایک داغ نہیں ہے؟ حسن کا تو بے داغ ہونا ہی، بے عیب ہونا ہی صفِ مخالف کو اپنی جانب راغب کرنے کا مؤثر ذریعہ بنتا رہا ہے۔لیکن نہیں، اس ابھار نے تو یشودھرا کو ایک اعتماد بخش دیا ہے۔یہ اسکی چال سے ظاہر ہوتا ہے۔اسکی گفتگو، اسکے لہجے اور اسکے ہر انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔کہ صرف پیٹ کے اس اُبھار نے اُسے زندگی کا اعتبار، اس شاکیہ خاندان میں سر بلند حیثیت کا حامل بنا دیا ہے۔

''آپ کن خیالوں میں کھو گئے ناتھ؟''۔

''خیال اور تجسس سے ہی فکر کو روشنی ملتی ہے''۔

''آپ ان خیالات سے چھٹکارا نہیں پا سکتے؟''۔

''نہیں یشودھرا۔یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ایک حساس انسان ہونے کے ناطے خیالات کی باگ میرے ہاتھوں میں نہیں ہے۔یہ تو آتے ہیں تو آتے ہی چلے جاتے ہیں''۔

سدھارتھ کے معصوم لہجے میں سنجیدگی کا عنصر زیادہ ہے۔''پہلے میں خیالات کو گرفت میں لینا چاہتا تھا اور خیالات ریت کے ذروں کی طرح انگلیوں میں پھسل جاتے تھے لیکن۔اب افکار مجھے اپنی گرفت میں لئے رہتے ہیں اور میں کوشش کے باوجود نہیں نکل پاتا۔ریت کے ذروں سے بھی گیا گزرا ہوا میرا وجود''۔

''ایسا کیوں ہے شاہزادے؟''۔

''شاید اس لئے کہ میرے وجود کی اساس کن ہی اور عناصر سے ترتیب پائی ہے۔آج ابھی کچھ وقت پہلے جب میں اس دریچے میں کھڑا قدرت کے عطیات سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میں نے اس شاہی راستے پر ایک جنازہ دیکھا۔سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش، اس انسان کی لاش، جس نے پیدا ہونے کے بعد اس زمین کے وسیع سینے پر کتنے ہی کارنامے انجام دیئے ہوں گے۔کبھی فتح پائی ہوگی۔کبھی ہار ابھی ہوگا مگر سانس کے تار ٹوٹتے ہی وہ نہ ہنس سکتا ہے، نہ رو سکتا ہے۔نہ ہار ہے نہ جیت۔کچھ نہیں۔کچھ بھی نہیں ۔امنگ، ولولہ، زندگی اور دل بستگی کے اس موسم میں بھی ایک انسان مر گیا؟ کیا موت سے مفر نہیں یشودھرا؟''۔

یشودھرا نے ایک آہ بھری۔غالباً اپنے شوہر کی ذہنی حالت کو وہ بہتر جانتی ہیں۔شاہزادے کو دیکھا اور گویا ہوئیں۔''زندگی تو بنتے مٹتے حروف کی مانند ہے اور موت ایک اٹل حقیقت جو آیا ہے آخر کار اُسے اپنا وقت پورا کر کے جانا ہے یہی قدرت کا اصول ہے''۔

''تو کیا، کھلتے پھولوں کی خوشبو، کلیوں کی نرم مسکراہٹ، فضا میں اڑتے پرندوں کی پرواز، بہتی ندی کا نوخیز ترنم، رات کی گود

میں ہمکتا چاند، شب کے آنچل میں جھلملاتے ہوئے ستاروں کی ضیاء پاشی، صبح کی مانگ میں دمکتی ہوئی آفتاب کی روپہلی شعاع۔ شام کی آغوش میں سمٹتا جادو۔ انسان کے خوابوں کی نکھرتی تعبیریں۔ یہ خانقاہیں۔ یہ عمارات۔ یہ عالیشان محلات۔ یہ من وتو کا جھگڑا۔ تم اور تُو کا فرق۔ دکھ سکھ کا امتیاز۔ لکیروں کی بنیادوں پر مقدرات کی تعمیرات۔ یہ میں۔ یہ تم اور تمہارے وجود میں سانس لیتاان دیکھاان بوجھا سچ۔ کیا یہ سب فریب نظر ہے۔؟ ایک لاش میں تبدیل ہوجانے کے یہ تمام سامان ہیں"۔؟

"آپ تو شاعری کرنے لگے"۔ یشودھرا کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ہے۔ انہوں نے ہونٹوں کو بھینچ کر شوہر کو غور سے دیکھا کہ سدھارتھ کو ایک نئے وجود نئی زندگی کا آبھاس ہوگیا ہے، یہ سوچ کر ہی یشودھرا کا سارا جسم انبساط سے سہر اٹھا!

"کویتا کا مجھے نہ تو گیان ہے اور نہ اشعار کی بندش کا شعور" سدھارتھ نے بدستور سنجیدگی سے جوابدیا۔ "میں نے ایک توانا تندرست اور صحتمند شخص کو دیکھا تھا بہت پہلے۔ جب میں عمر کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر ایک جست میں بیٹھ جاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں بھاری تلوار اور دوسرے ہاتھ میں بڑی سی ڈھال اٹھائے دانتوں میں گھوڑے کی باگیں پکڑے دشمنوں پر یلغار کرتا، اُن کی گردنیں اڑاتا اور پھر فتح پاکر شادمانی اور فرحاں واپس لوٹتا میں نے دیکھا تھا لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو وہی شخص اپنے جسم کو اپنی ٹانگوں پر بوجھ محسوس کرتا لگا۔ ایک لاٹھی اُسے سہارا دئے اسکے قدموں کو آگے بڑھانے میں معاون بنتی ہوئی۔ کمر جھک گئی۔ بدن لاغر۔ نگاہ دھندلائی ہوئی اور جسم پر شکنیں جال بناتی ہوئی"۔

"ہر شئے فنا ہونے کے لئے ہی پیدا کی جاتی ہے۔ وہ چاہے پھول کا تبسم ہو یا انسانی زندگی"۔

"تو گویا جس وجود پر ہم اسقدر ناز کرتے ہیں وہ ایک دن مٹ جانے والا ہے؟ تو پھر یہ غرور یہ گھمنڈ کس لئے؟۔ یہ حاکم و محکوم کا امتیاز کیا معنیٰ؟"۔

"یہ تو انسان کے بنائے اصول ہیں۔ عقل ودانش کی حدود ہیں۔ وہ حصار ہیں جو انسان نے اپنی حفاظت اور اپنی نجات کی خاطر قائم کئے ہیں۔ انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا"۔

"بے شک۔ یہ اصول اسی لئے ہیں کہ آدمی کو آدمی سے ہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔ حیوان سے بھی زیادہ، حیوان صرف چیر پھاڑ کرسکتا ہے۔ دغابازی۔ مکاری، فریب، دوستی، دشمن، انسانیت، اعلیٰ ظرفی۔ کم ظرفی۔ ایثار اور خودغرضی یہ انسان کی سرشت ہے، جو ہر چیز پر خود کو قادر سمجھتا ہے۔ ضعف، اضمحلال۔ لاغری۔ بے بصارتی اسکے دستِ قدرت سے باہر ہیں۔ زمین کی وسعتوں کو اپنے قدموں سے روندڈالتا ہے لیکن جب فنا ہوتا ہے تو اتنی ہی زمین اسکا مقدر بنتی جس میں اسکا بے روح جسم سما جائے"۔

"اُفوہ! اتنی معمولی بات کو اتنا طول نہ دیجئے۔ زیادہ سوچ آج کے دن مناسب نہیں ہے"۔

"سوچ وفکر ہی سے انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ گناہ وثواب کی حدیں۔ انصاف وناانصافی کا فرق زندگی اور موت کی سچائیاں۔ یہ جستجو ہی ہمارے دل میں کسی نتیجے پر پہونچاتی ہے"۔

"کیسی جستجو اور کیسا نتیجہ؟"۔

سدھارتھ کے ہونٹوں پر معنیٰ خیز تبسم آگیا۔ وہ یشودھرا کو دیکھتے ہوئے بولے جہاں سدھارتھ کی باتوں سے پیدا ہوئی اکتاہٹ صاف جھلک رہی ہے۔ گو کہ یشودھرا نے اپنے انداز سے اس کا اظہار روک رکھا ہے۔

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا یشودھرا۔ ابھی ذہن و عقل، ادراک کی اندھیری خلاؤں میں بھٹک رہے ہیں۔ نور کی کوئی کرن جب بھی ان تاریک افکار میں اُترے گی تو شاید کوئی راہ کوئی صراطِ مستقیم کو جاتی راہ نظر آ جائے۔ اوہ۔ ہاں آج تو جشنِ بہار ہے۔ چلو چلتے ہیں۔

"کیا ایسے ہی"؟۔

"ایسے؟۔ اوہ نہیں۔ ہاں تم نے کونسا لباس پسند کیا ہے، ہمارے لئے؟۔ یہ شاید"۔

"جی۔ یہی پوشاک آج کے دن آپ پر خوب بجے گی"۔

مہاراج شدودھن، شاکیہ خاندان کے عظیم سربراہ، آریائی سلطنت کے شاہِ بلند نام، کشور کشائی جن کا مقدر۔ خسرو جاہ و جلال۔ صاحب جاہ حشم کا دربار۔ ہزار ہا افراد کا ہجوم۔ گردنیں خم، نگاہیں فرشِ راہ کئے تختِ سلطنت پر عظمت و شان سے تمکن شدودھن کو نذرانے پیش کرتے ہوئے گویا اپنی وفاداری کا اعتراف جتاتے۔ اپنی مملوکیت کی تجدید کرتے یہ نا سمجھ لوگ۔ ایک اور صرف ایک شخص کی یہ حکمرانی۔ ہزاروں ذہنوں، دماغوں، عقلوں اور صلاحیتوں کی غاصب نہیں ہے؟۔ اور یہ اس شخص کے پہلو میں زرق برق لباسوں میں ملبوس چہرے پر غرور کا مکھوٹا لگائے بیٹھی مہارانی مہامایا۔ بے شک اُسکی کوکھ نے مجھے دنیا سے روشناس کرایا۔ بے شک اسکی لوریوں نے مجھے قلب کا سکون دیا۔ بے شک اسکی گود نے مجھے زندگی کی منزلوں پر قدم بڑھانے کا حوصلہ بخشا۔ بے شک اسکے پیروں کے نیچے جنت ہے مگر یہ ایک عورت بھی ہے اور اِس ایک شخص کی ہر اچھائی اور برائی میں برابر کی شریک بھی۔

سدھارتھ کی سوچ و فکر کا سلسلہ یہاں بھی برقرار ہے۔ سارا دربار۔ سارا راج اپراساد، پراساد کی دیواروں سے پھوٹتے خوشیوں اور زندہ دلی کے سوتے۔ مسکراتے ہنستے اور قہقہے لبوں پر اٹھاتے چہرے، آج سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور وہ رنگ ہے جشنِ بہار کی امنگ اور ولولوں کا رنگ۔ صحیح بھی ہے۔ سال میں ایک بار یہ رنگ اُبھرتا ہے اور صحت و توانائی کی تازگی ہر چہرے پر، شگفتگی ہر دل میں اور حیات بخش لحات کی خوشبوئیں ہر جسم پر سجاتا چلا آتا ہے۔ ساری سلطنت، سلطنت کے محلات، محلے، گلیاں، کھیت کھلیان ہر وہ جگہ جہاں نفس ذرا سا بھی جاگتا ہے، اسے محسوس کئے بغیر انجان نہیں رہ پاتا!

یکا یک غلغلہ ہوا اور سدھارتھ سوچ کے دائرے سے نکل آئے۔ اُنہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ رقص و سرور کی محفل آراستہ ہو چکی ہے۔ طائفہ جشنِ بہار کی مناسبت سے مخصوص پیراہن زیب تن کئے دربار ہال میں پھیل چکا ہے مگر اس پھیلاؤ میں بھی ایک ترتیب ہے۔ مرد اور عورتیں، ان کے سازندے، دربار کا فرش تنگ ضرور ہے مگر ان کے رقص کے لئے ناکافی نہیں ہے سدھارتھ نے ایک طائرانہ نظر ڈالی، مہاراج، مہارانی، یشودھرا اور دربار میں موجود ہر ذی روح اس طلسماتی رقصِ بہاراں میں منہمک ہے۔

رقص و سرور کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ اور حیرت انگیز کمالات کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ مدرا میں ڈوبی رات جشنِ بہار کو زندگی اور تازگی کا احساس دلاتی گزرتی رہی۔ کرتبوں اور جادوئی کرشموں سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں رُکتی سنبھلتی رہیں۔ ہر بیش کش انوکھی۔ ہر کارنامہ ہنر مند مگر سدھارتھ، وہ تو اِن فسوں کار لحات، اس نغمہ بہ دوش رات اور خوشبوؤں کی پازیب کھنکاتی حیات سے شرابور جشن سے لاتعلق ہی رہے۔ کئی بار یشودھرا نے ان کی توجہ مبذول کرائی مگر سدھارتھ اپنے اندر پناہ گزیں آوازوں

سے نجات کیسے پا سکتے ہیں۔ جب بھی وہ کسی تالی پر تھرکتے جسم یا سحر طراز آواز یا کسی جادوئی کرتب کی جانب متوجہ ہوئے، اُن کی پرشوق توجہ کو پھر کسی شوریدہ خیال نے تازیانہ لگایا اور سدھارتھ پھر اپنی دنیا میں لوٹ آئے۔ بے شک موسیقی حرارت نفس کے لئے ایک الوہی احساس ہے۔ روحانی سکون دیتی ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کا بڑا ہی ہوشربا طریقہ ہے۔ موسیقی، مشرقی موسیقی رس، تال، راگ اور لَے سے مزین جسکی اساس عبادت پر رکھی گئی ہے۔ کئی رس مشرقی موسیقی میں شامل کئے گئے ہیں۔ ایک رس ہے، شانت رس۔ روح کا سکون۔ عبادت کی تکمیل کے لئے اس رس میں بندے کی عاجزی کا عنصر لازم ہے اور مجھے یہ رس بھاتا ہے مگر یہ دربار تو سیاسی تماشگاہ ہے۔ جو بھی آتا ہے۔ اپنے کرتب دکھاتا ہے۔ انعام واکرام حاصل کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ پھر اس تماشگاہ میں میرا مصرف؟ کیا میں بھی سیاسی بساط کا ایک مہرہ بھر ہوں؟ کل مجھے بھی یہی سب کچھ کرنا، دیکھنا اور انجام دینا ہے؟ مگر کیوں؟۔ میرے اندر چھپا بیٹھا کوئی مجھے یہ سب کرنے سے روکتا ہے منع کرتا ہے۔ میرا مقام بتاتا ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟۔ ابھی واضح نہیں۔ ابھی میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا۔ سب کچھ پوشیدہ ہے۔ گہری تاریکی میں ہے!

چوبیس گھنٹے کا شاید کوئی پہر تھا جب سدھارتھ نے یشودھرا کی تڑپ اور تکلیف کو محسوس کیا۔ شاید کوئی مرض لاحق ہو گیا اچانک۔ سدھارتھ نے سوچا۔ یشودھرا کا تڑپنا ان سے دیکھا نہیں گیا۔ انہیں بے پناہ ہمدردی کا احساس ہوا۔ کسی طرح وہ یشودھرا کی اس تکلیف کو دور کردیں مگر یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔ ہاں راج وید شاہی حکیم یشودھرا کے مرض کو سمجھ کر اسے اس تکلیف سے نجات دلا سکے۔ انہوں نے باندی کو پکار کر اُسے یشودھرا کے لئے شاہی حکیم کو لانے کی ہدایت کی۔ باندی حکم پا کر دوڑی گئی اور پھر پل بھر میں مہارانی مہامایا خود بہ نفس نفیس خوابگاہ میں آگئیں۔ سدھارتھ نے دیکھا، مہارانی کے چہرے پر تشویش کا نام ونشان نہیں ہے، بلکہ ان کا سارا وجود ایک انجان سی خوشی سے سرشار ہے۔ انہوں نے مسکرا کر سدھارتھ کے فکرمند چہرے کو دیکھا اور اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کہا۔ "فرزند! ہمیں اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ تم یہاں سے جاؤ۔ اس موقع پر تمہارا یہاں ہونا ٹھیک نہیں ہے"۔

"ہم سمجھتے ہیں۔ اُسے کوئی مرض نہیں ہے۔ ایک نئے وجود کی دنیا میں آمد کے لئے جدوجہد ہے"۔

"لیکن یشودھرا۔۔ ماں۔۔"

"جاؤ۔۔ باہر ٹھہرو"۔

سدھارتھ نے کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ باندیوں کے درمیان ایک تجربے کار بوڑھی عورت کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ پھر دو باندیاں گرم پانی کا تسلہ اٹھائے آئیں اور وہ بھی اندر چلی گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں اور بھی اشیاء تھیں۔!

اوہ۔ تو ایک نئی زندگی وجود پانے کو ہے۔ اُف! اس وجود کو حیات دینے کے لئے عورت کو کتنی تکلیفوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کن کن مراحل کو طے کر کے ایک عورت ماں کا درجہ پاتی ہے۔ تبھی تو اسکی تکمیل ہوتی ہے۔ ماں بن کر ہی تو عورت مکمل ہوتی ہے۔

رات گزرتی رہی اور سدھارتھ ایکانت میں جا کے لیٹ گئے۔ کب نیند نے انہیں سلا دیا، پتہ ہی نہ چلا!

کتنے ہی مناظر میں انسان خود کو اجاگر کرتا آرہا ہے۔ ہر منظر دوسرے منظر سے الگ مگر وجود سے ہم آہنگ۔ یہ منظر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ نئے وجود کی آمد نے تشنالبی کو اجالے کی داستان، آواز کو خوشبو اور بہاروں کو گیتوں کا جمال بخش دیا ہے۔

درودیوار گنگنا اٹھے ہیں۔ باندیاں دوڑتی، اتراتی اپنی بخششیں بٹورنے راج پراساد میں نیگ سے جھولیاں بھر رہی ہیں۔ صرف راج پراساد ہی کیوں ساری سلطنت سیاسی تماشہ گاہی سے آنکھیں چرا کر خوشیوں کے جھولوں میں مگن جھول رہی ہے۔ ایک عجیب سرشاری ایک عجیب مستی، ایک عجیب فریفتگی کا عالم طاری ہے ساری شاکیہ سلطنت پر!

سدھارتھ نئے وجود کو نہارتے رہے۔ یہ معصوم چہرہ، روشن آنکھیں، کومل سا بدن، کشادہ پیشانی پر نرم نرم سیاہ بالوں کی لٹیں، ابھرے سُرخی مائل رخسار، اپنے ہی پیٹ میں چھپائے رکھا تھا یشودھرا نے اسے اب تک؟ مگر یہ ننھا سا جسم! یشودھرا انہیں ایک تک دیکھ رہی ہیں۔ یہی تو ان کے وہ شوہر ہیں جنھوں نے انہیں ماں کا لافانی مقام عطا کیا ہے!

یشودھرا نے بے اختیار ہی دروازے کی جانب دیکھا۔ مہارانی مہامایا اندر داخل ہو رہی ہیں۔

"مہارانی آرہی ہیں"۔ یشودھرا کے کہنے پر سدھارتھ نے چونک کر دیکھا۔ مہامایا اور ان کے عقب میں مہاراجہ شدودھن چند وزیروں کے ہمراہ خوابگاہ میں آگئے۔ ان کے پیچھے باندیاں سرپوش سے ڈھکے خوان اٹھائے ہوئے ہیں۔

سلطنت کرنا آسان ہے۔ خود کو مہاراجہ تسلیم کرانا بھی آسان ہے۔ مگر سلطنت کے مسائل کیا ہوتے ہیں یہ ایک مہاراجہ ہی جان سکتا ہے۔ دور اندیش، ماہر، سیاسی چالوں سے واقف، تخت پر ہو تو ملک اور قوم کو قابو میں رکھنے کا، پُر سطوت حکمراں، میدانِ کارزار میں ہو تو دشمنوں کو زیر کرنے والا بہادر سپہ سالار، عدالت میں ہو تو حق و انصاف کو ثبات دینے والا عادل۔ محل میں ہو تو غلاموں اور خانہ زادوں کے لئے پُر تکریم آقا۔ دربار میں ہو تو جاہ و جلال کا پیکر۔ آنکھوں میں دور اندیشی۔ فیصلوں میں اپنی عظمت تسلیم کرانے کا حوصلہ۔ گھر میں ہو تو ایک مشفق مہربان باپ اور قابلِ قدر شوہر۔! ایک شخص اپنے اندر کتنی شخصیتیں پوشیدہ رکھتا ہے۔

سدھارتھ نے دیکھا۔ شدودھن اس وقت صرف ایک باپ تھے۔ مشفق مہربان۔ وہ اپنی ساری شخصیتیں کہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔! سدھارتھ نے آگے بڑھ کر دونوں کو تعظیم دی۔

"قدمبوسی قبول فرمائیں"۔

"جیتے رہو۔ اقبال بلند ہو"۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے دعائیں دیں۔ اشارہ پا کر باندیاں قریب آگئیں۔ مہارانی نے اپنے پوتے کا صدقہ اتارا اور ہیرے، جواہرات سے لبریز خوانوں کو غریبوں اور مسکینوں میں بانٹنے کا حکم صادر کر دیا۔

چلو میرے بیٹے کی وجہ سے بہت سے ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ خوشی اور طمانیت کی رمق سدھارتھ کے مساموں سے پھوٹ نکلی!

"سدھارتھ۔ بیٹے تم باپ بن گئے ہو۔ ایک پھول سے بیٹے کے باپ"۔ ماں نے بیٹے سے کہا۔

"مبارکباد۔ مبارکباد"۔ ساتھ آئے وزیروں نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

"اُف! یقین ہی نہیں آتا۔ کل ہی کی تو بات لگتی ہے۔ تم میری گود میں ہمکتے تھے۔ پھر تم نے ہی میری انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اور آج مہارانی کا انگ انگ مسرت سے مہک اُٹھا ہے۔

شدودھن کے لبوں پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ ہے۔

"بھئی ہمیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک کر لو مہامایا"۔

"آپ ہی۔ آپ ہی تو اس خوشی کے محور ہیں مہاراج"۔

"مگر اب سدھارتھ اس شادمانی کا محور ہے مہامایا۔ سدھارتھ اور یشودھرا"۔

"کتنی عجیب مسرت ہوتی ہے بیٹے کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی۔ سچ"۔ مہامایا کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ دوہری خوشی۔ پوتا پانے کی خوشی اور خاندان کو آگے بڑھانے اور اپنا نام روشن کرنے کی خوشی!

مگر یہ خوشی مجھے کیوں نہیں؟ کیوں نہیں میں ان کی طرح سوچتا؟ کیوں نہیں میں اور اُن کی مانند دل میں بے اختیار رانہ جذبہ محسوس کرتا؟

"سدھارتھ۔ بیٹے کھو گئے کہیں؟" ماں نے بیٹے کے خیالات پر پیار بھری ضرب لگادی۔

"اپنے دائرے سے نکلو۔ آج کا دن کتنا مبارک دن ہے۔ اداسی تم پر، ایک باپ پر اچھی نہیں لگتی۔

"ہاں بیٹے۔ سنجیدگی کے بھنور سے نکلو اور سب کی خوشی میں شامل ہو جاؤ"۔ باپ نے بھی انہیں سرزنش کی اور پوتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مہارانی بھی اور وزیر بھی صرف اُن کے بیٹے کو دیکھنے میں مگن ہیں اور سدھارتھ پھر اکیلے۔ پھر تنہا!

"پھر ایک چراغ روشن ہوا۔ کل کا دیپک۔ سلطنت، شاکیہ ونش کا میرے بعد جائز وارث۔ اس چراغ سے کیا اندھیرے دور ہوسکیں گے؟ ہونہہ۔ وہ خود نہیں جانتا اسکے اندر کتنے اندھیرے پوشیدہ ہیں۔ کون سمجھے؟۔ کون جانے؟ ایک نیا اور ننھا وجود سب کو خوشیاں بانٹ رہا ہے، یہ نئی زندگی بھی ایک دن چلتے چلتے تھک جائے گی۔ اسکا وجود شل ہو جائے گا۔ ابتدا کی اٹھان۔ اٹھان کے بعد تکان اور پھر جسم کا زوال اور اس زوال کے بعد؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ سارا کھیل جسم اور روح کا ہے۔ جب تک روح جسم کے اندر ہے تب تک دنیا کی رنگینیاں، آدمی کی شوخیاں، اسکی ہار جیت، زمین سے پرواز کرتی آسمان کو چھو لینے کی خواہش اُسے کسی ایک محور پر ٹھہرنے نہیں دیتی اور جب جولانی پر تھکن غالب آجاتی ہے تو جسم بھی کسی ایک جگہ رک جاتا ہے۔ آگے بڑھنے کی طاقت صرف آنکھوں کی بصارت تک ٹھہر جاتی ہے اور پھر یہ بصارت بھی دھندلی ہو کر ہر منظر کھو دیتی ہے۔ وہ رشتوں کو قایم رکھنا چاہتا ہے مگر وہ رشتے اسکی پہنچ سے دور ہوتے جاتے ہیں اور پھر روح، اس کا بے مطلب، بیکار جسم کو چھوڑ کر دور خلاؤں میں گم ہو جاتی ہے۔ جسم بے جان ہو کر رہ جاتا ہے اور ہم اس بے مصرف جسم کو زمین کے اندر گاڑ دیتے ہیں یا آگ میں جلا کر اسکی راکھ پانی میں بہا دیتے ہیں۔ کیا یہی ہے انسان کا عروج جو اُسے زوال دے کر بے نشان کر دیتا ہے۔

"راج کنور۔ ہم نے تمہیں خوش خبری دی ہے۔ ایسی خبر جسے ہر باپ اور خاندان کا ہر فرد سننے کو بے قرار رہتا ہے اور ایک تم ہو؟ تمہارے چہرے پر نہ مسکراہٹ آئی ہے نہ آنکھوں میں چمک جاگی ہے"۔ مہامایا نے ان کے رویے سے زچ ہو کر شکایت کی۔ "کیا تمہیں خوشی نہیں ہے؟"۔

"نہیں ماں۔ میں خوش ہوں"۔

"بھئی راج کنور نئے نئے باپ بنے ہیں۔ اسلئے جھینپ رہے ہیں"۔ شدودھن نے بیٹے کو سہارا دیا۔

"تمہیں یاد ہے مہامایا؟۔ جب سدھارتھ کی پیدائش ہوئی تھی تو ہم بھی اس طرح جھینپ جایا کرتے تھے"۔ بیوی نے شوہر کو کچھ شوخی، کچھ شوق سے دیکھا۔

"زندگی کی ہر راحت تمہیں نصیب ہو بیٹے"۔ شدودھن نے فرطِ انبساط سے سدھارتھ کو سینے سے لگا لیا۔ "آج ہم بہت خوش ہیں۔ بہت ہی خوش" ان کی آنکھیں ایک انوکھے جذبے سے چمک اُٹھیں ہیں۔

"خوش ہیں آپ؟"۔

"کیوں بھلا۔ یہ خوشی کا موقع ہی تو ہے۔" مہاراج نے انہیں اپنے سینے سے الگ کر کے ان کے چہرے کو دیکھا۔ "آہ۔ آج کا دن سلطنت، شاکیہ خاندان کے لئے انتہائی مبارک دن ہے۔ ہر چہرہ مسکرا رہا ہے۔ ساری سلطنت، سلطنت کا ہر شخص، ادنیٰ اعلیٰ ہمیں مبارکباد دے رہا ہے۔ صحیح معنوں میں تو آج جشن کا دن ہے"۔

شدودھن ایک عظیم سمراٹ، مقدرات کا مالک، آج کس طرح ایک نوعمر کھلنڈرے لڑکے کی طرح اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہے؟۔ سدھارتھ نے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"جانتے ہو راج کنور؟ بیٹے یا بیٹے کے بیٹے کی پیدائش کتنی مسرتوں کا باعث بنتی ہے؟ اسی لئے تو بیٹے کو کل دیپک کہا جاتا ہے۔ وہ خاندان کا نیو ہوتا ہے"۔

"نیو یعنی بنیاد مگر کیوں؟"۔

"اسلئے کہ وہ خاندان کی عمارت کو بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ استحکام دیتا ہے۔ اس کی ساکھ کو قایم رکھتا ہے۔ باپ اور پھر باپ اور سارے خاندان کے شجرے کا سایہ دار درخت ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے سارے گلستان کا روشن اور تابندہ پھول کہا جاتا ہے"۔

"مگر پھول کی عمر تو مختصر ہوتی ہے مہاراج۔ اُسے ثبات کہاں؟"۔ سدھارتھ نے آہستہ سے کہا اور مہاراج اپنی ہی دی ہوئی مثال کے جال میں پھنس گئے۔ انہوں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔ شاید بیٹے نے یہ بات از راہِ مذاق کہی ہو مگر وہاں تو ہمیشہ کی طرح سنجیدگی کی گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ وہ بیوی کی جانب متوجہ ہو گئے!

"مہامایا۔ تمہارا بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟ تم بتا سکتی ہو"۔

"میں خود اسکے اوٹ پٹانگ ترکوں سے پریشان ہوں مہاراج"۔ مہارانی افسردہ ہو گئیں۔

"بیٹے کیوں خود کو ان فضول فکروں میں الجھائے رکھتے ہو۔؟"

"میں کیا کروں ماں۔ دنیا ایک کتاب کی طرح میری آنکھوں کے آگے کھلی رہتی ہے۔ اس میں مضمر زندگی کی سچائیاں مجھے کسی اور سمت جانے نہیں دیتیں۔" سدھارتھ نے بے بسی سے جواب دیا۔

"سچائی یہ ہے کہ تم آرین نسل کے سپوت ہو۔ سچائی یہ ہے کہ تم کپلا وستو جیسی عظیم الشان سلطنت کے ہونے والے سمراٹ ہو۔ سچائی یہ بھی ہے کہ اس سلطنت میں سانس لیتا ہر شخص شاکیہ خاندان کے شہزادے، راج کنور سدھارتھ کے آگے اپنے سر جھکا کر تعظیم دینے کا منتظر ہے۔" شدودھن کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ باپ سے پھر سمراٹ کی طرف لوٹ گئے۔ "مہامایا۔ آپ ہی اسے سمجھائیے"۔

"آپ مطمئن رہیں۔ اسے سمجھانے اور راہِ راست پر لانے والا آ گیا ہے"۔ مہامایا نے نوزائیدہ بچے کی طرف مہاراج کی توجہ مبذول کرائی۔ مہاراج کے چہرے سے لحہ بھر پہلے جو مسکراہٹ مفقود ہو گئی تھی، لوٹ آئی!

"پدرِ محترم"۔ مگر سدھارتھ مجبور ہیں کہ خود سے کیسے اور سچائی سے کس طرح برگشتہ ہو جائیں۔

"آج میرے قویٰ مضبوط ہیں۔ میرے چہرے پر تیج ہے۔ میری آنکھوں کی بصارت میں چمک ہے اور میرا جسم مشقت برداشت کرنے کا متحمل ہے مگر جب یہ بازو شل ہو جائیں گے؟ بدن کی ساری حرارت، ساری طمانیت ختم ہو جائے گی؟۔

تب؟"۔

"تب کچھ نہیں۔قدرت کے اصول ہیں۔ جو شئے بھیجی گئی ہے دنیا میں اُسے اپنے وقت پر واپس جانا ہے"۔شدودھن ذرا بھی ہراساں نہیں ہیں۔"پھر چاہے وہ بادشاہ ہو، ولی ہو یا کوئی فقیر"۔

"آپ کا کہنا بھی صحیح ہے۔ چلئے آپ کو پوتا دے کر میں اپنے فرض سے سبکدوش تو ہوا"۔ سدھارتھ نے بحث کو طول نہیں دیا۔

"بے شک"۔شدودھن نے سمجھا بیٹا ان کی بات سے مطمئن ہو گیا۔"ارے ہاں مہامایا۔تم نے بتایا نہیں؟ ہمیں اپنے پوتے کا نام کرن کرنا ہے۔راج پنڈتوں نے اس کا زائچہ تیار کر لیا ہے۔راج پراساد میں ہون کا انتظام ہے۔ایسا نہ ہو مہورت بیت جائے"

"سدھارتھ، فرزند! تم تیار ہو کر آجاؤ۔ہم چلتے ہیں۔" مہامایا نے پوتے کی پیشانی چومی، یشودھرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور خوابگاہ سے سب چلے گئے۔

سدھارتھ نے خالی دروازے کی جانب دیکھا۔ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ آئی۔انہوں نے دیکھا، باندیاں ان کے بیٹے کی تیاری میں منہمک ہیں۔ کچھ باندیاں یشودھرا کو ہون میں لے جانے کے لئے اُسے مخصوص لباس پہنانے اور بناؤ سنگھار کرنے میں مصروف ہیں۔

خوابگاہ میں چراغ روشن ہے۔تیل کی کڑوی بو اور اسکی لو سے اٹھتا ہوا دھنواں ایک عجیب اور غیر رومانی ماحول اجاگر کر رہا ہے۔یشودھرا بیٹے کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹی ہے۔بیٹا یشودھرا کے پیٹ پر بیٹھا کلکاریاں کر رہا ہے۔کبھی اسکے چہرے پر اپنے ہاتھوں سے لکیریں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی ڈھیر ساری رال یشودھرا پر ٹپکا دیتا ہے۔ایک سرزنش ابھرتی ہے لیکن اس سرزنش میں بھی ممتا اور ماں کا دلار صاف جھلکتا ہے۔دروازہ کھلتا ہے اور سدھارتھ اندر آتے ہیں۔

"کون؟۔اوہ۔آپ۔"

"یہاں اور کون آسکتا ہے میرے سوا؟"۔

"جی۔میں سمجھی کوئی داسی ہے۔آیئے"۔یشودھرا نے بیٹے کو سنبھالا اور اپنے شوہر کے لئے جگہ بنائی!

"سلطنت کے کام بڑے ہی دکھ دائی ہوتے ہیں۔نہ جانے مہاراج یہ سب کیسے کر لیتے ہیں"۔

"آپ بھی کر لیں گے، جب یہ سب آپ کو کرنا ہوگا۔اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا؟ دیکھئے تو کیسے ہمک رہا ہے آپ کے لئے؟"۔

سدھارتھ نے بیٹے کو دیکھا۔آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ہاتھوں نے بے اختیار اپنی آغوش میں سمیٹنے کے لئے حرکت کی اور بیٹا باپ کی چھاتی سے آلگا۔آہ۔کیا یہی وہ انجانا احساس وہ بے پناہ اور سرشار جذبہ ہے جو باپ کی دھڑکنوں میں کہیں چھپا بیٹھا رہتا ہے۔یہ میرا اپنا خون ہے۔میرے بدن کا ایک انگ۔یہ میرا مستقبل ہے مگر۔میرا مستقبل؟

انہوں نے ہلکے سے بیٹے کے گالوں کو چوما اور اسے یشودھرا کی گود میں دیدیا۔

"راج پنڈتوں نے کتنا اچھا نام دیا ہے ہمارے بیٹے کو"۔یشودھرا نے بیٹے کو چوم کر کہا۔

"کونسا نام؟"۔وہ بیٹے کا نام ہی بھول گئے۔دراصل وہ رشتوں کے ہر بندھن سے خود کو دور کرنے کی کوشش میں ہیں۔

"راہل۔آپ یہ بھی بھول گئے"۔راہل کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں تو یشودھرا نے اسے لٹا دیا

"اوہ ہاں۔ راہل۔ بہت اچھا نام ہے۔ یشودھرا، سارا بدن تکان سے چور ہے"۔

"تو آیئے۔ سو جایئے"۔

"اب سونا کیسا"۔

یشودھرا کھلے دریچے سے باہر دیکھتی ہیں جہاں صرف اندھیرا ہے۔

"صبح کے آثار تو ابھی نمودار نہیں ہوئے"۔ یشودھرا کے لہجے میں حیرت ہے۔

"سو کر زندگی کے نہ جانے کتنے پل چھن دبے پاؤں مجھ سے دور ہو گئے۔ اب تو آنکھیں نیند کی راحت تیاگ چکی ہیں۔ جاگتے رہنے اور جاگ کر اس جہاں کو پہچاننے کا وقت آگیا ہے"۔

"وقت کی چنتا کیوں کرتے ہیں۔ وقت تو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ جب دیکھا وہی وقت ہے۔ ہاں جو بیت گیا وہ ماضی اور جو آیا نہیں اُسے مستقبل مان لیا"۔ یشودھرا نے شوہر کے چہرے کو اپنی جانب موڑنا چاہا۔

"راہل سو گیا کیا؟"۔ انہوں نے وقت کے اس نازک پل سے خود کو بچانے کا سہارا لیا۔

"ہاں سو گیا"۔ بیوی سے یشودھرا ذرا میں ماں بن گئیں۔

"بچپن میں سدھ بدھ کچھ نہیں ہوتی یشودھرا"۔ وہ بستر سے اُتر آئے۔ "کب جاگے کب سوئے سوئے تو کیوں؟۔ جاگے تو کیوں؟۔ اس کا احساس تو وقت ہی اپنے تجربے سے کراتا ہے"۔

"آپ ہی کا خون ہے۔ دیکھئے تو کتنی کشش ہے اسکے چہرے پر؟"۔

"کاش یہ کشش دیرپا ہو۔ یشودھرا، ایک بات پوچھنا ہے تم سے"۔

"کیا اس طرح؟۔ دور سے؟۔ کھڑے رہ کر پوچھیں گے؟۔ میرے نزدیک نہیں آئیں گے؟"۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"۔

"آپ نے پوچھا ہی کہاں؟۔ کہئے"۔

"تم خوش تو ہو نا؟"۔

"کس حیثیت سے؟۔ آپ کی زندگی میں شریک ہو کر راہل کی ماں بن کر یا اس سلطنت کے ولیعہد اور ہونے والے سمراٹ کی مہارانی ہو کر؟۔ کونسی حیثیت سے؟"۔ "تو سنئے۔ میں آپ کا ہی ایک انگ ہوں"۔ یشودھرا نے سنجیدگی سے کہا مگر اس سنجیدگی میں مرمٹنے اور قربان ہو جانے والی بیوی کا پیار حرف حرف سے بول رہا ہے۔ "میرے خیالات، میرے جذبات، میری نیند، میرے دن رات پر آپ کا قبضہ ہے۔ ایک بیوی ہو کر میں خوش ہوں۔ ساتوں جنم میرے ساکار ہو گئے۔ ماں بننے سے پہلے ہر عورت ادھوری رہتی ہے، اولاد ہی اسے مکمل کرتی ہے۔ لیکن ماں کا درجہ ہر درجے سے بلند اور عظیم ہے۔ اہم بھی اور اطمینان بخش بھی مگر یہ کیسے سوال آپ کے ذہن میں آئے؟"۔ وہ سدھارتھ کے قریب آگئیں!

"میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ تم مطمئن ہو یا نہیں"۔

"تو کیا سمجھا آپ نے؟"۔ یشودھرا نے شوخی سے پوچھا۔

"تمہارے چہرے کی لالی، آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر کھلتا تبسم بتا رہا ہے کہ تم راہل اور اس سلطنت کو پا کر بہت خوش ہو"۔ سدھارتھ کی نگاہیں یشودھرا کے سراپے پر مرکوز ہو گئیں۔ اُن کی دراز پلکوں کے نیچے مسکراتی خوابناک آنکھوں میں ایک

عجیب سی ٹھنڈک پیدا ہوگئی۔ایک اُداس سی ٹھنڈک جسکی تہہ میں سب کچھ بے چین ہو!

''صرف راہل کو پاکر۔آپ کو پاکر نہیں؟''۔

''میں تو ایک شخص ہوں۔لہو اور مانس پیشیوں کے ملاپ سے میری نشو ونما ہوئی ہے۔خون کی گردش تھمتے ہی جسم کا کوئی مول کوئی پہچان باقی نہیں رہتی۔پھر اسکی طلب کیوں؟''۔

''یہ۔یہ آپ کیسی باتیں کرر ہے ہیں؟''۔بیوی شوہر کی گفتگو سے تھرا اٹھی۔۔وہ وحشت زدہ ہوکر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''۔

''میں ٹھیک ہوں''۔یشودھرا کی سانس ان کے چہرے سے ٹکرائی تو وہ کئی قدم آگے بڑھ گئے۔

''یشودھرا۔کبھی ہم کسی خاص شئے کو پاکر بھی خوش نصیب نہیں ہوتے''۔

''میں تو آپ کو پاکر خوش نصیب بھی ہوں اور بے حد مطمئن بھی''۔یشودھرا کی وحشت کم ہوگئی۔

''اچھا تم بتا سکتی ہو؟۔جسم اور روح میں کیا فرق ہے؟''۔

''دونوں ایک دوسرے کی اہم ضرورت ہیں۔روح کے بنا جسم کچھ نہیں۔اسکی شادابی روح سے قایم رہتی ہے اور روح کی پہچان کے لئے جسم کا تخلیقی وجود لازم ہے۔ہاں جسم فانی ہے،روح فانی نہیں۔

''تو جو سچ ہے اُسے پانے کا جتن تو کرنا چاہئے آدمی کو؟''۔

''بالکل''۔

''بس۔تم نے مجھے مطمئن کردیا یشودھرا،اب مجھے کوئی خوف نہیں۔بڑا بوجھ لئے جانا تھا پر اب نہیں''۔سدھارتھ نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ان کے منہ سے اطمینان بخش سانس خارج ہوگئی۔

''خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہوں''۔

''کیا آپ کسی سفر پر جارہے ہیں؟''۔

''ہاں۔بہت لمبا سفر ہے''۔ایک آہ نکلی۔لہجہ معنیٰ خیز ہے۔

''کوئی دشمن؟''۔

''آدمی اپنے اندر کتنے ہی دشمنوں کو پالتا ہے۔کرودھ،نفرت،ظلم،درندگی،عداوت،بے رحمی۔خود قاتل بھی بنتا ہے اور خود ہی مقتول بھی ہوتا ہے۔خود ہی منصف ہے اور خود ہی مجرم بھی۔کبھی جانور سے بدتر کبھی فرشتوں سے افضل۔یہ دشمن اسے روشنیوں کا ہی سفیر بننے سے روکتے رہتے ہیں۔امن اور خوشبو سے دور کرتے رہتے ہیں''۔

''لیکن آریہ کمار۔دنیا تو ایک ضابطے کے تحت قایم ہے۔اندھیرا نہ ہوگا تو روشنی کیا معنیٰ؟ لغزش نہ ہوگی تو خالق کی برتری کا احساس کیسے کرےگا آدمی۔یہ تو نظام ہے اور آدمی نظام کے تانے بانے میں بھی زندہ رہ سکتا ہے''۔

''کیا تم بھیڑئے کو بیل کی جگہ باندھ سکتی ہو؟۔راہل کی بجائے کسی دوسرے کی اولاد کو اپنی ممتا دے سکتی ہو؟نہیں کیونکہ راہل تمہارے وجود کا حصہ ہے۔اسکی تخلیق تم سے ہوئی ہے۔اسی طرح جسم کی چہار دیواری روح کا مسکن ہے۔اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم جسم کو زیادہ اہم سمجھیں یا روح کو؟''۔فکر انگیز لہجے میں تلخی بھی ہے اور ترک بھی!

''میں آپ سے بحث نہیں کرسکتی''۔یشودھرا نے آخر کار ہتھیار ڈالدیئے۔وہ تو یشودھرا کے حسن،جوانی اور اس جوانی

میں تڑپتی بجلیوں سے بے بہرہ ہیں۔ آنکھوں کے بلاوے، ہونٹوں کی کم پن، ہاتھوں کی طلب اور کھلی دعوتِ آلنگن دیتے اشتہا انگیز خطوط بھی سدھارتھ کو اس ڈھلتی رات کے پرسکون سناٹوں میں یشودھرا کے قریب لانے سے محروم رہے۔ نفس کہاں جا چھپا، اسکی تشریح سدھارتھ کے لئے ممکن نہیں!

"تم سو جاؤ۔ اپنے بیٹے کے نزدیک۔ اُسے تمہاری قربت چاہیے"۔

"ہاں مجھے تو نیند آرہی ہے"۔ اپنوں کی بے توجہی کے آگے بے بس ہو جانا، یشودھرا نے آج ہی جانا۔ آج ہی اُنہیں اس بات کا تجربہ ہوا کہ نبرد آزمائی میں سندھیاں کیسے کی جاتی ہیں؟

"میں بہت تھک گئی ہوں"۔

"یقیناً تمہیں سو جانا چاہیے۔ نیند جسم کی تھکن کا بہترین علاج ہے"۔ ان کی نظریں یشودھرا کی جانب نہیں ہیں۔

"اور آپ۔ آپ نہیں سوئیں گے؟"۔ یشودھرا نے آخری کوشش کی۔

"بہت سولیا۔ اب نہیں"۔ انہوں نے زیرِ لب کہا۔ یشودھرا نے کچھ سنا کچھ نہیں اور کروٹ بدل کر بستر پر لیٹ گئیں!

"خود جاگوں گا تب ہی تو اوروں کو جگا سکوں گا"۔

رات دبے پاؤں گزرتی رہی۔ چراغ کی لو سے اٹھتا دھواں خوابگاہ میں اسی طرح چکراتا رہا۔ سدھارتھ سوچوں میں کھوئے کسی مجسمہ کی مانند کھڑے رہے۔ پھر ان کے سراپے میں جنبش ہوئی۔ انہوں نے سوئی ہوئی یشودھرا کو دیکھا۔ راہل کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ معصوم سا سکون۔ معصوم سی کشش راہل کے چہرے پر کھلی ہوئی ہے۔ بے اختیار سینے سے لگانے کو دل چاہا۔ انایاس ہاتھ آگے بڑھے مگر عزم نے روک لیا۔

ایک الوداعی نظر دونوں پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ دروازہ آہستگی سے بند کیا۔ راہداری سونی ہے۔ دور پہریداروں کی موجودگی سناٹوں کو مرتعش کر رہی ہے۔ انہوں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ راہداری کے موڑ سے اچانک کوئی سامنے آگیا۔ سدھارتھ چونکے نہیں، انہیں پہلے ہی سے علم ہے۔ یہ چھندک ہے۔ اُن کا با اعتماد خدمت گار جو سدھارتھ کے کسی بھی حکم کسی بھی فیصلے سے انحراف کرنا گناہ سمجھتا ہے۔ اس کا ایمان ہے، مالک جو کہیں، جیسا کہیں اس پر عمل کرنا ہی نجات پا جانا ہے۔ سدھارتھ نے چھندک کو دیکھا اور سرگوشی میں پوچھا۔

"سب انتظام ہے؟"۔

"جی مالک"۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔

"جی مالک"۔

"مالک نہیں آج سے تم میرے ساتھی ہو اور میں آج سے تم جیسا ہوا"۔

"جی ما۔۔۔۔۔۔جی ساتھی"۔

"تو آؤ۔۔۔"

اور اندھیروں نے اُن کے وجود کو نگل لیا۔ اس عظیم الشان سلطنت کو علم بھی نہ ہو سکا کہ کب اس کا مستقبل اُسے بے توازن کر گیا اور کب گیان کا سورج زمانے کی روایات کے اُفق سے اُبھر کر دنیا کو نجات کا درس دے گیا!

ابھی اجالوں نے سحر کی نور برساتی جبیں پر بوسہ نہیں دیا تھا۔ رات کی زمیاں اندھیرے کے تنفس سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔ ستاروں کا طلسم وقت کی آنکھوں میں خوابناکی گھول رہا تھا۔ سب کچھ بے منظر تھا۔ فضا میں خنکی کی ریشمی سرسراہٹ جسموں کے مساموں کو چھو کر موسم کے شبنمی سکون کا احساس دلا رہی تھی کہ سدھارتھ ندی کے کنارے آ رکے۔ رات بھر سفر کی تکان کے آثار اُن کے چہرے سے ہویدا ہیں لیکن آنکھیں کسی شے کی متلاشی ہیں۔ چھندک بہت زیادہ تھکا ماندہ ہے مگر اپنی تھکن کا اظہار کر کے سدھارتھ سے اپنی وفاداری اور جاں نثاری پر کوئی تبصرہ کرانا اسے پسند نہیں ہے۔

سدھارتھ لمحات کے منتظر ہیں اور پھر شاید انہوں نے انتظار کی سحر خیز کیفیت میں بے رنگ تاریکیوں کے بدن سے جنبشوں کا اظہار دیکھ لیا اور ان کے ہونٹوں پر طمانیت آ گئی۔!

"چھندک دیکھو۔ اُجالا ہو رہا ہے۔ دیکھو، جو شے اندھیرے میں تھی اب کس طرح واضح ہوتی جا رہی ہے"۔

"جی مالک"۔ وہی رٹا رٹایا جملہ اُسے یاد ہے۔

"کیا تم اپنے اندر نیا پن محسوس کر رہے ہو چھندک؟"۔ یہ کیسا سوال کیا مالک نے؟

"کیا نیا پن۔؟"

"تازگی، شگفتگی سے بھرپور۔ ذہن کے دریچے کو کھولتا اور تازہ ہوا کے اندر آنے کا احساس ساتھی چھندک"۔

"میں تو ایک ہی بات محسوس کر رہا ہوں مالک"۔ بے ربط گفتگو ضرور ہے لیکن اس بے ربط گفتگو میں جو اسرار پوشیدہ ہیں چھندک کا کند اور غلام ذہن ان کے معنی پانے سے قاصر ہے۔ "اور وہ ہے تھکن۔ رات بھر پیدل سفر کرتے رہنے کی تھکن۔ سارا بدن مانو پھوڑا بن چکا ہے"۔

اُنہوں نے تھکے ہارے چھندک کو رحم اور ہمدردی سے دیکھا۔

"تم چھندک ہو میرے ساتھی۔ آریائی حکومت کے ملازم۔ ایک غلام ذہن کے مالک۔ تمہاری سوچ محدود ہے۔ خدمت اور صرف خدمت۔ اسکے آگے تم جا ہی نہیں سکتے میرے ساتھی"۔

"یہ آپ نے سچ کہا مالک"۔ وہ پھر بھول گیا کہ اب وہ سدھارتھ کا ساتھی ہے، غلام نہیں۔

جماہی لیکر اس نے کہا۔ "کب، کہاں اور کیسے ایک غلام اپنے آقا کو خوش کر سکے یہی ہمیں وراثت میں ملتا ہے مالک"۔

"اپنے خول کو تیاگو ساتھی۔ غلام سے انسان بن کر دیکھو۔ تب تمہیں زندگی کا مفہوم اور اس کائنات کے اسرار سمجھ میں آئیں گے"۔

"آپ کہیں تو اس ندی میں نہا لوں؟"۔

"ہاں ——ضرور۔"

چھندک نے دیر نہیں کی۔ دھوتی اُتار کر زیر جامے میں وہ ندی میں اُتر گیا۔ ٹھنڈے اور فرحت بخش پانی سے وہ اپنے جسم کی تکان دور کرتا رہا اور سدھارتھ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سورج کی کرنوں کو درختوں کی چوٹیوں سے اُتر کر زمین پر بکھرتے دیکھتے رہے۔

"جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، تب ہی سے یہ کھیل جاری ہے۔ سورج اوگتا ہے۔ روشنی سے تمازت، تمازت سے حرارت اور حرارت سے حرکت۔ پھر آہستہ آہستہ ساری توانائی سمیٹ کر تاریکیاں اوڑھے پھر کہیں گم ہو جاتا ہے۔ حرارت

بھی، حرکت بھی، تمازت بھی سب کچھ مفقود ہو جاتی ہے۔ اندھیرے ہر شے پر غالب آجاتے ہیں۔ پھر اندھیرے بھی مشتعل ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی بطن سے اُجالوں کو جنم دیتے ہیں۔ آہ۔ کائنات اور آدمی کی پہچان اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟۔ پھر میں دوسروں سے خود کو کیوں الگ محسوس کرتا ہوں؟"۔

سدھارتھ ابھی نامانوس ہیں۔ وہ داخلی کیفیات سے، خارجی مظاہر کے توسط سے اپنے ذہن کی تفہیم سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ بیتاب ہیں کہ افکار کی بے قراریاں ان پر کونسا راز منکشف کریں گی۔

"ارے دنیا کے خالق۔ اے ارض وسما کو بنانے والے تُو کن آسنوں پر متمکن ہے؟۔ میں یہاں خلاؤں میں بھٹک رہا ہوں۔ مجھے کوئی دشا سُجھا۔ یہ کیسی وڈمنا ہے، آنکھ نم ہوتی ہے، آنسو گرتا نہیں۔ یہ کیسا ٹھہراؤ ہے، نسوں میں جمی برف پگھلتی ہے، وجود سرد ہوتا نہیں، کانٹا انگلی میں چبھتا ہے، انگلی درد محسوس نہیں کرتی۔ مجھے بازیافت کر میرے رہنما۔ مجھے روشنی دے۔ ایسی روشنی جو میں دوسروں میں بانٹ سکوں۔ ایسا اجالا بخش جو معصوم، کند اور شخل ذہنوں کو اپنی حقیقی پہچان کرا دے۔"

چھندک نہا کر دھوتی پہنے کب پاس آکھڑا ہوا سدھارتھ کو علم نہیں ہے۔ چھندک اُن کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے اوب گیا تو پوچھ ہی بیٹھا۔

"مالک! یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟۔ یہاں تو ہم دو جن کے سوا اور کوئی نہیں ہے؟"۔ "وہ جو ہے۔ اُسے تمہاری آنکھیں دیکھنے سے معذور اور تمہاری سمجھ پہچاننے سے مجبور ہے۔ اچھا چھندک! یہ تو بتاؤ، کپلا وستو کی سلطنت یہاں تک ہی ہے نا؟"۔

"ہاں مالک! یہ ندی کپلا وستو کی سلطنت کی ایک سرحد ہی ہے۔ اِس کے اس پار نئی دھرتی ہے۔ نئے اور انجان باسی ہیں۔ نیا راج ہے اور سب کچھ الگ الگ سا ہے"۔

"گویا اس کنارے سے اگر چند قدم بھی میں آگے بڑھ جاؤں تو میں بھی آریہ خاندان کا شاہزادہ اور کپلا وستو کا ولی عہد نہیں رہوں گا؟"۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں مالک۔ آپ راج کنور ہیں اور راج کنور ہی رہیں گے۔ ہاں آپ کسی کو اپنا آپ نہ بتائیں تب آپ اجنبی اور انجان رہیں گے"۔

"یہ تم نے ٹھیک سوجھایا"۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رشتوں کا شہر بہت پیچھے چھوٹ چکا ہے۔

"دیکھئے اب سورج بہت اوپر آچکا ہے۔ ہمیں واپس چلنا چاہئے مالک۔ کپلا وستو پاس نہیں ہے۔ نزدیک کی بستی سے گھوڑے لئے بھی تو پہونچتے پہونچتے سانجھ ہو جائے گی"۔

"ہاں۔ سانجھ تو ہونا ہی ہے"۔

"آپ نے کھانے کا سامان بھی نہیں لینے دیا"۔ چھندک کو بھوک ستانے لگی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔" یہ جنگل بھی ادھ بھت ہے۔ نہ پھل ہیں نہ کوئی اور چیز جس سے پیٹ کی اگنی بجھے"۔

"کیا کھانے اور صرف کھانے تک تمہاری سوچ کا دائرہ سمٹا ہوا ہے؟"۔

"کھائے بنا آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے مالک؟۔ آپ ہی کہیں تو۔ میری مانئے تو اب واپس چلئے۔ مہاراج پریشان ہوں گے۔ نہ پہونچے تو ہماری تلاش شروع ہو جائے گی"۔ چھندک نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مہارانی اور سارا

پراساد چتا میں ہوگا"۔

"فکر تو اب مجھے کرنا ہے۔ایک نئے سفر کی۔اس سفر کے کھوج کی"۔

"کیسا سفر مالک؟"۔اس نئی افتاد سے وہ گھبرا گیا۔کیا پھر کوئی اور سفر؟۔

"اور آگے جانے کی سوچ رہے ہیں؟"۔

"ہاں چھندک۔آگے اور آگے اور بہت آگے"۔

"پر کیوں؟ نہ سواری ہے نہ اثاثہ۔نہ کوئی سنگ ہے نہ ساتھی"۔

"ساتھی ہے چھندک۔میرا یہ وجود۔اثاثہ بھی ہے۔اس جسم کے اندر میری روح"۔

"یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں مالک۔میں تو سمجھ ہی نہیں پا رہا ہوں"۔

"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے چھندک۔تم لوٹ جاؤ"۔

"کیا اکیلا؟"۔

"اکیلا تو مجھے جانا ہے۔لو۔یہ شاہی لباس۔مجھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔یہ آبھوشن۔یہ کڑے اور یہ پاپوش بھی"۔

سدھارتھ اپنے بدن سے لباس اور زیورات اُتار کر چھندک کو دیتے ہیں۔چھندک انہیں تھامے ہکا بکا دیکھ رہا ہے۔کیا مالک کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے؟ مگر نہیں۔اُن کے چہرے پر تو کچھ اور ہی دکھائی دے رہا ہے۔ایک عزم جس میں تیج ہے، چمک ہے۔اعتماد ہے اور بے حد نرم، بصیرت افروز عمل کی تقدیس ہے۔سارا وجود اسطرح جگمگا اٹھا ہے کہ نگاہ خیرہ ہوتی ہے۔ چھندک نے خوف سے نظر جھکا لی اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ۔آپ ایسا۔کیوں۔کیوں کر رہے ہیں مالک؟"۔نظریں جھکائے اس نے پوچھا۔سدھارتھ کے اس عمل نے اُسے سحر زدہ کر دیا ہے۔اسکی جھکی ہوئی آنکھوں میں نمی آگئی ہے۔

"آپ کو کس کی کھوج ہے مالک؟"۔

"خود کو کھوجنا چاہتا ہوں چھندک"۔وہ خلاؤں میں بھٹکنے لگے۔"کیوں جنم لیا میں نے اس دھرتی پر؟۔کیا اسلئے کہ اس جسم کو بیماری یا عمر کا گزرتا وقت دیمک بن کر کھوکھلا کر دے۔بوڑھاپا آئے اور میں موت کے بستر پر جا لیٹوں؟ نہیں چھندک آدمی صرف اسلئے دنیا میں نہیں آیا کہ وہ عمر کے تین موسم گزارے اور فنا ہو جائے؟ آدمی کا مصرف راجہ بن کر راج کرنا یا رعایا بن کر ظلم کی چکی میں پستے رہنا نہیں ہے۔کچھ اور مصرف بھی ہے اور مجھے اسی چیز کی تلاش ہے"۔

"تو کیا آپ واپس نہیں چلیں گے؟"۔

"نہیں۔اب یہ ممکن نہیں"۔چھندک نے ان کے لہجے میں صبر، تحمل، استقلال اور توازن محسوس کیا۔"میں رشتوں کی شناخت بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔اپنے ماں باپ جو میرے جنم کا باعث بنے۔یشودھرا جو بیوی بن کر میری زندگی میں آئی اور ہم دونوں کے باہم اور فطری ملاپ سے راہل نے دنیا میں وجود پایا۔ابتدا۔عروج اور پھر زوال۔اُس زوال کے آنے سے پہلے میں خود کو ڈھونڈ لینا چاہتا ہوں"۔

"آپ ساتھ نہ ہوئے تو مہاراج اور مہارانی سے کیا کہوں گا؟۔یشودھرا دیوی، ان کا حق تو اب آپ پر سب سے زیادہ ہے۔انہوں نے آپ کو میرے ساتھ نہ دیکھا تو۔۔کیا آپ چاہتے ہیں مالک، وہ ساری عمر آپ کی راہ دیکھتی رہیں؟۔

آپ کا بیٹا جس نے ابھی باپ کا اسپرش بھی نہیں جانا اُسے تیاگنا چاہتے ہیں آپ؟۔ کیا قصور ہے اُن سب کا؟"۔

"قصور میری آنکھوں کا ہے، جنہوں نے اِس کائنات کو پہچاننے کی غلطی کرلی۔ کاش! ایسا نہ ہوا ہوتا تو آج میں تمہیں اکیلے لوٹ جانے کو نہ کہتا"۔

سدھارتھ نے چھندک کے بازو پر اپنا رکھ کر کہا۔" اب تم لوٹ جاؤ چھندک۔ میں سب سے مُکت ہو کر اپنی مسافرت پر جا رہا ہوں"۔

"اپنا فیصلہ بدل دیجئے مالک۔ میرے آقا"۔ چھندک روتا ہوا ان کے قدموں میں جھک گیا۔

"اُٹھو چھندک۔ میرے ساتھی"۔ انہوں نے چھندک کو بازوؤں سے تھام کر اُٹھایا۔

"اب نہ میں تمہارا آقا ہوں اور نہ کوئی راج کنور۔ میں سدھارتھ ہوں۔ صرف سدھارتھ تمہاری طرح ایک معمولی آدمی"۔

"خود کو مجھا دئی سے نہ تولیں مالک۔ آپ کپلا وستو کے بھاوی سمراٹ ہیں"۔

"مجھے کچھ یاد نہ دلاؤ چھندک۔ میں نردھن ہوں۔ چھندک"۔ چھندک کی آنکھوں سے آنسو نہیں رُک رہے ہیں۔ اسکا دل کٹا جا رہا ہے۔ یہ کیسے امتحان میں ڈالدیا میرے پربھو۔۔اُف!

"چھندک۔۔ دیکھو اب میرے بدن پر نہ کوئی آبھوشن ہے نہ کوئی پوشاک۔ دیکھو، میں تو اب ایک بھکشک ہوں ۔۔فقیر۔۔ میرے ساتھی"۔ آنسوؤں کے دبیز پردوں میں سے چھندک نے دیکھا۔ اپنے مالک کا ہیولا سا جن کے دو خالی ہاتھ اسکی طرف پھیلے ہوئے ہیں

"کیا تم مجھے پہلی خیرات دو گے چھندک؟"۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میری ساری عمر آپ کی جھوٹن بٹورتے گزری ہے اور میں آپ کو خیرات۔۔۔۔؟"۔

"ہاں چھندک یہ احسان کردو مجھ پر"

"مالک۔۔ یہ زندگی آپ کی ہی دی ہوئی ہے۔۔ چاہے تو لے لیں"۔

"نہیں۔۔ زندگی نہیں میرے دوست۔۔ صرف تمہاری یہ سادا پوشاک دیدو"۔

"یہ۔۔ چادر۔۔ مگر کس لئے؟"۔

"اپنے بدن کو ہر راحت سے محروم کردینا چاہتا ہوں دوست۔ کیا تم یہ خیرات نہیں دو گے؟"۔

"ایسا نہ کہیں۔۔ میرا سب کچھ آپ کا ہے۔۔ لیجئے"۔

چھندک نے اپنے جسم کی اوپری چادر اتار کر سدھارتھ کو دیدی۔ سدھارتھ کے چہرے پر پُرسکون تبسم آگیا۔ انہوں نے چادر کو اپنے بدن کے گرد لپیٹ لیا۔

"بس یہ چادر بہت ہے۔ اب ایک کام اور کردو میرے عزیز"۔

"وہ کیا مالک؟"۔ اسکی آواز فرطِ غم سے گھٹ گئی۔ آنکھیں پھر چھلچھلا اٹھیں۔

"ندی سے پانی لا کر میرے بال تراش دو"۔

"یہ مجھ سے نہ ہوگا مالک"۔

"ہوگا چھندک۔۔ تمہیں سے ہوگا۔۔ پہلی خیرات میں نے تم ہی سے مانگی ہے اور تم نے اپنی یہ چادر دے کر مجھے

اپنے عمل کی طرف پہلا قدم بڑھانے کا حوصلہ دیا۔اب جاؤ۔پانی لے آؤ"۔

چھندک کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔وہ سدھارتھ کو دیکھتا ہے اور پاس کے درخت سے چند بڑے پتے توڑ کر ان کا دونا بناتا ہے اور اس دونے میں پانی بھر کر سدھارتھ کے پاس آتا ہے۔آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔چہرہ دھواں ہے۔اس درمیان سدھارتھ ایک بڑے پتھر کو اسے نوکیلا اور دھاردار بنا چکے ہیں۔

"یہ پتھر لو اور پانی سے بھگو کر میرے بال تراش دو"۔

دونا احتیاط سے نیچے رکھ کر پتھر لیتا ہے۔کیا مجبوری ہے۔کبھی اُسے یہ ناخوشگوار فرض بھی انجام دینا ہوگا، سچ ہے کسی کا اعتماد پانا بھی کتنا بھیانک ہوتا ہے، یہ چھندک نے آج ہی سمجھا ہے۔

چھندک نے پانی سے بال بھگو دیئے ہیں۔سدھارتھ اس طرح لیٹ گئے کہ ایک چوڑی اور مسطح چٹان پر ان کے لانبے بال اور ملایم سیاہ بال بکھرے ہوئے ہیں۔چھندک انہیں کمال مہارت سے پتھر کی دھار سے تراشتا جارہا ہے۔۔یہاں تک کہ وہ چھوٹے چھوٹے ہوگئے!

"بس اب تمہارا کام پورا ہوگیا"۔سدھارتھ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔چھندک نے ان کے بالوں کو سمیٹ لیا ہے۔!

"مجھے لوٹ جانے کو نہ کہیں مالک۔میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔آپ کے بنا میں کس کام کا؟"۔

"تمہیں جانا ہوگا چھندک۔اِس بھٹکن کے تم ایک ہی تو دوست ہو۔پہلے اور آخری۔میری التجا مان لو۔۔لوٹ جاؤ"۔

"پر میں واپس جاکے کیا کہوں گا؟"۔آواز رندھ گئی ہے چھندک کی۔"کیا آپ کبھی نہیں لوٹیں گے؟"۔

"لوٹوں گا مگر اُس وقت جب مجھے نجات کی راہ مل جائے گی۔واپس آؤں گا جب مجھے نروان حاصل ہوجائے گا۔جاؤ میرے ساتھی لوٹ جاؤ۔۔الوداع میرے دوست"۔

سدھارتھ معمولی چادر سے اپنا تن ڈھانپے ننگے پیر ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھ جاتے ہیں۔کچھ دور جاکر وہ پانی میں اُترتے ہیں۔چھندک ان کے تراشے ہوئے بال مٹھی میں دبائے اور ان کے پاپوش سر پر رکھے روتا بلکتا انہیں جاتا دیکھ رہا ہے۔سدھارتھ پانی کی گہرائی میں ہیں اور پانی ان کی کمر سے اوپر تک آگیا ہے لیکن وہ آگے بڑھتے جارہے ہیں۔اچانک اسے کچھ دکھائی دیتا ہے۔وہ آنکھوں سے آنسو پونچھ کو غور سے دیکھتا ہے۔نہیں یہ اس کا وہم یا آنکھوں کا دھوکہ نہیں ہے۔روشنی کا ایک ہالہ سدھارتھ کو اپنے جلو میں لئے سفر کررہا ہے۔دھیرے دھیرے پانی اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔نور کا ہالہ اب بھی اُن کے ہمراہ ہے۔چھندک اپنے قدموں پر گر کر دوزانو ہوگیا ہے اور پھر اس نے دیکھا، سدھارتھ، اسکے مالک جنھوں نے اس ادنیٰ کو اپنا ساتھی مانا اور خیرات میں اسکی چادر مانگی، انجان زمین پر اپنے قدم رکھ چکے ہیں۔!

چھندک نے تمام سامان سنبھالا اور واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

☆☆☆

اُجالوں کے صحیفے

آخرش اس نے اپنے ہر جذبے سے مکتی حاصل کر ہی لی۔ ہر اس جذبے سے جو انسانی نشو ونما، تعمیر و توسیع اور جسمانی قائمی و ترویج کے لئے قدرت نے شاملِ اجزاء کیا ہے۔ ان سب جذبوں سے مکتی پا کر اس کا وجود صرف وجود بن کر رہ گیا ہے۔ جسم پر کھال ہے، سینہ ہے، جس میں دل ہے اور اس کی دھڑکن ہے۔ رگیں ہیں جن میں خون کی روانی اسے حرکت دیئے ہوئے ہے۔ دماغ ہے، جس میں سوچ کی لہریں تو اٹھتی ہیں مگر ادراک سے خالی۔ ایک گہرا کنواں ہے، جس سے سانسیں اوپر آتی ہیں اور اس کے سانسوں سے خارج ہو کر دنیا کو اس کے زندہ ہونے کا پتہ دیتی رہتی ہیں۔ چہرہ ہے اور اس پر دو آنکھیں متحرک ہر اس شی کو دیکھنے پر قادر ہیں جو اس کے زاویۂ نگاہ میں رہتی ہے۔ ہاتھ اور پاؤں جو حرکت نہ کریں تو پیٹ میں اٹھتی بھوک کیسے شانت ہوا۔

ایک طرح سے وہ بہت خوش ہے کہ اب اس میں ایسا کچھ نہیں رہا جس کے رہتے اسے اپنے وجود کو کئی حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ ہے اس کی وہ دنیا ہے، جس میں صرف وہ آباد ہے۔ چند رشتے ضرور بندھے ہیں اس کے بے حس وجود سے، چہروں، جسموں، آوازوں، قہقہوں، ہنسیوں، مسکراہٹوں، سنجیدہ غیر سنجیدہ باتوں، طنزیہ و مزاحیہ جملوں، غم آزار حادثوں کو وہ دیکھتا اور سنتا ضرور ہے مگر سماعت اور احساس بیگانہ ہی رہتے ہیں۔ بسوں اور فٹ پاتھوں پر سفر اور پیدل مسافت میں اس کا جسم کتنے ہی جسموں سے ٹکراتا ہے۔ الجھتا ہے، کبھی کسی دھکے سے گر بھی جاتا ہے اٹھ کر پھر چلنے لگتا ہے مگر کوئی جذبہ، منفی یا مثبت اسے آمادۂ پیکار نہیں کرتا، سونے جاگنے، کھانے پینے اور حاجت روائی کے دوران بھی کوئی خواہش سر نہیں اٹھاتی۔ آگے بڑھنے، ترقی حاصل کرنے یا تنزل کی جانب قدم رکھنے میں بھی اس کی رُچی نہیں رہی۔

ایک دن اس کے پڑوس میں غمی ہوگئی۔ شاید کوئی مر گیا تھا۔ سارا محلہ ماتم کدہ بن گیا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ لوگ لواحقین سے اظہارِ افسوس کر رہے تھے اور وہ خاموش، بے جان بت کی مانند اپنے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر جنازہ اٹھا۔ لوگ جنازے کو لے کر اس طرح چلے کہ صرف قدموں کی سرسراہٹیں فضا میں ابھر رہی تھیں۔ نماز جنازہ ہوئی۔ وہ بھی دوسروں کی طرح صف میں شامل ہو گیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد جنازہ قبرستان لے جایا گیا اور مردے کو قبر میں اتار کر مٹی ڈال دی گئی۔ اس نے بھی رسم نباہ دی۔ سب کچھ دیکھتے، سمجھتے اور جانتے ہوئے بھی وہ بے گانہ اور انجان ہی رہا۔ غم اور الم کی جذباتی کیفیتوں سے وہ اپنے وجود کو پہلے ہی خالی کر چکا تھا۔

یہ سب کچھ پہلے نہیں تھا۔ وہ بھی دنیادار تھا۔ رسموں اور رواجوں اور رشتوں کے درمیان اس کے وجود کی نشو ونما ہوئی تھی۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو خاندان میں جیسے اچانک ہی بہت ساری زندگی جاگ اٹھی تھی۔ چونکہ برسوں بعد اس کی ماں نے ایک بیٹے کو اپنی کوکھ سے پیدا کیا تھا۔ ورنہ اس سے قبل لڑکیاں ہی پیدا ہوتی رہی تھیں اور ماں باپ اپنی پیٹھ پر ناقابل برداشت بوجھ ڈھوتے رہے تھے۔ حرفِ شکایت ادا بھی ہوا تو آسمان پر نگاہ اُٹھ گئی۔ اندر سے ایک آہ نکلی اور لب ساکت ہو گئے۔

گھر جو چہار دیواری سے بنتا ہے اس میں صرف گارا مٹی ریت، سیمنٹ اور کانکریٹ ہی صرف نہیں ہوتی، رشتوں کا تقدس، جذبوں کی دھوپ چھاؤں، انسانوں کا باہمی اشتراک، رابطوں کی جگمگاتی نغمہ بار آوازیں اور ان آوازوں سے گونجتی، بنتی، ٹھہرتی اور مدغم ہوتی تاثرات کی فضا، ایک شبنمی ہوا، ایک راحت کی پر سکون شام، چند اندھیروں میں سانس لیتے مدھم

اجالے، باورچی خانے میں کھنکتے برتن، چارپائیوں پر بچھی سفید چادریں اور ان پر فرصتوں میں بکھرتے جسم، دالان اور صحن میں معصوم کلکاریوں کی چھنکتی پازیبیں، بچپن، الھڑ موسموں کو چھوتا جوانی کا بہار آفریں چمن، ڈھلتی عمروں کے تجربے، کچھ سختیاں، کچھ نظر اندازیاں، کچھ روک ٹوک اور بہت سا پیار، بہت سی ممتا بہت سے دودھ کی طہارت، سنوارنے سجانے میں تعاون دیتی ہیں تب ایک مکان گھر بن پاتا ہے۔

اس کے ابا ایک دفتر میں کلرک تھے۔ دو میل جانا اور دو میل آنا ان کا معمول تھا۔ یہ معمول تو ہر اس آدمی کا مقدر ہے جس نے اپنے رشتوں کی ذمہ داریوں کے جذبے کو اپنا معمول بنا رکھا ہو۔ اماں گھر سنبھالتیں موقع بہ موقع بچے پیدا کرتیں۔ ان کو پالتیں، پرورش کرتیں۔ ابا جو کچھ کما کر لاتے اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ اس میں صبر و شکر سے اماں وقت گزار دیتیں۔ بیٹے کی امید میں بیٹیوں نے قطار باندھ کر ابا اور اماں کو لام بندھ کر دیا۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ جس نے انسان کی بے کسی اور بے چارگی پر اپنا بے اصولی جذبہ تھوپ رکھا ہوتا ہے۔ اماں بیٹیوں کی بڑھتی ربڑ کی طرح کھینچتی اور گھر کی منڈیر کو چھوتی عمروں سے دہلتی رہتیں۔ جب تک اماں ابا دو جان تھے تب بھی انہیں جوانی خدمت کا معاوضہ ملتا تھا اس میں گزر بسر کر لیتے تھے۔ معاوضہ میں اضافہ تو نہیں ہوا۔ کیونکہ دفتر خدمت لینے میں فیاض تھا۔ معاوضہ دینے میں فیاض نہیں تھا۔ فیاض اگر کوئی تھا تو وہ خالق جس نے جو کچھ دیا انتہائی فیاضی سے دیا۔ ایک بدن سے کتنے ہی بدنوں کو گھر کی گنگناتی فضاؤں میں اس طرح پھینک دیا کہ ساری فضا حبس سے بوجھل ہوگئی۔ در و دیوار روغن سے محروم ہوگئے۔ درد ہجراں کا فریب شام ہجراں کی داستاں بن گیا تو اماں دن رات ہولناکیوں میں گھر گئیں اور ابا کے اعصاب وقت کی ستمگری سہتے سہتے زنگ آلود ہوتے چلے گئے۔ بیٹیاں آسیب بن کر اعصاب پر ایسی حاوی ہوئیں کہ گھر کی ساری نمی کو چاٹ چاٹ کر بنجر کرتی گئیں اور وہ رہ گئے جسموں کے کھوکھلے ستون۔

نہ جانے یہ جذبہ کہاں سے انسان کو ودیعت ہوا ہے کہ بیٹا سارے غموں کا علاج، ساری کلفتوں کا مداوا، ساری اذیتوں کا نجات دہندہ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں عمر کی وہ کونسی منزل تھی، نفس کا کونسا پڑاؤ تھا اماں اور ابا کا، جب وہ پیدا ہوگیا، جیسے اچانک ہی بادل گھر آئیں اور کھیتوں کی بے جان اور سونی مٹی میں دھان اُگ آئے۔ ابا کے زنگ آلود اعصاب اچانک حرکت میں آگئے اور اماں کے راکھ آلود چہرے پر خوشبو اور خوشی کی رونقیں آباد ہوگئیں۔ لیکن شاید یہی وہ لمحہ زندگی کا نقطہ عروج بھی تھا لڑکپن ابھی پوری طرح پنپا بھی نہیں تھا کہ پہلے اماں اور پھر ابا اس کے لڑکپن کو ظفر مند جذبوں سے رشتہ قائم کرنے کا جذبہ لئے سارے جذبوں سے بے نیاز ہو کر لحد میں جا سوئے۔

اس کے لڑکپن کے معصوم جذبوں نے بہنوں کی لمبی قطار کا کرب اپنے اندر جذب ہوتے دیکھا ایک عجیب جذبہ اس کے اندر رینگ اٹھا جو شگفتہ بھی تھا اور شگفتہ بھی نہیں تھا۔ کرب اور قرب کا ایک خود سر لمحہ تھا شاید جسے اس کے وجود کی صداقت سمجھنے اور پہچاننے سے منکر تھی مگر شاید کسی سرشار کیفیت نے اسے لطیف جذبوں کی گفتگو سے آشنا کر دیا اور اپنی ناتواں اور ناتراشیدہ جسمانی مشقتوں پر مصائب کے ذائقے اٹھائے اور پیروں میں فٹ پاتھ کی خراشیں چھپائے شام کے دھندلکوں میں گھر لوٹنے لگا۔ رات کی ردا اوڑھ کر سارے جذبے چپ ہو جاتے اور خاموش سناٹے میں نئی صبح کی چیخیں اور دھواں اگلتی کہانیوں کی سرگوشیاں کانوں سے اتر کر اس کے اعصاب کو تر کرتی رہتیں اور صبح پھر اس کے شکستہ جذبوں کو صیقل کرتی اور وہ پھر سنگسار ہونے نکل کھڑا ہوتا اور اس سنگساری سے جو چند کنکر اس کی گرفت میں آجاتے ان سے وہ اپنی بہنوں کے آنچل میں آبرو کے چند ستارے سجا دیتا۔

اس کے اعصاب کب مکمل ہوئے اور کب وہ جوانی کی عین تلملاتی دوپہری میں آٹھہرا، بھاگتے دوڑتے وقت اور

زندگی کی کڑی کسیلی ضروریات نے اس کی سوچ کا سارا رس چوس لیا تھا۔ اب تو وہ محض ایک شخص تھا جس کی شریانوں میں خون کی گردش تو تازہ تھی مگر اس کی روانی میں جوش نہیں تھا دل میں امنگوں کا خروش، عمر کی نبرد آزمائی اور زندہ رہنے کے جبر نے چھین لیا تھا شب گزرتی، دن اٹھتا تو ایک کل کی طرح وہ بھی زندگی کی حرارت اپنی رگوں میں سمیٹنے چل پڑتا۔

وہ دن اس کی زندگی کا انتہائی سنگین دن تھا۔ گھر لوٹا تو محلے والوں کی نظریں اسے اپنے اندر اترتی سی لگیں۔ وہ کچھ سمجھا نہیں، دہلیز کے اندر پیر رکھتے ہی اسے ایک بڑی کمی کا احساس ہوا اس کی ایک بہن نے اسے پانی کا گلاس تھما دیا۔ پانی سے منہ پر چند چھپاکے مار کر وہ دالان میں بچھے چھوٹے سے تخت پر آبیٹھا۔ ایک خاموشی جو بے زبانی سے بہت کچھ کہتی لگ رہی تھی لیکن وہ چاہتا تھا کوئی اسے خود کچھ بتائے کہ یہ گھر کہاں سے کم گیا؟ برداشت نے جب شدت اختیار کی اور اعصاب چٹخنے لگے تو وہ پوچھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟ تم سب چپ کیوں ہو؟"

خاموش مہر بہ لب چہرہ چہرہ تکتی ہوئی

"مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"وہ بھیا بڑی اور منجھلی دونوں بھاگ گئیں"

"کہاں کس کے ساتھ ہو"

"سبزی والے اور وہ نکڑ پہ جو قصائی ہے، اس کے ساتھ"

نہ جانے کیوں ایک عجیب سے سکون کی سانس اس کے لبوں سے خارج ہو گئی مگر جس میں اپنی کم مائیگی کا احساس اور غربت کی تیز آنچ کو جلانے کا حوصلہ ضرور تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ شاید غیرت سے یا شاید حمیت سے۔ یہ تو ہے، آدمی اپنے رشتوں کے لئے بہت حساس ہوتا ہے۔ چار دیواری کے اندر وہ رشتے کتنے ہی بوسیدہ کیوں نہ ہو جائیں، آدمی کی غیرت انہیں گلی میں نہیں پھینک دیتی۔ صرف سر جھکا دیتی ہے۔ وہ بھی غیرت کی ناتواں دیوار کی آڑ میں پوشیدہ ہو گیا۔ افلاس نے نظر اٹھانے ہی نہیں دی تھی کہ وہ دیکھ کر سمجھ پاتا کہ لڑکیاں جب جوانی کے پیش لفظ سے گزر جائیں تو ان کی کہانیاں بیان ہونے لگتی ہیں۔ باہر کی ہوس پرست نگاہوں کی آنچ سے بہت جلد اندر کی برف پگھلنے لگتی ہے اور پھر پانی کو جدھر بہاؤ ملتا ہے اپنی جگہ بناتا گزر جاتا ہے۔ یہ بھی اس کے لئے ایک تجربہ تھا۔ تلخ، کڑوا، کسیلا اور انتہائی پر شور۔

اس کی عمر کی کتاب کے اوراق پر لکھی تحریریں اسے مستقبل کے خواب دیکھنے پر اکساتی ضرور تھیں لیکن حال سب سے زہریلا ناگ ہوتا ہے جو ڈستا ہے تو سارے سنہرے خواب خودکشی کر لیتے ہیں۔ خالی پیٹ نہ عشق سوجھتا ہے اور نہ کوئی خواہش بھاتی ہے۔ بساطِ زندگانی پر سارے مہرے ایک ہی خانے کے ارد گرد اپنی پری کرما کرنے پر مجبور تھے۔ بچپن کے شریر لمحے اور جوانی کی بے خواب راتیں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کیسے کرتیں؟ اس کی جوانی تو قبروں میں دفن ہو چکی تھی۔ آبلہ پائی اس کا مقدر اور روح پر جسم کا بوجھ لہو کا زخمی نشان بن چکا تھا۔

محلے میں اب اس کی طرف جو بھی نگاہ اٹھتی اس میں ہمدردی کم سوال زیادہ ہوتے اور نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے اس کی بہنوں کی جوانیوں کو دیکھتی تھیں۔ ہوس ناک نظریں جو سفاک بھی تھیں اور ہولناک بھی مگر افلاس کا بھیڑیا اسے دوڑائے دوڑائے پھرتا، پلٹ کر دیکھنے اور ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ اور پھر شہر میں فساد پھوٹ نکلا، فساد ہونے کی وجہ بظاہر بہت حقیر ہوتی ہے مگر اس کے جلو میں چلتی پھیلتی حقارت ایک عفریت ہوتی ہے جو سب کچھ نگلتی جاتی ہے محبت، خلوص، پاکیزگی، بے چارگی،

تہذیب، روایت، دوستی سب کچھ۔ کچھ بچا رہتا ہے تو انسانیت کے کھنڈروں پر نوحہ کناں لاچارگی، گھروں میں جلتے شمشان اور دلوں میں گھر بناتیں قبریں۔

اس کا گھر بھی تباہ ہوا۔ شہوت کے سنگرام اور مہارانا ہوس کے یگیہ میں اس کی دو بہنوں کی عصمتوں کی آہوتی دے چکے تھے۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو حواس کانوں میں دھڑک رہے تھے۔ گھر میں اس کی بہنیں نہیں تھیں۔ ان کی عزت اور آبرو کی دھجیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ جسم برہنہ، تتر بتر اپنی خاموش داستان کا آخری پیراگراف سناتے لہولہو پڑے تھے۔ اس نے اور تلاش کیا تو بیت الخلاء میں اس کو کسی کی سسکیاں سنائی دیں اس کی سب سے کم سن بہن غلاظتوں میں دبکی ہوئی تھی۔ اس نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اپنے سینے میں چھپالیا۔ آنکھیں دہشت سے جھپکنا بھول گئیں تھیں اور جسم نقطہ انجماد کو چھو رہا تھا۔ تسلّی کے لفظ یا گریہ وزاری دم توڑ چکی تھی۔ شہر میں کرفیو لگا اور وہ لاشوں کے درمیان قید ہوکر رہ گیا۔ کب اور کیسے ان کی تدفین ہوئی، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

دو بہنیں تباہ ہوکر مٹی بن گئیں، وہ اچھی اور بامقدر تھیں جو گھر سے بھاگ گئیں تھیں۔ یہ بھاگ جانا لفظ بھی عجیب اور معنیٰ خیز ہے۔ گھوڑا بھاگ گیا۔ انسان اپنے اعمال سے کہاں تک بھاگے گا چاند سورج آج کے تیز گامی دور میں ایک سمت اوگ کر دوسری سمت کتنی تیزی سے بھاگتے ہیں آدمی اپنے روشن مستقبل کی تگ ودو کی جانب بھاگ رہا ہے لیکن یہ بھاگنا جب کسی بھاگیہ سے جڑتا ہے تو معنیٰ بدل جاتے ہیں۔ بہن بیٹی کا بھاگ جانا غیرت مند ماں باپ اور بھائی کے لئے جیون کی وناش لیلا ثابت ہوتا ہے۔

جب اس کی بہنیں بھاگی تھیں تو وہ رویا تھا۔ بزدل اور غیرت مند انسان صرف روتا ہے اس کا رونا بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کسی نگاہ نے چھپ کر دیکھا بھی ہو تو اس کے رونے سے اس نگاہ میں تاسف کی کوئی بوند نمودار نہیں ہوئی تھی۔ آنسو تو اس کی آنکھوں سے بھی نہیں چھلکے تھے جو ظاہر غم کو آشکارا کر پاتے۔ ایسا رونا تو عزتِ نفس کا وہ غرور مفقود ہے جہاں آدمی تباہ کار بن جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے پاس تو اس کی شخصی انا بھی مفقود تھی۔ وہ صرف رو سکتا تھا اس لئے اندر ہی اندر روتا رہا۔ تاریکی میں روتا رہا کہ تاریکی میں رونا اچھا ہی ہوتا ہے کہ آنسو ستارے جیسے ضیا پاش نہیں ہوتے کہ لودے اٹھیں۔

لیکن حادثہ تو ایسا تھا جس نے اس کی آنکھوں کو ساری نمی سے محروم کردیا تھا وہ روئے بھی تو کیوں کر؟ آنسو بہائے بھی تو کس پر؟ ہائے رے آدمی کی مجبوری جو بزدلی بن کر رشتوں کی بوسیدگی میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔

اب گھر میں صرف دو جانیں رہ گئیں تھیں اسے ملا کر۔ اس جان کی حفاظت اس کا فرض بھی تھا اور ذمے داری بھی، مگر کیسے؟ باہر نہ نکلے تو پیٹ کا بھکن کیسے پُر ہو؟ پیٹ تو وہ پاپی ہے جو خالی رہے تو جگ میں ڈھنڈورا پیٹ دے۔

اس دور میں عفت مآبی تو ایک مثال کی طرح خالی خالی لبوں پر آکے اپنا وجود درج کراجاتی ہے۔ اس دور میں نہ مریم پیدا ہوتی ہیں اور نہ سیتا۔ آج رام کے ہاتھ میں ترشول ہے اور شو کی جٹاؤں سے آتش فشاں ابلتا ہے۔ آج پانڈو دروپدی شیش محل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے پاپوش دروازے کے باہر نہیں اتارتے۔ وہ دروپدی کو سرِ عام اپنے ظرف کی مردانگی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ آج کی مریم اور سیتا کو محض تازہ گوشت مانا جاتا ہے۔ اس دنیا میں جہاں جوئے سٹے اور اقتدار کی بساط پر لوگ اپنا قومی وقار، اپنا وطنی غرور، اپنا خاندانی ظرف اور نسلوں نسلوں پناہ گزیں عزتوں کو ہار کر فخر کے آسنوں پر متمکن ہوتے ہیں کسی جوان جسم کو دیکھ کر آنکھوں میں بہن بیٹی کی حیا اور تقدس نہیں جاگتا، نظریں تلاش کرتی ہیں کہ اس جسم میں کہاں کتنا گداز ہے؟ کہاں کتنی کساوٹ ہے؟ یہ کہاں سے پکڑو کہ گرفت، لذتوں کی گرمی سے مساموں سے نفسانی خواہشات کی بھوک اگل

دے۔ وہ طوفان بپا کر دے، جس سے جسموں کے بندھ ٹوٹیں تو تہذیب، اقدار اور طہارت تہس نہس ہو جائیں۔

وہ تو اپنی روح کو لئے جسم کے قبرستان میں مجاوری کر رہا تھا۔ ایک ایسا مجاور جو صرف مجاور ہوتا ہے مجاز نہیں کہ معدے سے آگے کی کوئی بات سوچ سکے۔ اس کا طواف تو صرف معدے کے آس پاس کا طواف تھا جس میں عبادت کی گرمی نہیں ہوتی۔ تو صرف بھوک ہی ہوتی ہے۔ ایسی بھوک جس کا احساس ایک افلاس زدہ بھوکا ہی کر سکتا ہے۔

گھر تباہ ہو چکا تھا۔ کرفیو کھلنے کے بعد حالات پھر معمول پر آنے لگے تھے۔ پڑوس میں رہنے والے وہ چہرے، بہت جانے پہچانے تھے جنھوں نے اس کی بہنوں کی عصمت کے چمن ہی تاراج نہیں کئے، ان کو زندگیوں سے بھی محروم کر دیا تھا۔ ان چہروں پر درندگی اور خوفناک حد تک خودسری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ ان کے درمیان ایک چہرہ اور بھی تھا۔ معصوم سا۔ بھولا سا۔ خوبصورت اور نوخیز جوانی کی طرف بڑھتا ایک کامنی سا جسم۔ جسے جوان تو نہیں کہا جا سکتا تھا ہاں وہ جسم جوانی کی تمہید ضرور تھا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا، بہت سی ہمت اپنے اندر سمیٹی اور چاہا کہ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے مگر کوئی اسے اندر سے روک لیتا۔ شاید اس کی بزدلی یا شاید اس کے ماں باپ کا شریف خون۔

اس نے بہت غور کیا۔ محلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا مگر وہاں بھی یہ سب ہوا تو؟ گھر میں تالا لگانا چاہا مگر دیواریں چھلانگ بھر کی تھیں۔ وہ سوچ سوچ کر دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا اور جب فلاح کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو اس نے سارے جذبوں سے خود کو آزاد کر لینا ہی مناسب سمجھا اور پھر اس نے سارے جذبوں سے چھٹکارا پا ہی لیا۔ اب کوئی جذبہ نہ تو اس کی راہ کی رکاوٹ تھا اور نہ اس کی غیرت کو للکار سکتا تھا۔ بس ایک معمول تھا زندگی کا جو اسے زندہ رہنے پر آمادہ کئے ہوئے تھا۔ اس بیگانگی اور انجانے پن سے اسے کئی فائدے ہوئے۔ اس کا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ کوئی بوجھ کوئی وزن نہیں تھا اس کے اعصاب پر۔ کون کیا چاہتا ہے کیا سوچتا ہے کیا کرتا ہے اور دنیا کس روش پر گامزن ہے، اسے کسی سے کوئی مطلب نہیں رہا تھا۔ وہ اس حد تک اپنے جذبوں سے عاری ہو گیا کہ ہوائیں اگر اسے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دیتیں تو اسے احساس نہ ہوتا۔

وہ ایک مرجھائی اور السائی سی دوپہر تھی۔ گرم، حابس کوٹھری میں بچھی چارپائی کے کھرے بان پر اس نے اپنے جسم کو ڈالا ہوا تھا اور آنکھیں موندے خاموشی کو اوڑھے یونہی پڑا ہوا تھا۔ نیند، تکان، آرام اور کسلمندی، کوئی جذبہ یا احساس اس کے پاس نہ تھا بس اس کا جسم یونہی ادھر ادھر بکھرا سا لگتا تھا۔

وہ ہوا کا ایک جھونکا ہی تھا اس نے کوٹھری کا ایک چکر کاٹا، کچی شناسا دیواروں کو اپنے پروں سے اسپرش کیا اور چارپائی کی پٹی پر آ ٹکا۔ شاید تھک کر، کچھ ستانے۔ اس نے پٹی پر ہلکا سا دباؤ محسوس کیا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں پھر اسے لگا پٹی پر کسی نے پہلو بدلا ہو شاید۔ شاید ہوا نے شرارت کی ہو۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ ملگجے سے اندھیرے میں اسے ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ غبار میں لپٹا ایک ننھا سا وجود۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ کچھ لمحے اس نے ہیولے کو پوری طرح محسوس کرنے میں لگا دیئے اور جب یقین ہو گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تو ہر جذبے سے عاری ہے پھر یہ تجسس کیسا ہو مگر تجسس اس کی سوچ پر غالب آ گیا۔ ایک ننھا سا وجود اس پٹی پر ٹکا ہوا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرکشش اور معصوم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر چپکی ہوئی تھی۔ چہرہ نور کے ہالے میں گھرا ہوا سا، آنکھوں میں نرمی اور مقناطیسی کشش اوپری جسم پر صرف ایک سفید چادر جو آدھے جسم کو ڈھکتی ہوئی نیچے تک چلی گئی تھی۔ بال سنہرے اور پیشانی پر بکھرے ہوئے پیٹھ پر ایک ترکش اور ہاتھ میں ننھی سی کمان۔ وہ خالی نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا، جس میں تجسس کے ساتھ ایک عجیب تعجب خیز مرعوبیت بھی تھی۔ پھر صبر نہ ہوا تو پوچھ ہی لیا

"تم۔ کون ہو؟"

"تم بتاؤ، میں کون ہوں؟"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں"

"خود کو کتنا جانتے ہو؟"

"اپنے آپ کو جاننا ضروری تو نہیں ہے"

"اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ تم نے خود کو جاننا چھوڑ دیا ہے"

"ہاں۔ میں نے ہر جذبے سے نجات پالی ہے"

"جذبہ۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ کتنا سمجھتے ہو اسے؟"

"جذبے کے بغیر تو انسان نامکمل ہے"

"جیسے کہ تم"

"ہاں میں۔ ایک کھوکھلا ستون"

"پھر تو تمہیں مر جانا چاہئے تھا"

"وہی تو میرے بس میں نہیں ہے"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ لوگ خودکشی بھی تو کر لیتے ہیں"

"میں اس عمل سے لرز اٹھتا ہوں"

"تو پھر تم غلط ہو۔ سراسر غلط۔"

"وہ کیسے؟"

"موت کا خوف تم پر غالب ہے۔ یہ بھی تو ایک جذبہ ایک احساس ہے۔ اور پھر میں نے دیکھا، مجھے یہاں دیکھ کر تم میں تجسس پیدا ہوا۔ آنکھوں میں حیرت ابھری۔ مجھے جاننے کی خواہش بیدار ہوئی۔ یہ بھی تو جذبے ہیں۔"

"میں نے تو ان سب سے۔"

"نجات پائی تھی۔ نہیں نجات نہیں، فرار۔ خود کو فریب دے رہے ہو تم کہ ہر جذبہ تم نے اپنے اندر سے نکال پھینکا ہے ۔ یہ فرار ہے خود سے اور کچھ نہیں۔"

"مگر تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"میں وہی ہوں جنہیں تم نے اپنے اندر سے نکال پھینکا ہے۔ ایک احساس ہوں میں۔ تمہاری سوچ ہوں، فکر ہوں، ادراک ہوں، شعور ہوں اور ان سارے جذبوں کا مورت روپ ہوں۔"

"مورت روپ۔ تم۔ تم واپس کیوں آ گئے؟"

"میں گیا ہی کہاں تھا؟۔ تمہارے بدن میں ایک روح بستی ہے، جس سے تم حیات پاتے ہو، اس روح کو اپنے اندر سے نکال پھینکو، میں واپس نہیں آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ننھی سی کمان سیدھی کی اور اس میں تیر جوڑ کر اس کا نشانہ لے لیا۔ وہ خوف سے سٹ گیا۔ چاہا بھاگ جائے مگر بھاگنے کا احساس مفقود تھا، پھر یہ خوف کیسا؟ وہ چارپائی کے کونے میں سکڑ گیا۔ کمان سے تیر نکلا اور اس کے جسم میں

پیوست ہوگیا۔ اور پھر ترکش کے سارے تیر اس کے جسم میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس نے سمجھ لیا آج اس کا خاتمہ ہوگیا۔ آنکھیں بند تھیں، ہونٹ بھینچے ہوئے، چہرہ زرد اور خوف سے لرزتا ہوا بدن مگر کہیں کوئی تکلیف یا درد نہ تھا۔ ایک راحت کا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈی تمازت، ایک شبنمی حرارت اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ پھر ہوا میں تحلیل ہوا۔ کوٹھری کا چکر لگایا اور نگاہوں سے روپوش ہوگیا۔ اس کے اندر بہت سے جذبے بیدار ہونے لگے۔ ان سارے جذبوں میں عزم، حوصلہ، جینے کی خواہش، حالات سے نبرد آزمائی، جبر سے بغاوت اور ہمت کا جذبہ نمایاں تھا اور ان سب پر ایک اور جذبہ حاوی تھا۔ محبت کا جذبہ جس سے حریری قوت خارج ہو کر اپنی نقشی شعاعوں سے اس کے جسم پر لگے سارے رنگ کھرچتی جا رہی تھی اور جہاں جہاں سے زنگ الگ ہو رہا تھا وہاں سے شفق کی گل پوشی، صبح کی معراجی کیفیت لئے بیدار ہو رہی تھی جس سے بشریت کا جمال جھلک جھلک اٹھتا تھا۔

دوسری صبح بہت دلکش تھی۔ بہت عرصہ بعد اسے نیند کی راحت بخش ساعتیں میسر آئی تھیں، ایسے میں کسی نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کی بہن اسے جگا رہی تھی۔

"بھائی۔ بھائی اٹھو۔ دیکھو کون آیا ہے؟"

اس نے آنکھیں مل کر اپنی نیند کو بھگانے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خاصہ اجالا پھیل گیا تھا۔ اس نے دیکھا، اس کی بہن کے عقب میں وہی معصوم اور جوانی کی تمہید خوبصورت سی کامنی لڑکی کھڑی تھی۔

"بھائی۔ نیلا تمہارے لئے کچھ لائی ہے۔ کہتی ہے، یہ صرف تمہیں دے گی۔"

اس نے دیکھا، نیلا کے ہاتھوں پر ایک چھوٹی سی سینی تھی جس پر سرپوش تھا۔ اس نے کچھ نہ جانتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شاید نیلا نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ اس نے سینی اس کے آگے بڑھا دی۔

"رات کوئی آیا تھا میرے پاس۔ اس نے یہ سینی مجھے دے کر کہا، یہ تمہیں دے دوں۔ یہ تمہارے لئے ہے بھائی"

بھائی۔ اس نے غور سے نیلا کو دیکھا۔ یہ تو اس کی بہن کا پرتو سی ہے۔ اس نے سینی ہاتھ سے لے لی۔ سرپوش ہٹا کر دیکھا۔ سینی میں کچھ نہیں تھا۔ اس نے سوچا، کسی نے مذاق کیا ہے، اس نے سرپوش سینی پر ڈال دینا چاہا کہ اس کی نگاہوں نے محسوس کیا۔ نہیں سینی خالی نہیں ہے۔ بہت کچھ ہے اس میں۔ اس نے سینی کو اور قریب لا کر دیکھا۔ سینی میں بہت کچھ تھا جو صرف اسے ہی نظر آ سکتا تھا۔ اس میں خوشبو تھی، کچھ خواب تھے، چند نغمے تھے، تھوڑی سی خوشیاں تھیں، ہلکا سا درد تھا، اس درد کی تکلیف تھی، دکھ تھے، راحت کے پھول تھے، کچھ مرہم تھا، چند ستارے تھے، آسمان کا ایک ٹکڑا تھا۔ بادل کی نیلی اور سرمئی دھجی تھی موسموں کی چھوٹی چھوٹی تراشیں تھیں، کبوتر کا سفید ننھا سا پر تھا اور اس پر محبت، پیار اور اخوت کے نادیدہ پل رکھے ہوئے تھے۔

پہلی بار اس نے جانا کہ صدف جب اپنا منہ کھولتی ہے تو سمندر کا کڑوا کسیلا پانی کیوں اس کے اندر نہیں جاتا۔ ایک بوند کہاں سے آ کر اس کے اندر اپنا وجود موتی میں ڈھال لیتی ہے اور سمندر کے بے پناہ پانیوں میں یہ چھوٹی سی سیپ اپنی کائنات کا خود وسیلہ بن جاتی ہے۔

☆☆☆

انگڑائی

"ٹٹولتی انگلیاں جسم کے اندھیروں پر اُجالوں کی داستان کا لمس تلاش کر رہی ہیں تا کہ ان اونچائیوں تک پہنچ سکیں، جہاں خواہشات کے سورج نفس کی آگ میں جل کر پانی پانی ہو جاتے ہیں تپش کا احساس زندہ رہنے کی اُمنگ کھو جتا رہ جاتا ہے"۔

"بجیا۔ ہم نہیں سمجھ پائے اس عبارت کو" رخشی نے میگزین کو میز پر اچھال دیا۔ اور رخساروں کے نیچے تکیے کو داب کر اوندھی پڑ گئی۔ تکیے کی ملائم سطح پر اس کے رخسار ایسے لگ رہے تھے جیسے برف کی جلد پر کسی نے شنگرف کی چھینٹ دے دی ہو شلوار کے پائنچے اوپر تک کھسک گئے، وہ دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے موڑے ہلانے لگی، سڈول اور شفاف پنڈلیاں کچھ شرخیز موسموں کو تبدیلی کا احساس دلا رہی تھیں۔

بجیا نے ایک نظر رخشی کی طرف دیکھا اور لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

"اللہ بجیا ہمیں پہلے اس کا مطلب سمجھا دو اخبار بھاگا نہیں جا رہا۔ آرٹیکل بعد میں بھی تو پورا کر سکتی ہیں؟" رخشی نے تن تنا کر ضد کی۔

"تم خود کیوں نہیں نکالتیں مطلب" بجیا اپنی لکھی ہوئی عبارت پر قلم روکتی ہوئی بولیں۔

"ہمیں نہیں آتا" وہ بدستور ٹانگیں ہلاتی ہوئی بولی، الفاظ کی ادائیگی سے اس کے رخسار تکیے کی سطح سے اُبھر اُبھر جاتے، "سمجھ نہیں آتا کہ لوگ ایسی اوٹ پٹانگ زبان کیوں لکھتے ہیں؟ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے؟ سورج آگ میں جل کر پانی پا نی کیسے ہو سکتا ہے؟ کل ہی ہم نے حدیث پڑھی تھی، اللہ میاں تو کہتے ہیں سورج میں اتنی آگ ہے کہ وہ کسی کو بھی جلا سکتی ہے"۔

"ہاں گناہگاروں کو جلاتی ہے سورج کی آگ۔ بجیا قلم چلاتی ہوئی رواروی میں بولیں۔ آخر کچھ تو جواب دینا تھا چھوٹی بہن کی بات کا۔

"لو بھلا، یہاں گناہ اور ثواب کا کیا کام؟" رخشی ہلکے سے ہنس کر بولی۔ "یہ تو فضول کے قصے ہیں نہ سر نہ پیر ہم کیوں پڑیں گناہ ثواب کے جھمیلے میں؟ اے بجیا" رخشی کو اچانک کوئی واقعہ یاد آ گیا اور وہ تکیہ ایک طرف ڈال کے اُچھل کر بیٹھ گئی اس میگزین میں ایک بڑا ہی چٹ پٹا قصہ ہے ایسا ہی جیسا کچھ دن پہلے فاطمہ کی اماں اپنی اس نئی کرائے دار کو سُنا رہی تھیں۔۔۔"

"تو تم دوسروں کی باتیں چھپ کر سنتی ہو"؟ بجیا نے رُخ موڑ کر رخشی کو دیکھتے ہوئے کہا لیکن انھیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ رخشی کے چہرے پر دور دور تک شرمندگی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

"ارے وہ سب چھوڑو ہمیں تو لگتا ہے یہ کہانی لکھنے والے موئے چور ہوتے ہیں ایسی ہی کہانیاں سُن سُن کر قصے گھڑ لیتے ہیں"۔

"کون سا قصہ؟"

"وہ جو نکڑ والا مکان ہے نا؟ ارے وہی جس میں گوشت کی دکان ہے اس مکان کے مالک کی بیٹی اپنے کالج کے دوست کو بھگا کر لے گئی توبہ توبہ آج کل کی لڑکیاں بھی کتنی حرافائیں ہیں لڑکوں کو بھگا لے جاتی ہیں"۔

"چپ رہو بیکار کی بک بک سے تمھارا منہ نہیں دُکھتا؟" بجیا نے پلٹ پر رخشی کو ڈانٹا۔ اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

"لو بھلا منہ کیوں دکھنے لگا رخشی پر ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہم نے تو پڑھا ہے کہ اتنا افسوس کہ رونے کا وقت ہی نہیں ملے اسی لیے ہم ہنستے رہتے ہیں تمھاری طرح تھوڑی ہیں کہ منہ میں گھنگھنیاں بھر کے بیٹھے رہیں"۔

بجیا نے قلم روک دیا۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا رخشی کے چہرے پر معصوم عمر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا نرم آتشیں ہونٹوں پر پُر بہار مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو غور اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔۔

رخشی نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا ایک معصوم جملے نے اس کے مردہ احساسات میں آتشیں رو دوڑا دی۔ دو آنسو نہ جانے کس باندھ کو توڑ کر رخساروں پر ڈھلک آئے نمی کا احساس ہوتے ہی اس نے پلو سے اشک لونچھ ڈالے اور تحریر پر جھک گئی۔

رخشی کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ ایک جملہ کہہ کر اس نے اپنی باجی کے اندر کیسا طوفان بپا کر دیا ہے۔ اس نے ناخن کو دوپٹے کی کور سے رگڑا اور پھر بجیا کی طرف دیکھا جو اس کی جانب پشت کیسے بدستور لکھنے میں مصروف تھیں۔

"اُف فوہ بجیا صبح سے بیٹھی ہو لکھنے اب تو بس کرو ہم بور ہو رہے ہیں"۔

"بس میری جان ذرا سی دیر اور آخری سطریں ہیں" بجیا تیز تیز قلم چلاتی ہوئی بولیں۔

"بجیا ایک بات کہیں؟"

"ہاں۔ کہو"

"اس گھر میں اب ہمارا دل نہیں لگتا دیکھو نا کتنی سلین ہے ادھر دیوار میں چوہوں نے بل بنا لئے ہیں رات بھر چوں چوں کرتے رہتے ہیں کل رات تو بڑا اندھیرا تھا لائٹ جلائی تو نہیں جلی سچ اتنا اندھیرا تھا کہ ہم تو ڈر گئے ساری گلی اندھیری پڑی تھی نہ جانے کون بلب توڑ دیتا ہے ہر بار اور تمھارے کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند تھا یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے نہ محلہ اچھا نہ پڑوس۔ بور۔ بجیا وہ پلنگ سے اُتر کر بجیا کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی ٹھوڑی کو ان کے سر پر ٹکا دیا سامنے دیوار پر اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور ان میں ایک خواب کروٹیں لے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیوار کسی محل کا دریچہ بن گئی اور امارت کی مسحور کن خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی۔

"بس ایسا ہی ایک محل ہو بہت سے نوکر چاکر ہوں سونے کا کمرہ الگ، کھانے کا الگ اور بیٹھنے کے لیے شاندار ڈرائنگ روم اور ہاں محل کے بڑے بڑے دروازے ہوں"۔

"کیوں؟ بڑے دروازے کس لیے؟"

"بجیا۔ اگر ہم مر گئے تو کیا اتنے چھوٹے دروازے سے ہمارا جنازہ نکل سکتا ہے؟"۔ رخشی نے مکان کے صدر دروازے کی طرف اشارہ کیا جو بمشکل دو ڈھائی فٹ قطر کا رہا ہوگا۔

"رخشی۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

بجیا تڑپ گئیں۔ انھوں نے اُٹھ کر رخشی کو بانہوں میں بھر لیا۔ اور اس کے رخسار چوم کر بولیں "نہیں میری جان، ایسا نہیں کہتے"۔

"سچ بجیا۔ ہمارا بڑا جی کرتا ہے اچھی جگہ رہنے کو صرف اچھا پہننے اور اچھا کھانے سے ہی تو زندگی نہیں گذرتی، ایک کا

رہو، بنگلہ ہو۔ جب ہم شاپنگ کرنے جائیں تو ہمارے پرس میں بہت سے نئے کڑکڑے نوٹ ہوں اور شاپنگ بیگ لئے جب شاپنگ ہال سے باہر آئیں تو شفاف وردی پہنے شوفر ہمارے لیے ادب سے کار کا دروازہ کھولے اور ہم کار کی پچھلی سیٹ پر اکڑ کے بیٹھیں، لوگوں کی نظریں جب ہماری جانب اٹھیں تو ان میں تعریف بھی ہو، حیرت بھی ہو اور تحسین بھی۔ پھر کار فراٹے بھرتی ٹریفک کے درمیان سے نکلتی بنگلے کے پورٹیکو میں آرکے نوکر مستعد ہوں۔ پچھلا دروازہ کھول کر ہمیں اُترنے میں مدد کریں اور شاپنگ بیگ سنبھالے ہمارے پیچھے پیچھے ادب سے چل کر اندر آئیں جہاں ایک صاحب صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہوں اور ان کے ہونٹوں میں بڑا سا سگار دبا ہو۔ وہ نظریں اُٹھا کر ہمیں دیکھیں مسکرائیں اور کہیں آپ تو بڑی جلدی آگئیں ہم تو سمجھتے تھے شاپنگ مال کو دیوالیہ کر کے لوٹیں گی۔ اور ہم؟ بجیا کیا ایسا ہو سکتا ہے"

"ہو سکتا ہے رخشی ہو سکتا ہے"۔ وہ اپنی ننھی سی جان کو سینے سے بھینچ کر بولیں۔ "کل رانا صاحب نے بھی"۔ وہ کہتے کہتے یکا یک رُک گئیں آنکھوں میں ایسا ہی خوف تھا جیسے بات پوری ہو جاتی تو شاید طوفان پھٹ پڑتا بجیا نے متوحش نگاہوں سے رخشی کو دیکھا مگر وہاں تو کوئی ردِعمل نہیں تھا ان کی ادھوری بات کا، نہ کوئی تجسس نہ جستجو۔ کچھ تو نہیں تھا سوائے معصومیت اور بیگانگی کے انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"ارے ہاں بجیا، یہ رانا صاحب بھی غضب کے ہیں اور ان کا بنگلہ۔ اُف کتنا عالیشان ہے، یاد ہے جب ہم پہلی بار وہاں گئے تھے تو میں تو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی واہ کیا شاندار زندگی ہے ان کی اور ایک ہم ہیں کہ۔ اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ گلی سے پھیری والے کی آواز سن کر رخشی چونکی اور چھلانگیں مارتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔ بجیا نے گہری سانس لی اور آرٹیکل پورا کرنے بیٹھ گئیں۔ کل ہی اپوزیشن لیڈر سے انھوں نے انٹرویو ریکارڈر سے اُبھرتی آواز کو وہ جملوں میں پرونے لگیں۔ انٹرویو میں وہی سب کچھ تھا جو اپوزیشن رہنما حکمراں پارٹی کے خلاف بولتے رہے ہیں آرٹیکل پورا کرنے کے بعد اسے لفافے میں بند کیا۔ ریکارڈر کا سوئچ آف کیا اور قلم کا کیپ لگا کر وہ خود میں کھو گئیں۔

بجیا نے اپنے آپ کو ٹٹولا عمر کی کتنی سیڑھیاں بنا رُکے وہ پھلانگ چکی تھیں۔ اب تو مزاج پر سنجیدگی اُتر آئی تھی۔ وہ عمر کہاں کھو گئی جس میں شرارتیں ہوا کرتی تھیں جس میں لاأبالی پن ہوتا تھا؟ جس میں مانگ سے زیادہ پانے کی خواہش ہوتی تھی؟ مگر اس نے تو کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ نہ طلب کی تھی بس مولا نے جو دے دیا اسی کو انھوں نے نعمت سمجھ کر جھولی میں انڈیل لیا اور آج تک اسی نعمت کو جھولی میں سنبھال کر رکھتی آرہی تھیں۔ جسم بھی اب بولنے لگا تھا کم بخت جب بے زبان تھا تو رانا صاحب نے اس کے تقاضے سمجھنے میں بڑی مہارت سے کام لیا تھا۔

وہ بھی عجیب حادثہ تھا جو اُن کی زندگی میں در آیا تھا آج بھی اس کی آتشیں لپٹیں روح کے کناروں کو جھلساتی رہتی ہیں مگر بدن کے نشیب و فراز ہر کرب خیز صدا کو خود سے دور رکھتے آرہے تھے۔ انھیں تو پامال ہونا تھا، ہو گئے روح ضمیر کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہے تو کرتی رہے جذبے پیٹ کی چیخوں سے ناآشنا ہو کر اپنا سامنہ لیے چُپ چاپ پڑے رہ گئے تھے۔

وہ فیض آباد کی نچلی بستی میں رہتے تھے کریم بخش مسجد میں امام بھی تھے، موذن بھی تھے اور درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے تھے پانچ وقت مسجد میں اذان دیتے۔ جھاڑو لگاتے امامت کرتے اور درمیانی وقفے میں محلے کے نادار بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی علوم سے ان کے کچے ذہنوں کو ثمر آور کرتے۔ بہت روشن خیال اور کھلے دل کے مالک تھے گھر میں

نیک بخت بیوی صالحہ خاتون، بیٹا جمال اور دو بیٹیاں فاطمہ اور رخشی تھیں۔ محلّے اور اہالیان مسجد سے جو چندہ اکٹھا ہوتا اس میں سے مسجد کے ضروری اخراجات کے بعد کچھ رقم کریم بخش کو ان کی خدمات کے صلے میں ملتی جو ہوتی تو بہت قلیل تھی مگر کشتم پشتم مہینہ بھر صالحہ خاتون اپنی خوش سلیقگی سے نباہ لے جاتی تھیں بچوں کی تعلیم کے ساتھ گھر چلانا اور اوپری ضروریات پوری کرنا بھی صالحہ خاتون کی ذمے داری تھی جو صابر و شاکر عورت اُف کیے بنا پورا کرتی آرہی تھی کریم بخش بے نیاز انسان تھے مسجد اور گھر دو ہی اُن کے مرکز تھے یہی تفریح گاہ بھی تھے اور یہیں سے انھیں ذہنی آسودگی بھی حاصل ہوتی تھی قناعت نے مزاج اور طبیعت پر ایسا ڈیرا جمالیا تھا کہ کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنے کی خواہش بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔

مسجد سے کچھ ہی فاصلے پر رام پرساد پنڈت کا مکان تھا اور اس کے بالکل سامنے ہنومان گڑھی کا مندر۔ ادھر کریم بخش مسجد کے امام و موؤذن تو اُدھر رام پرساد مہنت۔ دونوں الگ الگ مسلک کے ہونے کے باوجود بیحد یار غار تھے۔ مہنت رام پرساد آرتی سے فارغ ہو کر مسجد چلے آتے اور دونوں مسجد کے صحن میں بیٹھے تاریخ فلسفہ مذہب اور دنیاداری پر تبادلۂ خیال کر تے رہتے تھے۔ رام پرساد کا ایک ہی بیٹا تھا ہنومنت۔ ہنومان جی تو خود کبھی لنگوٹ سے باہر نہیں آئے مگر رام پرساد کا اعتقاد تھا کہ یہ انھی کی نظر کرم تھی کہ ۱۲ سال بعد ان کے یہاں کل کا چراغ روشن ہوا۔ اور وہ دھنیہ ہو گئے انھوں نے نوزائیدہ بچے کو ہنومان جی کے چرنوں سے اسپرش کیا اور اس کے نام کرن کے مہورت کا انتظار کیے بنا اس کا نام ہنومنت رکھ دیا۔ اب وہ ۱۵ سال کا بیحد ہنس مکھ اور خوبرو بننے کی تیاری میں تھا اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے مہنت گری کے گُر سیکھ لیے تھے سنسکرت میں بھگوت گیتا کا پاٹھ کرتا اور ہنومان چالیسہ کو اپنی مدھر آواز میں لے بدّتا سے پڑھتا تو آرتی اور بھگتی میں شریک شر دھالو مگدھ ہو کر رہ جاتے۔

کریم بخش کے گھر ہنومنت کا آنا جانا تھا فاضل وقت کا وہ اس طرح فائدہ اُٹھاتا کہ دیگر مسلم بچوں کے ساتھ وہ بھی قر آن کی درسی تعلیم میں شریک ہو کر ان بچوں کی نقل کرتا رہتا اس طرح کئی آیتیں اسے ازبر ہو گئی تھیں یہی نہیں وہ ان کے معنی و مفہوم سے بھی واقف ہو گیا۔

عجیب طرح کی دوستی تھی کریم بخش اور رام پرساد کے درمیان۔ انتہا پسندی نہ ان کا کردار بنی اور نہ ان کا چرتر۔ صاف سُتھر امزاج شفاف طبیعت کے مالک تھے دونوں۔

رام پرساد اور کریم بخش نے نوابان اودھ کی انسان دوستی اور بے ریا حکمرانی بھی دیکھی تھی وہ فرنگی کی حکمت عملی سے بھی واقف تھے اور پھر سن ۴۷ء میں تقسیم ملک سے پھوٹے فساد کی آنچ انھوں نے اپنے گھروں تک محسوس کی تھی پھر جمہوری نظام قا ئم ہوا پاکستان وجود میں آیا اور کئی مہاجر خاندان پاکستان کی سرحدوں کو عبور کر کے ہندوستان کی زمینوں پر آن بسے۔ ہندوستان نے فراخ دلانہ روایتی مہمان نوازی سے انھیں احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ مہاجر ہیں ایک عام ہندوستان کی مانند انھیں بنیادی حقوق دیئے اور وہ پھلتے پھولتے چلے گئے۔ آزادی سے قبل ہندوستان کا باشندہ نقلی گھی اور نقلی تیل سے واقف نہیں تھا مگر ان مہا جر قافلوں میں کئی قافلے ایسے بھی تھے جو سرزمین سندھ سے آئے تھے اور اپنے ساتھ۔ خلوص، نیک نیتی اور ایمانداری کے بجا ئے ملاوٹ، بے ایمانی اور فریب کاری کے تاجرانہ اسلحہ لے کر آئے تھے فرق اتنا تھا کہ فرنگی کو پروانہ راہ داری کی ضرورت پڑی تھی انھیں نہیں دونوں تاجر تھے ایک منظم سازش کے تحت وارد ہوا، دوسرے کو سازش کی تنظیم کی ضرورت ہی نہیں ہوئی زمین ہمو

ار تھی۔ بیج ڈالا اور فصل تیار ہوگئی رام پرساد اور کریم بخش نے وہ دور بھی دیکھا کہ گھروں کے باورچی خانوں کی ہانڈیوں میں سبزی اور تلہن سے کشید کیے ہوئے ست کو گھی کا نام دے کر ڈالا گیا اور جب اس گھی سے پکی سبزی ترکاری کا ذائقہ ان دونوں نے چکھا تو حیران رہ گئے۔

یہ پہلا تعارف تھا جو بے ایمانی اور ملاوٹ کا ان کی پاکباز طبیعتوں سے ہوا اور پھر دھیرے دھیرے سندھ کی زمینوں سے جنھیں بے دخلی ملی تھی وہ اس آزاد ملک کی تجارتی، غیر تجارتی اور سیاسی منڈیوں پر چھاتے چلے گئے، فرنگی کو صدیاں لگی تھیں دہلی تک پہنچنے میں اسے خون کے درمیان سے اپنا راستہ بنانا پڑا تھا مگر انھیں تو نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری، ہر رنگ چوکھا آیا۔ اور پھر بہت غیر محسوس طریقے سے ہندوستان کا ہر باشندہ، کیا ادنی کیا اعلٰی اور ان کی زبانیں ملاوٹی کھانوں۔ ذائقوں اور مصنوعی طریقوں سے کشید کیے ہوئے تلہنوں کی ایسی عادی ہوئیں کہ بعد کی نسلوں کو اصلی گھی، مکھن بالائی سے گھن آنے لگی۔ سارے ہندوستان کو اس ذائقے کی ایسی چاٹ لگی کہ ہر ذائقہ زبان سے اُترتا چلا گیا جو حملہ نادیدہ دسترخوان پر ہوا تھا، دھیرے دھیرے جسم کے ہر مسام، ہر فکر، ہر سوچ اور ہر فیصلے کو اپنی گرفت میں لیتا چلا گیا۔ دو سو سال میں فرنگی جیسی مکار اور گھاگ قوم کو یہ گر معلوم نہیں ہوئے تھے جو محض چند برسوں میں سندھ نے آزما ڈالے اور کامیاب ہو گیا انگریز سے کہیں زیادہ یہ عیاری کام آئی اور وہ خون جو گاندھی کی چھاتی سے اُبلا، طبقاتی نظام کو تقسیم کی ہوا اور شہ دیتا چلا گیا۔۔۔

لیکن کریم بخش اور رام پرساد دہلی کی سیاسی سیر گاہوں سے ناواقف اپنی روایتی صف بندی میں مصروف رہے۔ سریو ندی میں اسنان، آرتی، مسجد کی اذان، نماز، درس تدریس یا پھر اپنے گھر بیوی بچوں کے درمیان اور محلے والوں کے بیچ اُٹھنا بس ان کا ہندوستان فیض آباد تک محدود تھا۔ اس کے آگے کی سمت سے وہ انجان ہی رہے واقف تو تب ہوئے جب اپنی خونی طلب کا اعلان کیا سوچی سمجھی سازش کے تحت تالے کھولے گئے سومناتھ سے رتھ یاترا نکلی اور دہلی کی خونی طلب کی پیاس بجھانے فیض آباد کی سرحد تک آ پہنچی جس دھرتی کو صدیوں نے زندگی کی کلکاریوں سے اس کے ہونٹوں کو آباد رکھا تھا، وہ دھرتی تاپ کا روگ بنتی چلی گئی آڑی ترچھی پڑتی تعصب کی خونی لکیر مسجد اور مندر کے درمیان سُلگ اُٹھی لیکن کریم بخش اور رام پرساد کے رشتوں میں کوئی دوری نہیں پیدا ہوئی۔ دونوں کے معمولات اسی لگی بندھی روش پر دوڑ لگاتے رہے مگر وہ پیر کیسے اپنی رفتار کو محدود کر دیتے جنھوں نے پہلی پہلی بار جوتے کا لمس محسوس کیا تھا۔ وہ انگلیاں کیسے بے حرکت رہ جاتیں جن میں کرنسی کا گرم پسینہ لگا تھا اور وہ دل کیسے معتدل ہو پاتے جن کی دھڑکنوں کے خالی کشکول نے دولت کی پُر فریب مگر پُر کشش جھنکار سُنی تھی اور آسمان کی وسعتوں میں اُڑتے ہوئے ہوائی جہازوں کو جن نسلوں نے صدیوں صرف دیکھا تھا ان کو قریب سے دیکھنے کی تمنا کی تھی، ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز کی آرام دہ سیٹوں پر جن کولھوں نے بیٹھنے کا شرف حاصل کیا، ان کولھوں کی سیاہی تو دور ہونا ہی تھی۔ نظریات بدلے تو زبان پر جبر آ گیا اور سیاسی کوٹھے آباد ہونا شروع ہو گئے کنکر پتھر پانی پر تیرنے کی صلاحیت پا گئے اور چونکہ سیاست میں صرف عداوت کدورت، بے مروّتی اور لاتعلقی ہوتی ہے محبت اور اخلاص سے وہ بہرہ مند نہیں رہی اسلیے اشراف کوڑی کوڑی ہوئے اور خوردن و خفتن و عیش کردن کے مصداق آوارہ سناٹوں کے غول روشنی پر حاوی ہونے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

کریم بخش اور رام پرساد تو اصل حقیقت سے تب آشنا ہوئے جب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء آ پہنچا اور وہ عبادت گاہ مسمار کر دی گئی

جو اس روئے زمین پر خاموش کھڑی ایک مُنڈ اور درخشاں نور قندیل بشر کی سفارت کا فرض انجام دے رہی تھی دونوں گھر بول بھو ل گئے۔ صدیوں کی روایتیں خاک ہوئیں۔ جس ملک کو غیر کے ہاتھوں سے چھین کر آپس میں بانٹ لیا تھا، ادھر سے گئے اُدھر اُدھر سے آئے اِدھر کے نام نہاد شر پسندوں نے ساری تہذیب قومی ملی کو ستاڈالنے میں کوئی کور کسر نہ اُٹھار کھی رام نے جس سریوندی میں اپنے پوتر شریر کا اسپرش دیا تھا۔ وہ پانی انسانی لہو سے کچھ ایسا ہم آغوش ہوا کہ پانی اور لہو میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور بیچارے رام جی۔ وہ تو بہت پہلے اس کشمکش سے دوچار ہو چکے تھے کہ وہ کس کی حمایت میں آگے بڑھیں گوڈسے کی۔ جس کی گولی پر جے رام لکھا تھا یا اس بے گناہ اور لاغر شہید کی چھاتی سے نکلتے خون کی حمایت کریں۔ جس سے ہے رام کی دلدوز کراہ بلند ہوئی تھی۔

ہنومان جی کے مندر اور کریم بخش کی مسجد میں بھی دراڑ پڑ گئی۔ کون کہاں گیا؟ کیسے گیا؟ کن کے ہاتھوں گیا کون بتا ئے اس دن سورج بھی مُردہ کرنیں لے کر طلوع ہوا زمین خون کی مہاوٹوں سے سیراب ہو چکی تھیں اور جا بجا چھوٹے بڑے ننگے ادھ ننگے سربریدہ پودے انسان کی فصلوں سے لہلہا رہے تھے۔ انہی میں کریم بخش ان کے بیٹے، ان کی بیوی، رام پرساد اور ان کی اہلیہ کی لاشیں بھی تھیں۔ رام پرساد نے مسجد میں پناہ لی تو کریم بخش نے مندر میں تحفظ چاہا مگر خونی پنجے نے کوئی تمیز نہیں کی کریم بخش کی دونوں بیٹیوں اور رام پرساد کے بیٹے ہنومنت کا کوئی نشان نہیں ملا۔ نہ مُردہ اور نہ زندہ۔ یہاں راوی کا سہارا در کا رہا اور روی نے کئی دن چین نہیں لکھا تھا۔ وہ خود بھی بے چین و بیقرار تھا آنکھوں سے جو آنسو بہے ان میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی ہا ل ان کا رنگ گہرا لال تھا جیسے کسی نے کبوتر کو کاٹ کر دونوں آنکھوں پر رکھ دیا ہو۔

راوی کہتا ہے فاطمہ اور رخشی بچ کر نکل گئی تھیں اور ان کو بچا کر نکال لے جانے والا ہنومنت تھا۔ ساری رات کھیتوں کھیتوں وہ میلوں بھاگتے رہے تھے موت کا خوف پر پیاس ہر خوف پر حاوی پیروں میں طوفان باندھے رہا۔ رات کا نہ جانے کو ن سا پہر تھا جب ہنومنت کی دلخراش چیخ سے رات کے کالے سناٹے دہل اُٹھے۔ دونوں لڑکیاں خوف سے سمٹ گئیں۔ ہنو منت کھیت میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ کیسے اس کی تڑپ کو سمجھے کوئی راوی کہتا ہے چاروطرف گھورا ندھیرا تھا آسمان برگشتہ اور زمین آسیب زدہ ہو چکی تھی پناہ ملے تو کہاں؟ دونوں لڑکیاں ہر افتاد سے بیگانہ۔ اپنے محسن کو سہارا بھی دیں تو کیوں کر؟ پھر ہنومنت نے ہمت جٹائی جیسے تیسے کھڑا ہوا اور اپنی تڑپ کو، بہنوں کے سروں پر آنچل رکھ کر برداشت کیا اور آگے بڑھتا گیا۔ آخر برداشت نہ ہوا جو صلہ جواب دے گیا اور وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی مانند ڈھ گیا مگر اس کا ڈھ جانا ان کے لیے حوصلہ افزا رہا راوی آگے بیان کرتا ہے کہ وہ سڑک کا کنارا تھا اور رات اپنا آخری پڑاؤ اُٹھا چکی تھی ہنومنت بے سُدھ پڑا تھا۔ دونوں بہنیں خوف سے لر زتی کانپتی اسے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دور سے دو روشنیاں انھیں اپنی جانب آتی دکھائی دیں۔ دونوں اور کانپ اُٹھیں جائیں تو کدھر اور بچیں تو کیسے؟ ہنومنت نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے وہ قریب آتی روشنیوں کو دیکھتی رہیں جن کا حجم اب بڑ ھتا جا رہا تھا پھر آواز بھی واضح ہوئی کسی کار کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ کار والے نے شاید انھیں سڑک پر بیٹھے دیکھ لیا تھا کار قریب آ رکی انجن بند نہیں کیا گیا کہ روشنیاں جلتی رہیں دو پیر ان کے نزدیک آ ٹھہرے لڑکیاں جسم میں خوف کی سوئیاں چبھتی محسوس کر رہی تھیں وہ شخص ہنومنت کے قریب بیٹھ گیا اس نے ہنومنت کو دیکھا۔

"اوہ خدا۔ اسے تو سانپ نے ڈس لیا ہے"۔ اس کی آواز مانوس لگی تو فاطمہ نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ بیحد خوبرو اور جوان شخص تھا اس نے ہنومنت کی نبض اور تنفس کا احساس کی۔، "اُف یہ تو مر چکا ہے،، وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا لہجہ متاسف تھا ہنومنت

کی موت کا سُن کر دونوں چیخ پڑیں اور بے تحاشہ رونے لگیں۔

''تم لوگ کون ہو بی بی؟ اور اتنی رات میں یہاں اس ویرانے میں گھبراؤ نہیں میں ہمدرد ہوں بتاؤ'' اس کا لہجہ بیحد قر ہی لگا فاطمہ نے خود کو سنبھالا اور مختصر طور پر حالات بتادئے اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر انھیں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے ڈالی فاطمہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے پیچھے گہرے غار تھے اور آگے سپاٹ راستہ۔ غار سے بہتر راستہ ہوتا ہے اُس نے راستہ چُن لیا، مگر ہنومنت؟ اس کا کیا کریں؟''

''اب ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ہم اسے کھیت کی نرم مٹی پر ڈال دیتے ہیں خدا مجبوری کو سمجھنے والا ہے''۔

راوی آگے بتاتا ہے کہ وہ رانا بختاور تھا اور رانا بختاور فاطمہ کی زندگی میں ایسے داخل ہوا کہ پھر فاطمہ کے لئے کسی اور چوکھٹ کو عبور کرنا ممکن نہیں رہا۔ رانا بختاور نے شروع میں اپنے گھر میں پناہ دی مگر کب تک؟ بیوی نے اعتراض کے بان چلائے تو اس نے انھیں گھر سے ہٹا دینا ہی مناسب سمجھا اور یوں بھی فاطمہ کا کچا کورا اور منہ بند بدن ان کے حواس پر بجلی کی تیز خیرہ کُن آوارگی بن کر یلغار کر رہا تھا مگر وہ تجربے کار کھیلے کھائے انسان تھے گرم نوالہ یوں بھی زبان کی نوک کو تو جلا ہی دیتا ہے تھوڑا ٹھنڈا ہو تو چبانے اور نگلنے میں بھی مزہ دیتا ہے۔ فاطمہ کے لیے انھوں نے شریف مگر متوسط محلّے میں چھوٹا سا مکان خرید کر دے دیا اور دونوں بہنیں اس کچے مکان میں رہائش پذیر ہو گئیں۔ رانا بختاور ایک اخبار کے مالک بھی تھے بڑا سرکیولیشن ہونے کی وجہ سے سیاسی اور سماجی حلقوں میں کافی اثر ورسوخ تھا۔ اسکینڈل سے بچنا۔ چاہتے تھے فاطمہ پڑھی لکھی تھی، اس لیے اسے اپنے اخبار میں ملازمت دے دی اور اس طرح کبھی کسی سیاسی شخصیت سے انٹرویو، کسی تجارتی گروپ کی میٹنگ کے کوریج اور کبھی کسی ادبی، ثقافتی اور عوامی تقریبات میں شمولیت وموجودگی فاطمہ کے لیے لازمی ہو گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ رانا بختاور سے قریب ہوتی گئی اور یہی قریب آنا قرب کا باعث بنتا گیا اور آخر رانا بختاور نے اپنے صبر کی آزمائش کی اور اس قدرے ٹھنڈے مگر بھاپ دیتے نوالے کو حلق سے اُتار ہی لیا۔

بدن بھی بڑی ہی منچلی کتھا کا انش ہے کرشن کی راس لیلا، دروپدی کا چیر ہرن، اور واجد علی شاہ کا رہس، اسی بدن سے عبارت کتھائیں ہیں اسی بدن نے اجنتا ایلورا اور کھجوراہو کو نفسانی زمیں کی سطح پر اُگایا اسی بدن نے کالی داس سے مالویکا اگنی مترم اور شکنتلا جیسی رچناؤں کی تخلیق کرائی۔ اسی بدن نے نجد، مازندران اور پنجاب کی سرزمینوں پر عشق وحسن کی لازوال داستانیں رقم کیں اسی بدن نے کام سوتر کے توسط سے پر تعیش آدمی کو مختلف آسنوں کی ترکیب آزمانے پر اُکسایا تو پھر بھلا رانا بختاور جیسا ایک عام عیاش شخص بدن کی بھول بھلیوں میں کیوں نہ گم ہو جاتا؟ اور وہ گم ہو گیا!

فاطمہ نے رانا بختاور کو اپنا آپ اس طرح ہارا کہ پھر سارے تصورات اس کی نگاہوں سے خود کو کنارا کش کر گئے زندگی کی ہر آسائش ہر سہولیت اسے میسر تھی تو پھر کیا نکاح اور کیا اس کی شرعی پابندیاں ہر شے غیر ضروری ہو گئی نہ رانا بختاور نے اُسے وقار دینا پسند کیا اور نہ مجبور فاطمہ نے اصرار کیا ایک استعمال ہوتا رہا دوسرا استعمال ہوتا رہا تمام دنیاوی اور دینوی پابندیاں دور کھڑی منہ دیکھتی رہ گئیں۔ کہاں کا سفر کہاں تک آپہنچا۔ یہ تو ایک ٹھہراؤ تھا، ایک پڑاؤ، منزل تو یہ بھی نہیں تھی کون سی منزل اور کہاں تھی؟ سب کچھ بھی غبار آلود تھا۔ کبھی کبھی اس کہر آلود غبار میں شبیہ اُبھرتیں کئی مسافتیں تجسیم ہوتیں اور پھر ایک دلدوز چیخ اُبھرتی ہنومنت کی چیخ جس نے اپنا نہ ہوتے ہوئے بھی کچے اور منہ بولے دھاگوں کی لاج نباہی تھی اور فنا ہو گیا تھا۔ مگر وہ فنا تو

نہیں ہوا تھا ایک قربانی تھی اور قربانی کبھی فنا نہیں ہوتی یہی وجہ تھی کہ وہ قربانی چیخ بن کر فاطمہ کو جھنجوڑ جاتی یہ تو اپنوں کے ہاتھوں کا حصار تھا جس میں آکر وہ محفوظ تو ہوئی تھی مگر اس کا عورت پن فنا ہو گیا تھا اُف۔اللہ !

رخشی نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھیں بند کر لیں تو فاطمہ کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا" بجیا۔دیکھو ہم نے چوڑیاں پہنیں ہیں" اس نے دونوں کلائیاں فاطمہ کے آگے لہرائیں ہرے اور سرخ رنگ کی چوڑیاں اس کی گوری گوری کلائیوں میں خو ب رونق دے رہی تھیں۔فاطمہ نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔یہ چوڑیاں تو سہاگ کہلاتی ہیں لیکن اس کی کلائیاں تو اس مقدس بوجھ کی متحمل ہی نہیں ہو پائیں، فاطمہ کے لبوں سے پُر حسرت آہ نکلی اور اس کی نگاہیں رخشی کے جسمانی خطوط پر آٹھہر یں جواب۔بہت واضح ہو چلے تھے بچپن کب نکلا لڑکپن نے کب وداع لی اور جوانی کا شباب کب لو دے اُٹھا، اس ہاپادھاپی کی زندگی نے تو اُسے غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا آج غور کیا تو دل دھک سے رہ گیا۔

رخشی بدستور کلائیوں کی چوڑیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی ناچ رہی تھی اور ساتھ میں اپنی بجیا کے بازوؤں کو پکڑ کر اِدھر سے اُدھر ڈول رہی تھی۔

"اُف رخشی !ہوش نہ کھوؤ"۔فاطمہ نے اس کی گرفت سے خود کو چھڑایا اب تم بچی نہیں رہیں اگلے سال تمھارے پہلے غسل کو تین سال" وہ کہتے کہتے رُک گئی، بہت رواروی میں فاطمہ کے منہ سے یہ ادھورا جملہ نکلا تھا مگر نہ جانے کیوں رخشی چو نک گئی لب ساکت ہو گئے اور ہنسی کی تیز دھار جو شوخ چتوار کی کاٹ سے پھوٹ پڑنے کو بیتاب تھی ٹھہر گئی!

اس نے فاطمہ کے چہرے کو دیکھا اب اس چہرے میں دوشیزگی کی بے پرواہی نہیں رہ گئی تھی رخساروں پر ایک نجتہ چمک نے اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔آنکھوں میں ایک ہی منظر منجمد ہو گیا تھا اور جسم کچھ بھاری سا ہو گیا تھا !

"میرا مطلب، ابھی تم کم عمر ہو"۔

"تو کیا ہوا ہوں تو آپ کی ہی بہن" رخشی کے لہجے میں کوئی ایسی ہی بات محسوس کی فاطمہ نے جس نے اسے گڑبڑا دیا۔

"بہن ہو اسی لئے میری جان خود کو" وہ کیا کہنا چاہتی ہے، یہ اسے بھی نہیں معلوم جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"بجیا۔رخشی نے اس کی ٹھوڑی اُٹھا کر فاطمہ کی آنکھو میں دیکھا"۔ایک ہی تماشہ ہر بار دیکھو تو آنکھیں صرف تماشبین نہیں رہیں تو۔

"تو۔۔کیا کہنا چاہتی ہے۔۔؟

"کیسا تماشہ؟"

"میں سیریل کی بات کر رہی ہوں کتنے اپی سوڈ نکل گئے مگر ہیروئن کے گھر کی گلی میں بجلی نہیں آتی، اندھیرے میں ایک سایہ اُبھرتا ہے، گھر کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ سایہ اندر جا کے گم ہو جاتا ہے اندر بھی تاریکی، باہر بھی اندھیرا مگر سیریل والے بھی بڑے گھاگ ہوتے ہیں ایسا اسکرین پلے لکھتے ہیں کہ دیکھنے والا آسانی سے سمجھ لے کہ اندر کون سا کھیل جاری ہے اور آپ کہتی ہیں میں کم عمر ہوں بجیا ایک دن دیکھنا میں آپ سے آگے نکل جاؤں گی بہت آگے،، یہ جملے بڑے ہی سفاک تھے۔فاطمہ کو چپ لگ گئی اور وہ کرسی کو کانپتے ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئی اور رانا بختاور کے قدم دروازے سے ہی واپس ہو گئے جو نہ جانے کب آ گئے تھے۔

شملہ ہلز کی پہاڑی کی پُر فضا آغوش میں رانا بختاور کا بنگلہ رخشی کو ہمیشہ بھاتا تھا۔ وہ جب بھی اپنی بجیا کے ساتھ اس بنگلے میں آئی ایک دبی دبی خواہش ہمیشہ اس کے دل میں جاگ اٹھتی تھی۔ اس کے ٹیرس سے دیکھو تو بڑے تالاب کا منظر کتنا دلکش اور خوشنما لگتا ہے۔ وشال اور شفاف پانی کی چادر نگاہوں کے آخری چھور تک پھیلی ہوئی اور اس پر سبک سر کشتیاں رواں دواں۔ اکثر رانا بختاور انھیں کشتی میں سیر کرانے بھی لے جاتے تھے اور وہ پانی کے بیچوں بیچ شاہ علی شاہ کا مزار، صدیوں سے ایمان ویقین کا پرتو لیے ہوئے کہتے ہیں، بہت جلالی ہیں۔ ذرا نافرمانی اور بے ادبی ہوئی تو طیش میں آگئے اور کشتیاں اُلٹ گئیں یہ تو چند سال پہلے کی ہی بات ہے، رخشی کو یاد آیا اتوارہ محلے کے کچھ بھنگی منت پوری کرنے کشتیوں سے مزار پر گئے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی ہمراہ تھے۔ منت پوری کر کے لوٹ رہے تھے کہ کشتیاں اُلٹ گئیں۔ نہ طغیانی نہ ہوائیں اور نہ پانی میں تموج پیدا ہوا پھر بھی کشتیاں اُلٹ گئی تھیں۔ سات لاشیں نکالی گئی تھیں اور اتوارہ محلے میں گھروں کے سامنے لا کے رکھی گئی تھیں کہتے ہیں عورتوں کی وجہ سے بے حرمتی ہوئی۔ عورت مُردے کو برہنہ نظر آتی ہے۔ اسی لیے شرع میں عورت کا مزاروں اور قبرستانوں میں جانا ممنوع کیا گیا ہے۔ وہ جب بھی کشتی میں سیر کرنے گئے، رخشی نے کبھی مزار پر جانے کی ضد نہیں کی۔ وہ ان بزرگ کے جلال سے ہی کانپ جاتی تھی۔ آج وہ پھر اس بنگلے میں آئی تھی !

رانا بختاور کی فیملی جب بھی کسی تفریحی مقام پر جاتی تو فاطمہ اور رخشی کئی کئی دن بنگلے میں رہنے آجاتیں۔ ایسا سال میں ایک بار ہی ہوتا تھا جب بچوں کی چھٹیاں ہوتیں تو بیگم صاحبہ مہینہ دو مہینہ کے لیے کبھی کشمیر کبھی سوئٹزرلینڈ اور کبھی کسی اور پر فضا مقام پر چھٹیاں گزارنے چلی جاتیں رانا بختاور کو ایسے موقعوں پر کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہو جاتی۔ کبھی دہلی کے ایوان سا ست سے بلاوا آجاتا۔ کبھی انڈین کنٹر یومرز لابی کی میٹنگ آجاتی کبھی ایم۔ ایف حسین کی پینٹنگز کا ورلڈ آرگنائزیشن ہونے لگتا۔ اور کبھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے مابین تال میل کے سیمینار منعقد ہونے لگتے اور بیگم صاحبہ کو بچوں کے ساتھ مجبوراً جانا پڑتا۔ تب بجیا کا راج ہوتا بنگلے پر نوکر چاکر کی مجال نہیں تھی جو رانا بختاور کے خلاف جاتے۔ بیگم صاحبہ کے فون پابندی سے آتے۔ ان فون کالوں کو صرف چاند میاں وصول کرتا جو رانا بختاور کا معتمد خاص بھی تھا اور چالاک و دور اندیش بھی۔ بیگم صاحبہ کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتا کہ صاحب کئی دن سے دہلی میں ہیں یا بنگلور میں جو سیمینار تھا اس سے نہیں لوٹے یا اچانک انھیں سینٹرل منسٹری کی ایکسٹرنل ریفیرس نے کورنج کے لیے بلایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور جب بیگم صاحبہ کی واپسی متوقع ہوتی تو بنگلے میں صرف چاند میاں رہ جاتا بیگم صاحبہ کے آنے کے بعد دوسرے نوکر بھی لوٹتے اور رانا بختاور بھی۔

یہی وہ دن تھے جب اس محلے کی کثافت سے رخشی کو نجات ملی تھی اور وہ فاطمہ کے ساتھ رانا بختاور کے بنگلے میں اُٹھ آئی تھی۔ صبح دو پہر شام تفریحی پروگرام، شاندار ڈنر لنچ سے ڈائننگ ٹیبل سجی رہتی اور لگژری زندگی کی ساری آسائشیں۔ ڈنر کے بعد کافی کا دور چلتا اور پھر بیڈ روم کا دروازہ بند ہو جاتا۔ رخشی اس دروازے کو بھر پور نگاہ سے دیکھتی۔ جس کے عقب میں اس کی بجیا نہ جانے کون سا الجبرا یا جیومیٹری یا کون سی کیمسٹری کے سوال رانا صاحب سے حل کرتی رہتیں اونہہ۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھتی اور ریموٹ سے مختلف چینلوں پر بالغ و نابالغ پروگرام دیکھتی رہتی۔ کبھی طبیعت اکتاتی تو وہ بنگلے کے ٹیرس پر چلی جاتی اور دور بیراگڑھ کی آبادی کی مدھم روشنیوں اور حمیدیہ ہسپتال کی نئی تعمیر شدہ میڈیکل ونگز کی عمارتوں کے ہیولوں کو پانی پر ہلکورے لیتی دیکھتی تو دل کو ایک راحت بخش طمانیت کا احساس ہوتا۔ نہ جانے کب تک وہ ان مناظر

میں کھوئی رہتی اور جب جماہی اس کے لبوں سے ٹکراتی اور آنکھیں نیند کا دباؤ پلکوں پر محسوس کرنے لگتیں تو رخشی اپنے بیڈ روم میں آ کر سو جاتی۔

یہ فطری اصول ہے کہ جسم حرارتوں سے بیگانہ نہیں رہ پاتا، بدن کے تقاضے جب بند قبا سے چھلکنے لگیں تو ہاتھ انگڑائی کے لیے سر سے اونچے اُٹھنے لگتے ہیں اور ایسی انگڑائی الاماں الحفیظ۔ اس عاریں بلند ہو گئی ہوتی تو کنبھ کرن وقت سے پہلے جاگ چکا ہوتا اور راون کو اسے جگانے کے لیے اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرنا پڑتیں!

انگڑائی حسن کی وہ بیباک عبارت ہے جو صرف عورت کے بدن پر لکھی جاتی ہے اور جب یہ عبارت انگڑائی کی قوس سے بجلی بن کر نکلتی ہے تو سید حامرد کے حواس پر گرتی ہے اور ساری احتیاطیں خاکستر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

وہ بھی اتفاق ہی تھا کہ رخشی نے ٹیرس پر کھڑے ہوئے انگڑائی کے لیے ہاتھ اُٹھانے اور رانا بختاور کسی کام سے اچانک سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے ٹیرس کی چھت پر آ دھمکے اُن کے قدم تو رُک کے ہی، نگاہوں کو بھی اس ہوشربا منظر نے جکڑ لیا جیسے سر یزم کر دیا ہو، جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے تو آج تک وہ انجان ہی رہے تھے۔ رخشی کو انھوں نے کمسن بچی ہی سمجھا تھا لیکن آج ان کے سامنے ایک بھرپور عورت کھڑی تھی جسم تنا ہوا اور دو پرندے اُڑنے کو بیتاب۔ چہرے پر کچی کیریوں کا نکھار کہ دیکھتے ہی منہ میں پانی آ جائے اور پانی آ گیا۔ رخشی نے بھی انھیں دیکھ لیا۔ ان کی محویت کا اس نے نوٹس نہیں لیا نہایت اطمینان سے انگڑائی توڑی اور ہاتھ نیچے گرا دیئے اچانک سورج بادلوں میں آ گیا اور تاریکی چھا گئی۔

رخشی مسکراتی بڑی ہی بے رحم مسکراہٹ تھی وہ۔ وہ ان کے قریب آ رُکی شوخ نارنجی رنگوں نے یلغار کی۔ آنکھوں میں پرہیزگاری چنوتی دیتی کنوارپنے کی تازگی تھی اس نے رانا بختاور کو حواس باختہ دیکھا۔ اس طرح جیسے پوچھ رہی ہو، کیوں رانا صاحب آیا مزہ یا ایک اور انگڑائی؟

وہ آگے نہ سوچ پائے۔ رخشی ان کے قریب سے اپنی قربت کی سوندھی سوندھی خوشبو چھوڑتی ہوئی جا چکی تھی۔ اور فاطمہ نہ جانے کب ان کے پیچھے آ کے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو سر سے بلند کیا لیکن اس کی ان انگڑائی تو عمر کی بازگشت میں ناداریت کا خراج ادا کر چکی تھی۔

☆☆☆

دل سمندر آشنا

رائے بہادر شور نجن چودھری آج پھر کچہری لگائے بیٹھے ہیں۔ان کی اس کچہری کے فریادی ہیں کھیتی ہر مزدور۔اُن کی جوٹ فیکوی کے چھوٹے ورکر، پُرانی زمینوں کے سیدھے سادے کسان اور آخر میں ہیں وہ فریادی جن کے مسائل مختلف ہیں اور جن کی ضرورتیں محدود ہو کر بھی لامحدود ہیں سب کی فریادیں سُن کر شور نجن چودھری فیصلہ سُناتے جاتے ہیں۔روپے کپڑے لتے، غلّہ چاول کی ضرورت ہوتی ہے تو شور نجن چودھری وہ بھی بٹوا دیتے ہیں۔ان کی تجوری میں بہت مال ہے۔بھنڈارے میں غلّہ چاول بھی ہے شکر گڑ بھی ہے تیل گھی بھی ہے اور دالوں کی بوریاں بھی ہیں۔

ہفتے میں دو دن یعنی جمعہ اور پیر کو اُن کی یہ کچہری ضرور لگتی ہے۔کتنا ہی اہم کام کیوں نہ ہو وہ ان دو دنوں میں اپنی حویلی واپس آ کر کچہری لگاتے ہیں۔علاقے کی سب سے شاندار وسیع وعریض حویلی دالان در دالان، غلام گردشیں، پھر کمروں کو قطاریں، ایک کے اوپر ایک، سجے ہوئے کمرے، جن میں ضروریات زندگی کی ہر شے موجود، ہر کمرے سے ملحق طہارت خانے غسل خانے، صابن اور جدید کاسمیٹک سے راستہ۔ان کے بعد ہیں مہمان خانے پھر ہال کمرہ۔لمبا چوڑا اونچی چھت والا ہوادار ، دیواریں رنگ روغن سے چمکتی ہوئی نظر اٹھا کر دیکھو تو ۱۵ فٹ اونچی چھت، برٹش آرکیٹیکٹ کا نادر نمونہ، بیل بوٹے اور مختلف پھولوں سے پینٹ کی ہوئی، سنگ مرمر کا فرش، دلفریب، دلکش، کبھی یہاں جب انگریز اس حویلی کے مہمان ہوتے تھے، تب بال روم رقص کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔نازک اور بلوریں جام میں شراب کے دور چلتے، مغربی دیوار کے نزدیک آج بھی ایک پیانو رکھا ہے، اب اسے کپڑے سے ڈھک دیا گیا ہے۔کبھی اسی پیانو پر کسی کی انگلیاں تھرکتی ہوں گی۔مانوس مسحور کن موسیقی ہال میں لہراتی ہوگی۔عورت مرد ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے، مسکراتے زندگی سے بھرپور رقص کا لطف اُٹھاتے ہوں گے مگر یہ سب ان دنوں کی داستان ہے جب اس حویلی کا دبدبہ دور دور تک تھا اور اس حویلی کے آس پاس مسلح پہرا رہتا تھا، تب اس حویلی کے مالک رائے بہادر ششی رنجن چودھری ہوا کرتے تھے۔انہی شور نجن چودھری کے دادا رائے بہادر کا خطاب بھی انھیں انگریزوں کا بخشا ہوا تھا بیرک پور اور میرٹھ میں جب منگل پانڈے نے انگریز کے خلاف پہلا نعرہ بلند کیا تھا اور انگریزوں کی مارکاٹ ہو رہی تھی تب ایک معزز انگریز خاندان فرار ہو کر اپنی جان بچاتا اس علاقے میں آ گیا تھا۔اس خاندان میں بچے بھی تھے بزرگ خاتون اور جوان عورتیں بھی تھیں۔مرد کوئی نہیں تھا۔تب ششی رنجن چودھری نے اس انگریز خاندان کو اپنی حویلی میں پناہ دی تھی۔ان کی آسائش کا خیال رکھا تھا۔ششی رنجن چودھری کے نزدیک انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب کوئی تفریق نہیں تھی ۔وہ ایسی جنگوں سے نفرت کرتے تھے جو محض ہنگامے اور فساد کی پیداوار ہوتی ہیں جن کا مقصد لوٹ پاٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہاں تو پھر۔کافی عرصہ اس انگریز خاندان نے اس حویلی میں بسر کیا۔ششی رنجن چودھری کی مہمان نوازی نے اس انگریز خاندان کو ان کا گرویدہ کر دیا۔شکر گزاری ان کی آنکھوں اور ہر موئے تن سے چھلکی پڑتی تھی۔پھر کسی طرح انگریز ریزیڈنٹ کو اس خاندان کے زندہ ہونے کی خبر ہوئی۔تب تک ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔تب ریزیڈنٹ بہ نفس نفیس اس حویلی میں آئے تھے ششی رنجن چودھری کبھی تصور میں بھی نہیں سوچ پائے تھے کہ جس خاندان کی عورتوں اور بچوں کو انھوں نے از راہ انسانیت پناہ دی ہے وہ وائسرائے کا نزدیکی رشتے دار ہے۔ریزیڈنٹ کا خود آنا ششی رنجن چودھری کے لیے بہت اہم ہو گیا اور پھر اس انگریز پناہ گز

یں خاندان کو ایک پلٹن کی نگرانی میں حفاظت کے ساتھ دہلی بھیج دیا گیا۔

ابھی ششی رنجن چودھری سحرانگیز اور حیرت ناک حد تک خواب سے بیدار بھی نہ ہو پائے تھے کہ دہلی سے وائسرائے کا قاصد آدھمکا۔ وہ دن بھی اس حویلی کے لیے یادگار بن گیا تھا۔ روشنیوں سے حویلی جگمگا اٹھی تھی۔ ششی رنجن چودھری کا بھرا پُرا خاندان، بیٹے، بیٹی، پوتے، پوتیاں، بہو، ششی رنجن کی بیوی، لمبا چوڑا ملازموں کا جتھا، زرق برق لباسوں میں ملبوس، چمکتے مسکراتے اور انگریز سے مرعوب چہرے لیے حاضر تھے۔ اسی وسیع وعریض صحن میں جس میں آج شور رنجن چودھری اپنے آسن پر براجمان کچہری لگائے بیٹھے ہیں۔ اسی صحن میں وائسرائے کا قاصد آیا تھا۔ اسی وسیع صحن میں کرسیاں ڈالی گئی تھیں۔ شامیانے سے سارے صحن کو ڈھک دیا گیا تھا آس پاس قناتیں تھیں جن کے آگے زرفت اور حریر کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ ہوا جب انھیں چھوکر اڑاتی تو ایسا لگتا تھا جیسے پھولوں سے بھرا گلزار بہار دے اٹھا ہو، قالین اتنا دبیز کہ پاؤں دھنستے تھے۔ حویلی کی سیڑھیوں کے نیچے جہاں آج شور رنجن بیٹھے فیصلے کر رہے ہیں ٹھیک اسی جگہ زرنگار کرسیاں ڈالی گئی تھیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، پوری چھ کرسیاں تھیں۔ ایک وائسرائے کے قاصد کے لئے، دوسری انگریز ریزیڈنٹ کے لیے تیسری اور چوتھی کرسی ششی رنجن چودھری اور ان کے اکلوتے بیٹے شور رنجن کے لئے مخصوص تھیں۔ باقی کی دو کرسیاں قاصد کے ہمراہ آئے دو عہدیداروں کے لیے تھیں۔ سارے پنڈال کو ہنڈوں اور گیس بتیوں سے بقعۂ نور بنا دیا گیا تھا۔ اس تقریب میں انگریزوں کے علاوہ علاقے کی مقتدر ہستیاں بھی موجود تھیں۔ تب عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔ اسی لیے حویلی اور آس پاس علاقوں سے آئی معزز مہمان عورتیں چھتوں کے پیچھے بیٹھی یہ مسحور کن منظر دیکھ رہی تھیں۔ شور رنجن چودھری کو یاد ہے ان کے والد نے اس تقریب کی کارروائی اس طرح بیان کی تھی کہ آج بھی شور رنجن چودھری کے دماغ پر متحرک فلم کی طرح محفوظ ہے۔ تقریب میں ششی رنجن چودھری کو انگریز وائسرائے کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بے حد قیمتی تحائف، ایک بیش قیمت نازک سی تلوار کے ساتھ دیا گیا تھا۔ ان کی جاگیر میں کئی پرگنوں کا اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ قاصد نے ششی رنجن چودھری کو گلے لگا کر مبارکباد دی تھی۔ اس گرمجوشی لمس کا احساس شور رنجن چودھری آج بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت قاصد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے ہاتھ کی گرمجوشی ششی رنجن چودھری کو غیر مانوس نہیں لگی اور تب انھیں پتہ چلا کہ قاصد سر پیٹرک جانسن تھے اس خاندان کے سربراہ جوان کی پناہ میں آیا تھا۔

دیر رات تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہر شخص ششی رنجن چودھری کو رائے بہادر کا خطاب ملنے پر مبارکباد دینے میں پیش پیش تھا۔ صحن سے ملحق شمالی سمت کے دالان میں کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا ہندوستانی کھانوں کے علاوہ انگریزی چنندہ کھانے بھی پکائے گئے تھے اور پھر ششی رنجن اور ان کے بیٹے شور رنجن کی جانب سے انگریز مہمانوں کو قیمتی تحائف دے کر رخصت کیا گیا تھا۔ ان تحفوں میں سنگ مرمر سے تراشا ہوا تاج محل کا ماڈل بھی تھا جس کا حجم ۱۵ فٹ تھا جو ایک شیشے کے باکس میں محفوظ کیا گیا تھا اور جس میں رنگین اور قیمتی پتھر آویزاں کئے گئے تھے جو ذرا سی روشنی سے جگمگا اٹھتے تھے۔

وہ سند آج بھی بڑے ہال کمرے میں آویزاں ہے جس پر اس وقت لگایا گیا زرفت کا پردا آج بھی موجود ہے۔ ایک ڈوری کھینچنے پر یہ پردہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور فریم میں نیلی سطح پر ابھرے ہوئے سنہری انگریزی حروف واضح ہو جاتے ہیں اس میں صاف لکھا ہے کہ رائے بہادر کا خطاب اس خاندان کو انگریز کی شکر گزاری اور ممنون احسان ہونے کی وجہ سے دیا گیا تھا اور یہ خطاب اور جاگیریں اس۔ خاندان میں پیڑھی در پیڑھی ملکیت رہیں گی لیکن اب کہاں۔؟

ملک کی آزادی اور انگریزوں کی رخصتی کے ساتھ ہی جاگیریں آزاد ہندوستان کی ملکیت قرار پا گئیں رہے رائے بہا درپاسر، یا خان بہادر، کے خطابات تو آزاد ہندوستان کو ان کاغذی سندوں سے کیا واسطہ ہوسکتا تھا؟ محض نام کے ساتھ چسپاں رہنے والے خطابات ہی تو تھے تو خوش ہوتے رہیں اہل ہند کہ ان کے ناموں کے ساتھ انگریز کے بخشے ہوئے یہ دم چھلے ہیں۔

شور نجن چودھری کو بھی رائے بہادر کا خطاب وراثتاً ملا ہے۔ جاگیریں جب آزاد ہندوستان میں ضم ہوگئیں اور یہ حویلی ہی ان کی ملکیت رہ گئی تو شور نجن چودھری نے اپنا خاندانی وصف تیاگ کر جوٹ فیکٹری قائم کرلی اور اس کے ساتھ ریشم بنا نے کا ایک کارخانہ بھی ڈال دیا۔ آگے پیچھے تو کوئی رہا نہیں۔ ایک ایک کر کے خاندان کے سب افراد چل بسے۔ رہا ایک بیٹا تو اس کے لیے ان کے بعد بہت کچھ ہے۔ باقی تو ان لوگوں کا حق ہے جو اپنی فریادیں لے کر اُمیدوں کی آس لگائے ان کی کچہر ی میں آتے ہیں۔

حویلی کی سنگ مرمر کی شفاف سیڑھیوں سے نیچے شور نجن چودھری خاندان کی مخصوص کرسی پر بیٹھے ہیں پاس ہی ان کی آبنوسی نازک سی چھڑی لگی ہے۔ جو ان کی پہچان ہے یہ چھڑی ان کے والد شومور نجن کی ہے جو ورثے میں ان کو ملی ہے۔ اس چھڑی کے بغیر وہ خود کو منصف نہیں سمجھ پاتے۔ گووندان کا منہ چڑھا اور خاص ملازم ہے۔ دم کے ساتھ لگا ہوا۔ کون سا وقت ان کے کھانے کے لیے مقرر ہے، کہاں کہاں جانا ہے؟ کون سا لباس موزوں رہے گا؟ کس موسم میں کس پانی سے غسل کرنا ہے؟ سر دی ہو تو نیم گرم اور موسم گرم ہو تو خوشبودار ٹھنڈا پانی۔ کس مرض کے لیے ڈاکٹر نے کون سی دوا تجویز کی ہے؟ کتنی رات گئے انھیں سو جانا ہے اور کتنے سویرے انھیں جاگنا ہے، یہ سب بھی۔ گووند نہ ہو تو پتہ نہیں رائے بہادر شور نجن چودھری کا کیا ہو۔ اس حویلی میں بس یہی دو فرد ہیں۔ ملازم رکھیں بھی تو کس کے لیے؟ مالی، بھنگی اور صفائی کرنے والے ملازم گنتی میں نہیں آتے بیٹا شہر میں رہتا ہے اعلیٰ تعلیم پا رہا ہے۔ چھٹی کے چھٹی حویلی آتا ہے تب حویلی ایکدم جاگ اٹھتی ہے۔ صرف نرل کے وجود سے نہ صرف حویلی جگمگا کر زندگی کی نوید دیتی ہے بلکہ شور نجن چودھری کی رگوں میں حیات سے بھرپور خون گردش میں آجاتا ہے۔ گووند بھی ایک دم بہت مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ نرل سے مانوس بھی تو بہت ہے۔ آخر بچپن سے جوانی تک ساری دیکھ بھال اسی نے تو کی ہے ما لکن تو کب دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ نرل کو پتہ ہی نہیں اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی اپنے بابو کا مسکراتا ممتا سے چھلکتا چہرہ ہی دیکھا تھا یا پھر گووند کی چھاتی پر چڑھ کر یا اس کی گود میں بیٹھ کر اپنا بچپن بتایا تھا۔ اس کا مخصوص لمس آج بھی نرل کو بچپن کی انگنائی میں دوڑائے پھرتا ہے۔ اسی لیے جب بھی اپنی پڑھائی سے فرصت ملتی ہے، وہ بھاگ آتا ہے اپنی حویلی میں۔

رائے بہادر شور نجن چودھری کے سامنے آج کئی مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل کو انھیں حل کرنا ہے اور فیصلے دینا ہیں ایسے فیصلے جن سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

گووندان کی کرسی کے پیچھے ٹھیک دائیں طرف کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری ہے۔ جس میں تمام فریادیو ں کے نام لکھے ہیں۔ ایک ایک کر کے گووند نام پکارتا ہے۔ فریادی اپنی اپنی باری پر آکر دکھڑا بیان کرتے ہیں۔ چودھری اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ ضروری ہوا تو گووند کو ہدایت دیتے ہیں کسی کے گھر اناج نہیں ہے تو اناج کسی کو روپے پیسے کی ضرورت ہے تو وہ بھی کسی کو سردی میں گرم لحاف چاہیے، وہ بھی کسی کی لڑکی کا شادی بیاہ رُکا ہوا ہے تو کسی کی زمین پر کسی طاقتور نے قبضہ جما لیا ہے تو اسے بھی حاضر ہونا ہے اور پھر چودھری جی اپنی اس آبنوسی چھڑی کا بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر مجال کیا کہ قابض نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت کرے۔ اسے کمزور کی زمین چھوڑتے بنتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ چودھری اسے مایوس نہیں لوٹاتے در پردہ اس کی

بھی ضرورت پوری کر دیتے ہیں جو فیصلہ ان کی زبان سے نکلتا ہے اسے نہ ماننے کی جرأت کوئی اپنے اندر نہیں پاتا۔

اور پھر گووندنے ہری پد ہالدار کی جورو کا نام پکارا۔

ہری پد ہالدار کی جورو آگے آئی، دور سے ہی چودھری کی قدم بوسی کی۔ چودھری نے نظر اٹھا کر عورت کو دیکھا۔ بوسیدہ ساڑی میں لپٹی سہمی فاقہ زدہ سی مدقوق عورت آنکھوں میں سوال کرتی حیا، گال اندر دھنسے ہوئے۔۔ ''ہری پد کو میں جانتا تھا بھلا آدمی تھا کہو کیا کہنا ہے؟''

''مالک یہ میرا بیٹا مجھے دو جون کی روٹی، کپڑا لتا دینے سے انکاری ہے'' اس نے ہاتھ جوڑ کر ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھ جوڑے چہرے پر حویلی کا خوف سمیٹے ہری پد کی جورو سے دو قدم آگے کھڑا ہے۔

''کیوں رے۔ تو کیوں انکاری ہے؟

''مالک اس کا باپ جب مجھے بیاہ کر اپنے گھر لایا تو میرا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ایک بچہ میری گود میں ڈال بولا سن اگر تو میرے خون کو منظور کرلے گی تو میں بھی تجھے قبول کرلوں گا تو سرکار، اس گل گوتھنے بچے کو میں نے چھاتی سے لگا لیا۔ اس کا گو موت کھانا دانا سب کیا۔ اپنی کوکھ سے نیا جیو نہیں پیدا ہونے دیا۔ اور آج۔ باپ کے مرتے ہی مجھے گھر دوار سے بے دخل کر دینے کی بات کرتا ہے''۔ ہری پد کی عورت پھپک کر رو پڑی۔

''کیوں رے؟ کس لیے کر رہا ہے یہ سب۔۔؟

''کیوں کہ یہ میری ماں نہیں ہے یہ میرے باپ کی دوسری عورت ہے''۔

''پر اس نے تیاگ کیا، اپنی کوکھ ساری عمر سوکھی رکھی کس کے لیے؟ ارے پگلے۔ یہ سب نعمتیں دینے والا تو وہ خالق ہے وہ نہ دے تب۔۔'' چودھری کے لہجے میں درد سمٹ آیا'' ارے مورکھ۔ زبان بھی بتیس دانتوں کے بیچ رہتی ہے۔ دانت اسے نکال نہیں ڈالتے اور تو ماں کے آنچل، چھایا سے خود کو محروم رکھنا چاہتا ہے؟ سن رکھ یہ عورت ہر پد کی جورو ہی تیری ماں ہے اور اس کی چتا کو اگنی دینے کا حق بھی صرف تجھے ہے۔ جا۔ آج کے بعد کوشش کر کہ پھر اس کچہری میں اس عورت کو مدعی بن کر نہ آنا پڑے۔''

فیصلہ ہو گیا۔ لڑکے نے سر جھکا لیا ہری پد کی جورو کے پاس آیا اس کا بازو تھاما اور کچہری سے نکل گیا۔

یہ سب تو ایک دن شور نجن چودھری کے ساتھ بھی گھٹنا ہے انھیں بھی اپنی ہی کچہری میں کھڑا ہونا ہے۔

حویلی کے صحن میں ابھی اور بھی فریادی ہیں۔ سورج بلند ہو گیا ہے۔ دھوپ صحن میں اتر آئی ہے ابھی کئی فیصلے کرنا باقی ہیں۔ تب بیچ میں ہی گووند، چودھری کو ٹوکتا ہے'' مالک۔ آپ کیا یہی سب کرتے رہیں گے؟ دیکھیے تو کتنا وقت بیت گیا۔''

''ہاں سو تو ہے پر ابھی اور بھی فریادی ہیں پہلے ان کی سُن لوں'' ''آپ کو اور بھی جگہ جانا ہے۔۔۔

''اور بھی جگہ؟ کہاں؟''

''چھوٹے مالک کے اسپتال کے لیے جگہ جو دیکھنا ہے''

''ارے ہاں وہ تو میں بھول ہی گیا پر وہ انجینئر صاحب۔؟''

''وہ تو بہت دیر ہوئی آ گئے ہیں''

چودھری نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ انجینئر صاحب ہاتھ میں موٹی سی فائل دبائے کچہری کی کارروائی ختم ہونے کا

انتظار کر رہے ہیں۔

"گووند سب کو جانے کے لئے کہہ دو نرل کے ہاسپٹل کی عمارت جتنی جلد بن جائے اتنی جلد میرا فرض پورا ہو"۔ چو دھری یکلخت کھڑے ہو گئے آبنوسی چھڑی ہلاتے ہوئے گووند سے مخاطب ہو کر انجینئر صاحب کی طرف چل پڑے۔

اس علاقے میں کوئی بڑا ہاسپٹل نہیں ہے۔ چودھری ایسا ہاسپٹل بنانا چاہتے ہیں جو علاج کی تمام جدید سہولتوں سے مزین ہو اور بڑی بیماری میں بھی مریض کو شہر نہ بھاگنا پڑے، عمارت کے لیے جگہ تجویز ہو چکی ہے۔ تعمیر کے تمام مراحل طے پا چکے ہیں۔ چودھری خوش ہیں۔ نرل کے ڈاکٹر بنتے ہی وہ اسے اس عمارت کی شکل میں لاجواب تحفہ دینا چاہتے ہیں۔

نرل شہر کے سب سے بڑے میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ جتنا اسمارٹ ہے اتنا ہی ذہین بھی ہے۔ صاف ستھر اکردار اپنے نام کے معنی جیسا نرل، شیتل، ہنس مکھ اور دل موہ لینے والی شخصیت اور اوصاف حمیدہ کا مالک۔ آخر سرلا ایسے ہی تو اس کی دوست نہیں بنی ہوگی۔ سرلا کا شمار کالج ہی نہیں، شہر بھر کی حسین لڑکیوں میں ہوتا ہے اور یہ دوستی، فرینڈ شپ سے گزر کر محبت اور پھر عشق میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہیں۔ شادی کے پاک رشتے میں بندھ کر ساری زند گی ساتھ نباہنا چاہتے ہیں۔ انتظار ہے تو میڈیکل کی تعلیم ختم ہونے کا۔ ڈاکٹر بن کر اپنے ملک میں ہی پریکٹشنر بن کر لوگوں کی خدمت کرنے کا جذبہ ہے دونوں میں۔ ایم بی بی ایس کے بعد فزیشین یا سرجری پر انحصار نہیں کریں گے۔ کھوج کریں گے نئی دواؤں کی ریسرچ کریں گے ایسی میڈیسنز کی جو موذی اور جان لیوا امراض میں کارگر ثابت ہو سکیں۔

برہم راج چودھری، بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ۳۰ لاکھ آبادی والے شہر میں ہی نہیں سو کروڑ آبادی والے اس ملک میں بھی ان کی شہرت ہے کب کہاں کس صوبے کے کس شہر میں ان کی ضرورت پڑ جائے، انھیں بلایا جاتا ہے ایئر کرافٹ ہو تو یا پھر فاسٹ ٹرین کے اے سی کوچ میں ان کو جانا ہوتا ہے۔ واپسی ٹکٹ کے علاوہ کنسلٹنگ فیس میں موٹی رقم ملتی ہے۔ جب وہ شہر سے باہر جاتے ہیں تو ان کے میڈیکل سنٹر کو ان کے جونیئر ڈاکٹر دیکھتے ہیں۔ ۱۵۰ بستروں والا اور تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ان کا میڈ یکل سنٹر شہر کے انتہائی پوش اور پُر فضا مقام پر ہے۔ یہاں مریض کا ایڈمٹ ہونا آسان نہیں ہے۔ مہنگا تو کیا ہوا۔ ہر مریض یہیں علاج کرانا چاہتا ہے مگر یہ بھی گارنٹی ہے کہ اس مرض میں مریض کو پھر سے نہیں آنا ہوگا۔ ڈاکٹر برہم راج چودھری ایسے مر یضوں کی نفسیات سے خوف واقف ہیں ایسے لوگ فیس دینے میں نہیں چوکتے۔ ڈاکٹر برہم راج علاج کرنے میں بے حد ایما ندار ہیں۔ اس سے ہٹ کر میڈیکل سنٹر کا ایک فلور پوری طرح چیری ٹیبل ہے اس فلور پر وہ مریض داخل کیے جاتے ہیں جو کسی پوش کیمونٹی کو بلانگ نہیں کرتے۔ وہ جیب موٹی رقم سے ہمیشہ محروم ہی رہتی ہے۔ اس چیری ٹیبل میں بھی وہی سہولتیں مہیا ہیں جو دیگر فلورز پر ہیں، یہاں بھی علاج میں کوئی کوتاہی نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ ایک اور وصف بھی برہم راج چودھری میں ہے وہ وصف ہے ان کا خاندانی وقار۔ ان کے والد اور ان سے بھی پہلے ان کے دادا پردادا اور ان سے بھی پہلے ان کے جدّ امجد، کسی نے بھی اپنے خاندانی اوصاف کو قربان نہیں کیا۔ سخت سے سخت حالات میں بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور یہ وصف ڈاکٹر برہم راج میں بھی موجود ہے۔ گوتر، ورکت اور ونش یعنی خاندانی نجابت اور اعلیٰ نسبی، ان روایتی اصولوں پر وہ بھی کاربند ہے لیکن صرف اپنی ذات تک۔ اسی لیے جب ان کی بیٹی سرلا نے نرل کو پسند کیا تو ڈاکٹر برہم راج نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فخر ہوا انھیں کہ ان کی بیٹی نے اس نوجوان کو اپنی زندگی کا ساتھی چُنا جو ہر لحاظ سے خاندانی ہے۔

سرلا ڈاکٹر برہم راج کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اکلوتی اس معنی میں بیٹی ایک ہی ہے۔ دو بیٹے بھی ہیں جو امریکہ میں سیٹلڈ

ہوکر بڑے عہدوں پر فائز ہیں کبھی آتے ہیں ماں باپ سے ملنے اور جب بھی آتے ہیں، ڈاکٹر برہم راج چودھری کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے بیٹوں کی اولادوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو انھیں کسی بھی چہرے میں خاندانی وجاہت، نجابت کی رمق اور اپنے خون کی روشن چمک نظر نہیں آتی۔ پھر وہ دل کو تسلی دے کر خود کو شانت کر لیتے ہیں کہ خاندان تو باپ سے ہی چلتا ہے۔

ہاں تو یہ وہی حویلی ہے جہاں کبھی انگریزوں کا ایک معزز خاندان پناہ گزیں ہوا تھا اور جس کے صلے میں اس حویلی کو وہ باوقار مقام حاصل ہوا تھا جو دور دور تک کسی زمیندار، تعلقہ دار یا کسی جاگیردار کو نہیں مل پایا۔ یا تو وہ دن حویلی کے لیے خوشگوار ماحول پا کر تابناک ہوئے تھے یا آج۔ برسہا برس بعد یہ حویلی پھر سے تابناک ہوئی تھی مسکرائی تھی۔ اب گووندا کیلا نہیں رہا تھا۔ اس کی ماتحتی میں نوکروں کی ایک پوری ٹیم رائے بہادر شورنجن دھری نے کر دی تھی۔ حویلی کے ایک ایک دروازے اور ایک ایک ستون کو چمکایا گیا ہے۔ ضروری جگہوں پر پرانے قالین ہٹا کر نئے قالین بچھائے گئے ہیں۔ فانوسوں کے شیشے میپورٹیڈ کیمکلس سے صاف کیے گئے ہیں اور ان میں موی شمعوں کی جگہ رنگین بلب لگائے گئے ہیں۔ فرش پر آسٹریلین قالین بچھایا گیا ہے کہ چلنے والا خود کو آب رواں پر محسوس کرے۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ نرمل نے تعلیم کے اختتام کے بعد ہاؤس جاب کا مرحلہ بھی طے کر لیا ہے۔ حویلی سے تین کوس کے فاصلے پر ایک پُر فضا پہاڑی پر ہسپتال کی عمارت تعمیر ہو کر تمام ضروری مشینوں اور آلات سے آراستہ کر دی گئی ہے۔ چار منزلہ یہ عمارت آرکیٹیکٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ عمارت کی سب سے بلندی پر ایک بورڈ آویزاں کیا گیا ہے جس پر ۱.۶ کے چمکدار پیتل کے حروف میں نرملا چودھری میموریل ہاسپٹل لکھا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ تین طرف نیون سائن بورڈ بھی لگائے گئے ہیں جو رات میں نیلی سرخ اور سبز روشنیوں سے جگمگا کر میلوں دور سے اعلان کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ یہ ہسپتال کی عمارت ہے۔ کل ہاں کل ہی تو اس ہسپتال کا افتتاحی فنکشن ہے۔ دعوت نامے تقسیم ہو چکے ہیں کس کو بلانا ہے کس کو نہیں۔ کون کہاں بیٹھے گا کس کی نشست کس سے پہلے ہوگی یہ بھی، کون سا ہار کس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ کون شورنجن چودھری کے خاندان کا تعارف کرائے گا۔ اور کون اس ہسپتال کی افادیت پر روشنی ڈالے گا یہ سب طے پا چکا ہے اور یہ سب ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر برہم راج چودھری کے تعاون سے جو عنقریب اپنی بیٹی کے توسط سے اس خاندان کے اہم فرد ہونے جا رہے ہیں۔ اسی فنکشن کے فوراً بعد حویلی کے وسیع و عریض صحن میں غیر رسمی تقریب رکھی گئی ہے جہاں دونوں کی شادی کا اعلان بھی کیا جائے گا۔ چودھری ہر کام سے مطمئن ہیں آج جیسے وقت تھم سا گیا ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں ہے۔ نوکر اپنی ذمے داریاں ایمانداری سے پوری کر کے جا چکے ہیں۔ البتہ ایک گووند ہے جو کبھی تھکتا نہیں۔ چودھری کے لبوں پر پُر آسائش مسکراہٹ کھل اٹھی۔ راہداری طے کر کے انھوں نے آج اپنی لائبریری میں قدم رکھا ہے۔ دیواروں سے لگی ہوئی قد آدم الماریوں میں نایاب کتابوں کو سلیقے سے لگا دیا گیا ہے۔ شورنجن چودھری الماریوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس مخصوص الماری کے پاس جا ٹھہرے، جس میں ان کے خاندان کی سوانحی کتب اور کئی جلدوں پر مشتمل فوٹو البم رکھی ہوئی ہیں۔ شورنجن چودھری نے ایک البم منتخب کر کے نکالی۔ اس کی مخملی جلد پر ہلکے سے ہاتھ پھیرا آنکھوں میں نرم جذبوں کی چمک اور چہرے پر خواب زار۔ روش پر پھیلتی چاندنی، جیسے تاثرات جاگ اٹھے۔ ان کے بزرگوں کی تصاویر والد، ماں، بہن، دادا، پردادا، الماری بند کر کے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر انھوں نے البم کا پہلا صفحہ کھولا۔ رشتوں کی ڈوری سے بندھے تمام اہم کرداروں کی تصاویر ورق ورق چسپاں کی گئی ہیں۔ پھر ہے خود ان کی فوٹو، پھر ہے نرملا چودھری کی تصویر۔ شورنجن چودھری کی انگلیاں اس تصویر کی چھونے لگیں۔ ہونٹو

ل، رخساروں، آنکھوں، پیشانی، اور پھر بالوں پر۔ مانو نرملا ان کی بیحد نزدیک ہو اور وہ اس کے قرب سے مدہوش ہوئے جا رہے ہوں، آہٹ ہوتی ہے۔ چودھری خیالات سے چونک کر دیکھتے ہیں کوئی نہیں ہے۔ شاید ان کے وہم نے انھیں چونکا دیا ۔ورق اُلٹتے ہیں۔ نھا نرمل۔ بچپن لڑکپن اور پھر جوانی کی تصاویر۔ اب ان تصاویر میں ایک تصویر کا اور اضافہ ہو جائے گا وہ ہستی ہے سرلا برہم راج کی جو نرمل سے شادی کے بعد اس حویلی کے ساتھ اس البم میں بھی جگہ پا جائے گی۔ اچانک پھر آہٹ ہوتی ہے۔ چودھری دیکھتے ہیں۔ اس دفعہ واہمہ نہیں ہے۔ گووند دروازہ کھول کر اندر آ چکا ہے۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے گووند کو دیکھا وہ۔۔۔۔ وہ سالے صاحب آئے ہیں۔

"کون سالے صاحب؟"

"لوکیش بابو۔ آپ کے سالے صاحب۔۔" وہ اس طرح چونکے کہ ہاتھ سے البم چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ شاید ایٹم بم گرنے کی خبر نے بھی چرچل کو اس طرح نہیں چونکایا ہوگا۔ گووند نے آگے بڑھ کر البم اٹھا کے چودھری کو دینا چاہی لیکن چودھری کے ہاتھ تو کرسی کے ہتھوں پر ہیں اور نگاہیں خلا میں کھوئی ہوئی "وہ کیوں آیا ہے؟"

یہ سوال گووند کے لیے نیا نہیں ہے۔۔۔ یہ سوال اس وقت بھی پوچھا گیا تھا۔ جب لوکیش بابو پچھلی بار اس حویلی میں آئے تھے مگر اُسے تو بہت زمانہ بیت گیا۔ شاید کئی مہینے یا ایک آدھ سال۔ "وہ کیوں آتے ہیں؟" "یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی، گووند نے البم میز پر رکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔" "لیکن ایسے وقت، جب۔" آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے تو چلتا کر دوں" کچھ دے، دلا کے؟" ہاں یہ تو کرنا ہی ہوگا لیکن ایسے نہیں گووند۔ انھیں اندر لاؤ" گووند حکم کی تعمیل میں باہر چلا گیا اور شورنجن چودھری کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ لمحہ بھر بعد ہی گووند کی ہمراہی میں لوکیش بابو آ گئے۔ اونچا پورا قد، گندمی رنگ چوڑی چھاتی، آنکھیں خمار آلود لانبی پلکوں تلے مسکراتی ہوئی۔ سفید کرتا کلف شدہ، آستینوں پر چنٹیں پڑی ہوئی سفید کرتا دھوتی اور دھوتی کا پلو دائیں ہاتھ پر پڑا ہوا۔ انگوٹھیاں، بال تیل ڈال کر سلیقے سے جمائے ہونٹوں پر پان کی لالی اور پیروں میں پالش کیے ہوئے سلیپر "جیجا حضور" جانی پہچانی آواز نے چودھری کو نگاہیں اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ لوکیش بابو شورنجن چودھری کے حقیقی سالے ہیں ۔نرملا کے بھائی اور نرمل کے سگے ماما۔ دولت سے ان کی چاہت، بہت پُرانی ہے اور اسی دولت کے بوتے پر عورتوں سے یارانہ ۔لیکن دونوں ہی ان کی نہ ہو سکیں۔ ہمیشہ انھیں رقم کی ضرورت رہتی ہے۔ محنت سے کمائی کی ہوتی اور گھر بسایا ہوتا تو نہ عورت ہر جائی ہوتی اور نہ دولت بیگانی۔ سونا گاچھی، محبوب کی مہندی۔ مراد گلی، پارس اسٹریٹ، لکشمی ٹاکیز، جی بی روڈ کبھی لاہور کی ہیرا منڈی یا ہندوستان کا ہر وہ بازار جہاں عصمتیں بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔ لوکیش بابو نے عمر کے باون برس انھیں کوٹھوں کی سیڑھیاں چڑھتے اُترتے گذار دئے ہیں۔ کئی نوجوان تو لوکیش بابو کے آگے پیچھے صرف مشورہ کرنے کے لیے ہی گھومتے ہیں اور لوکیش بابو ان نادان دوستوں کی نادانی سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنی جیبیں گرم کر لیتے ہیں اور جب یہ نسخے بھی آمادۂ روزگار سے انحراف کر جاتے ہیں تو حویلی یاد آتی ہے۔ جس طرح حویلی کے دروازے ان پر کبھی بند نہیں ہوئے اسی طرح چودھری کی سخاوت بھی کبھی بند نہ ہوئی۔ شورنجن چودھری ایک رشتہ ہے جس کو بہت رازداری سے نباہتے چلے آ رہے ہیں۔

"کیوں آئے ہو لوکا بابو؟"

شورنجن چودھری کی آواز میں بلا کی سنجیدگی ہے۔

"اس در کا کتا ہوں جیجا حضور مگر حویلی کی رکھوالی کرنے نہیں آیا۔ جانتا ہوں اس حویلی پر فرنگی کا سایہ رہا ہے"۔

"پھر۔ کیا چاہیے؟" چودھری، جانتے ہیں کہ لوکیش بابو کو کیا چاہیے مگر وہ ان کے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔

"کچھ زیادہ نہیں۔ ہتھیلی میں کھجلی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے سُنا ہے بھانجا ڈاکٹر بن گیا۔ اس کے لیے ہسپتال بھی کھول دیا آپ نے۔"

"ہوں۔ دور رہ کر بھی ساری خبریں رکھتے ہو۔"

"ہماری یہ حویلی کل بھی عظیم تھی اور آج بھی اس کی عظمت برقرار ہے جیجا حضور۔ آپ نے وہ کہاوت تو سُنی ہوگی۔ نقا رے میں جتنی کساوٹ ہوگی۔ اس کی گونج بھی اتنی ہی دور تک خبردار کرے گی۔ آپ بھی اسی نقارے کی مانند ہیں جیجا حضور" گو وند نے دیکھا، ان کی آنکھوں میں لالچ کا خمار اُتر آیا ہے۔ لوکیش بابو کچھ اور انکشاف کرتے چودھری نے ماہر کھلاڑی کی طرح پینترا بدلا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"ارے تم کھڑے کیوں ہو، بیٹھو"۔ لوکیش گووند نے فوراً ایک کرسی لوکیش بابو کے نزدیک سرکاری۔ لوکیش بابو دھوتی اور کُرتے کو سنبھالتے ہوئے اس نفاست سے کُرسی پر بیٹھے کہ کرتے پر پڑی چنٹیں اور دھوتی میں دیا کلف نہ ٹوٹے

"ارے گووند سالے صاحب، بہت زمانے بعد آئے ہیں مہمان نوازی بھول گئے کیا؟" گووند اشارہ پاتے ہی چلا گیا اور چند لمحوں بعد مٹھائیوں، تازہ پھلوں اور خشک میوہ سے بھری ہوئی ٹرے اس نے لوکیش بابو کے سامنے رکھ دی۔ سیب، خوبانی ، انار، کے ساتھ خشک میوے اور مٹھائیوں کی خوشبو نے انھیں بے قابو کر دیا، بھوک ایکدم پیٹ سے اچھل کر حلق کی طرف دوڑ پڑی مگر بے صبری کا مظاہرہ کرنا انھیں نہیں آتا۔ انتہائی نفاست اور تکلف سے مٹھائی کا ایک پیس اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ مٹھائی بے حد نفیس اور اصلی گھی میں بنائی گئی تھی۔ منہ میں رکھتے ہی گھل گئی۔ انھوں نے سندیش اٹھایا اور وہ بھی منہ میں رکھتے ہی معد ے میں پہنچ گیا۔ جب مٹھائی کا ایک بڑا حصّہ بے حد سلیقے اور تکلف کے ساتھ معدے کی نذر ہو گیا تو بھوک کی تپش کو قدرے ٹھنڈک ملی۔ اب وہ پھلوں اور خشک میوے کی جانب متوجہ ہوئے۔ سیب اور خوبانی، بادام کی گری، پستہ اور کشمش ٹرے سے غا ئب ہوتی رہیں اور لوکیش بابو کے چہرے کو اور تر و تازہ کرتی رہیں۔ لوکیش بابو جب خوب اچھی طرح کھا چکے تو بولے "بہت دن بعد اتنی لذیذ مٹھائی کھائی ہے۔ اور یہ سندش۔ یہ کہاں سے منگوائے آپ نے؟ کیا؟ بہو بازار سے؟"

"نہیں سالے صاحب یہ تقریب کے لیے حویلی میں ہی بنوائے ہیں"۔

"حویلی میں ہی۔؟ واہ جب ہی تو میں کہوں، بہو بازار میں بکنے والے سندیش میں یہ لذت کہاں۔ ارے ہاں اس حویلی میں ایک تقریب بھی ہونے جا رہی ہے۔ سُنا ہے بڑے بڑے مہمان آرہے ہیں؟ سرکاری سیاسی، سماجی، پھر شیمپین بھی کھلے گی، ناچ گانا رقص موسیقی سے ایک بار پھر بال روم بہار دے اٹھے گا، شراب، کباب اور۔۔" کنکھیوں سے چودھری کو دیکھتے ہوئے انتہائی خباثت اور ڈھٹائی سے لوکیش بابو مسکرائے" کہیے تو شباب ہم لے آتے ہیں جیجا حضور" لوکیش بابو کے جملو ں میں طنز کمینے پن کی حد تک پوشیدہ تھا۔

"لوکا بابو اس حویلی نے اپنی روایت اور اعلیٰ نسبی کبھی نہیں جانے دی۔ یہ کم ظرفوں کا وطیرہ ہوتا ہے تم کس زمرے میں گنے جاتے ہو، اس کا اظہار ضروری نہیں۔۔"

"کیا واقعی؟" لوکیش بابو اپنی کرسی سے اُٹھ کر چودھری کے نزدیک آگئے اور دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر ٹکا کے انھوں نے چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اس حویلی نے کبھی اپنی اعلیٰ نسبی، اپنا گوتر، اپنا ونش اور وہ کیا کہتے ہیں۔ ہاں اپنا خون اپنی نجابت نہیں تیاگی۔ پر کیا کروں واجبی رشتہ جو ہے میرا آپ سے جیجا حضور لیکن جو بھی رشتہ ہے، بہت مستحکم ہے"۔

انھوں نے کرسی سے اپنے ہاتھ جدا کیے اور سیدھے کھڑے ہو کر اپنی انگلیوں میں پہنی انگوٹھیوں کو منہ کی بھاپ دے کر کرتے سے رگڑنے لگے۔ ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں شیطانی شرارت نے چودھری کے وجود کو لرزا دیا۔ انھوں نے اپنی نگاہیں پھیرلیں۔ لوکیش بابو دیوار پر آویزاں ایک بڑی سی تصویر کے سامنے جا ٹھہرے یہ تصویر چودھری اور نرملا کی جوانی کی تصویر ہے۔ نرملا کرسی پر بیٹھی ہے اور چودھری کرسی سے لگے کھڑے ہیں۔ بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ہے دونوں کے لبوں پر۔ نرملا کی گود میں ایک معصوم بچہ بیٹھا ہ لوکیش ان کا سارا دھیان چودھری کی طرف ہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ فتح ان کی ہوئی ہے دھوتی کا پلّو ہاتھ پر ڈال کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ چودھری نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔ انھوں نے گووند کی جانب دیکھا گوونداں کی نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ فوراً تجوری سے نوٹوں کی گڈی نکال لایا اور چودھری کی طرف بڑھا دی چودھری نے گڈی لے کر لوکیش بابو کے آگے ڈال دی۔ لوکیش بابو نے گڈی کو ایک نظر دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا وزن کیا اور چودھری کی طرف دیکھ کر بولے۔۔۔۔ "سُنا ہے، بھانجے کا رشتہ اونچے گھرانے میں کردیا ہے، وہ کیا نام ہے سمدھی صاحب کا۔ ہاں۔ یاد آیا۔ برہم راج چودھری بڑے ڈاکٹر ہیں۔ واہ دو چودھری خاندان رکت، گوتر، ونش، حسب، نسب سب ایک ہی، پر جیجا حضور۔ نرمل میرا بھی کچھ ہے۔ اس کی ماں میری ماں جائی تھی۔ اس ناطے میرا اس پر کچھ حق بنتا ہے"

"تمھارا کوئی حق نہیں بنتا"۔ شورنجن چودھری غصّے سے کانپ اٹھے۔ "تم اپنی ناپاک اور ذلیل حرکتوں سے سارے ناطے توڑ چکے ہو یہ حویلی اور میں اگر تمھیں نوازتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ مت سمجھنا کہ نرمل پر تم اپنا کوئی حق جتا سکو گے سمجھ گئے تم"۔ "میں تو سمجھ گیا۔ مگر اب آپ کے سمجھنے کی باری ہے۔ جیجا حضور"

"تم مجھے سمجھاؤ گے؟ تم۔۔۔؟" لوکیش بابو۔ صحیح وقت پر چوٹ مارنے میں ماہر ہیں۔ چودھری کا غصّے سے بھڑک جانا ہی ان کی جیت ہے، نبض اور نفس کا بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ نبض پہچان کر نفس کو ٹھیس دینا لوکیش بابو کے مؤثر اسلحہ میں ۔ انھوں نے نوٹوں کی گڈی کو اٹھا کر سونگھا اور گووند کی طرف دیکھ لو، لے نوٹ اصلی بھلے ہی صحیح۔ مگر جیجا حضور شاید آپ میرے اس وصف سے واقف نہیں ہیں؟"

چودھری کی سوالیہ نظریں ان کی جانب اٹھ گئیں "پنڈت ستاروں کی چال، ان کے اور نجس اثرات سے کنڈلیاں ملاتے ہیں لیکن آپ کا یہ خادم انسان کے مزاج، کیریکٹر، چال چلن، رکت، گوتر اور ونش کی جمع تفریق سے جوڑوں کی کنڈلیاں بناتا ہے جیجا حضور" گوونند۔ حکم کی دیر تھی گوونند نے دوسری گڈی پہلی گڈی کے برابر رکھ دی۔ لوکیش بابو نے دیکھا۔ دونوں گڈیوں کا جمع برابر ہے مسکرائے اور گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور بولے،

"پھر کب آؤں؟"

"کبھی نہیں سمجھو آج کے بعد اس حویلی سے تمھارا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا"۔

"رشتے تو اوپر والا بناتا ہے نہ آپ کے بس میں ہے ختم کرنا اور نہ میرے بس میں" کہہ کر دونوں گڈیاں اٹھا کر کُرتے کی جیبوں میں ٹھونسیں۔ مٹھی بھر چلغوزے اٹھائے، جیجا حضور کی قدم بوسی کی، گوونند کو طنز سے دیکھا اور باہر نکل گئے۔ چودھری نے خالی نظروں سے خالی دروازے کو دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ گوونند نے جگ سے گلاس میں پا

نی اُنڈیلا اور چودھری کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ چند گھونٹ حلق سے اتار کر گلاس لوٹا دیا۔ گرم مزاجی کو قدرے راحت ملی۔ سالے صاحب اب برداشت سے باہر ہو گئے ہیں، آپ ان کا خیال مت کیجیے۔ باہری ہواؤں سے گھر کثیف نہیں ہوتے'' شاید وگوند کا کہنا ٹھیک ہی ہے۔ انھوں نے گردن جھٹکی جیسے لوکیش بابو کو جھٹک دیا۔ اب وہ پہلے جیسے ہی شورنجن چودھری تھے۔ پرسکون اور پُر اعتماد۔

جشن خوب دھوم دھام سے ہوا۔ حویلی نے ایک بار پھر کئی رنگین اور سہانے موسموں کو اپنے آنگن میں مستی بھرے انداز سے اٹھلاتے دیکھا۔ چاندنی کے سبزہ زار پر نرم رات کی بانہوں میں، دن کی دوپہر کو کسمساتے محسوس کیا۔ صبح کی سہانی دھوپ کو شام کے سرگیں پہلو میں خواب زار کا مزا لوٹتے دیکھا۔ ہسپتال کا افتتاحی فنکشن ہوا۔ صدر جمہوریہ کے ہاتھوں سنگ افتتاح کی رونمائی کی گئی۔ عمائدین شہر، سماجی کارکن، سیاستداں میڈیکل دنیا کی نامور ہستیاں، وزرا گورنر اور صوبے کے وزیر اعلیٰ نے شرکت کی بہت مرعوب کن تقریب تھی صدر جمہوریہ افتتاح کے فوراً بعد ہی روانہ ہو گئے۔ پھر دوسرے جشن کی باری آئی اور یہ جشن حویلی کے اسی وسیع و عریض صحن میں منعقد ہوا جہاں کبھی انگریز آئے تھے ڈاکٹر برہم راج چودھری اپنے دونوں بیٹوں اور اہل خاندان کے ساتھ شریک رہے۔ اس جشن کی سب سے متاثر کن شخصیتیں ڈاکٹر نرمل رنجن چودھری اور ڈاکٹر سرلا برہم راج چودھری رہیں۔ پھر ہوا اس جشن کے سب سے اہم اور خوبصورت لمحہ کا آغاز سرلا اور نرمل کی منگنی اور اسی کے ساتھ اس حویلی کی روایت کے مطابق رائے بہادر کے خطاب کی منتقلی آخر رائے بہادر شورنجن چودھری کے بعد اس معزز خطاب کو ان کے اکلوتے بیٹے اور اس حویلی کے اکیلے وارث نرمل کو ہی تو جانا ہے۔ سارا ماحول تالیوں سے گونج اٹھا کھلتے مسکراتے اور زندگی کی تازگی سے دمکتے سرلا اور نرمل کے چہرے آج کچھ اور ہی بہار لٹا رہے تھے۔ ایک تاریک گوشے سے دو ہاتھ آگے بڑھے اور پاس سے گذرتے ہوئے باوردی بیرے کی ٹرے سے شراب کے دو جام اٹھائے ایک جام کی شراب دوسرے میں انڈیل کر ڈبل پیگ کیا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار لیا۔ یہ لوکیش بابو ہیں۔ ان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک ہے۔ جیسے آج ان کی فتح کا دن آپہنچا ہے۔ دھوتی کے پلو کو ہاتھ پر ڈال کر وہ نپے تلے قدموں سے اس طرف بڑھ چلے جہاں سرلا اور نرمل خوبصورت ڈائس پر رکھی کرسیوں پر بیٹھے اس لمحے کے منتظر ہیں جب رسم کے مطابق ان کی انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنا کر ایک دوسرے سے منسوب کر دیا جائے گا۔ سرلا کے نزدیک ہی ڈاکٹر برہم راج اور ان کی اہلیہ کھڑی، شورنجن چودھری کی آمد کے منتظر ہیں اور پھر۔ ایک جانب سے شورنجن چودھری اپنے خاندانی لباس میں ملبوس ڈائس کی طرف بڑھتے نظر آئے۔۔۔ شورنجن چودھری مسکرا مسکرا کر مہمانوں کی مبارکبادیں قبول کرتے ڈائس پر آکر بیٹھ گئے۔ چودھری نے مہمانوں کی جانب دیکھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ بینڈ بھی خاموش ہے۔ وزیر اعلیٰ، گورنر اور ساری محفل، جشن کی سب سے اہم رسم کو سانس روکے دیکھ رہے ہیں۔

چودھری نے مائک سنبھالا اور ان کی آواز سناٹے کو مرتعش کرتی چلی گئی !

''آخر کار وہ گھڑی آپہنچی۔ ہر باپ کی طرح میں بھی اس ساعت کا منتظر رہا ہوں۔ اس حویلی میں زنان خانہ بھی ہے لیکن صنف مخالف کی ہنسی سے محروم۔ الماریاں بھی ہیں مگر زنانہ لباس کی خوشبو سے انجان۔ باورچی خانہ بھی ہے لیکن لذیذ کھانوں کا ذائقہ جیسے بھول چکا ہے۔ فرش پر کسی کے نازک پیروں کی پازیب جھنکار بنکر نہیں گونجی۔ باغ میں ہر روز پھول کھلتے ہیں مرجھاتے ہیں اور ڈال سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں کبھی کسی نے انھیں توڑ کر اپنی چوٹی میں نہیں گوندھا۔ کسی وینی نے کسی سہا

گن کے سہاگ کو نہیں مہکایا۔ یہ حویلی تو جیسے سارے رسم ورواج بھول چکی تھی۔"

چودھری نے سانس لے کر جذبات پر قابو پایا۔ حاضرین محفل پر نظر ڈالی اور پھر بولے۔

"لیکن آج اس حویلی نے پھر زندگی کی دھڑکن کو محسوس کیا ہے۔ آج میرا وہ خواب پورا ہوا جسے دیکھتے میری عمر منزل کے آخری پڑاو پر آ پہنچی اور یہ سب میرے بیٹے اور اس حویلی کے اکلوتے وارث نرمل رنجن چودھری کی وجہ سے ہوا۔ آج وہ ڈاکٹر ہے۔ ابھی وہ صرف میرا بیٹا ہے۔ رائے بہادر شورنجن چودھری کا بیٹا اس حویلی اور چودھری خاندان کے وارث ہونے کے لیے چند ضروری رسموں کا ادا ہونا نہایت ضروری ہے۔ تمام قابل احترام مہمانوں کی موجودگی میں، میں رائے بہادر شورنجن چودھری اپنی تمام جائیداد یہ حویلی اور اس حویلی میں موجود ہر شے اپنے کلوتے بیٹے اور چودھری خاندان کے جائز وارث نرمل رنجن چودھری کو منتقل کرتا ہوں۔ اور اسی کے ساتھ اپنے نام سے رائے بہادر کا خطاب ہٹا کر نرمل رنجن شودھری کے نام کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں"۔

چودھری نے لحہ بھر رُک کر نرمل کی جانب دیکھا۔ ہلکے سے مسکرائے اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔

"آج سے وہ رائے بہادر نرمل رنجن چودھری کے نام سے پکارا جائے گا"۔ ماحول تالیوں سے گونج اٹھا۔۔ جب تالیوں کا شور تھما تو چودھری نے کہنا شروع کیا" یہ خطاب بے شک اس غاصب قوم کا دیا ہوا ہے جس نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا لیکن یہ خطاب مظلوم کی امداد اور انسان کو انسان کے ہی استبداد سے بچانے کے صلے میں دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ خطاب آج بھی ہمارے خاندان کے لیے معزز ہے۔"

چودھری نے گووند کے ہاتھ پر رکھے طشت سے سرپوش ہٹایا۔ خلعت کی سند اٹھا کر نرمل کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ماتھے پر ٹیکہ لگایا اور نازک سی خوبصورت جڑاؤ تلوار اس کی کمر سے باندھ دی۔

"عزیزو !!اس حویلی کو یہ فخر بھی حاصل رہا ہے کہ اس کے مکینوں کی رگوں میں کبھی باہری خون شامل نہیں ہوا۔ ونش، رکت اور گوتر۔ اعلیٰ نسبی اور نجابت کے اصول رہے ہیں۔ نرمل کا رشتہ بھی میں نے ایسے ہی خاندان میں طے کیا ہے۔ ڈاکٹر برہم راج چودھری ہماری ہی طرح اعلیٰ نسب ہیں" ڈاکٹر برہم راج چودھری نے مسکرا کر شورنجن کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر فخر سے زیادہ غرور ہے۔ لیکن ان کی اہلیہ نے اپنے دونوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کی طرف دیکھ کر گردن جھکالی۔ جو کوئی بھی محسوس نہیں کر سکا۔

ابھی شورنجن چودھری اور ڈاکٹر برہم راج چودھری اپنے خاندان کی اعلیٰ نسبی پر پوری طرح سب کو شامل بھی نہیں کر پائے تھے کہ۔ وہ ہو گیا جس کا امکان نہیں تھا !

"غلط بالکل غلط"۔

مہمانوں کے درمیان سے ایک آواز گونج اٹھی۔

سب کی نگاہیں اس آواز کی جانب اٹھ گئیں۔ !

لوکیش بابو، اپنے مخصوص انداز کے ساتھ شاید اسی نازک لمحے کے منتظر ایک جانب کھڑے تھے۔ مسکراتی آنکھیں، چہرے پر قتل کرنے کے سارے اوزار سجائے ڈائس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کسی کی نگاہ میں بھی شناسائی کی کوئی رمق نہیں جاگی۔

کوئی پہچان نہیں اُبھری۔ سب کے چہروں پر سوال تھا۔

''کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی رگوں میں کون سا خون دوڑ رہا ہے۔ دوستو! خون کا رنگ تو ایک ہی ہوتا ہے لال''۔
انھوں نے چند قدم ڈائس کی طرف بڑھائے۔
گووند کے ساتھ ہی چودھری بھی ہونٹ بھینچے لوکیش بابو کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''دوستو۔ میں آپ کے درمیان اجنبی ہوں لیکن یہ حویلی مجھے خوب پہچانتی ہے کیوں رائے بہادر صاحب۔ میں نے غلط تو نہیں کہا''۔
برہم راج چودھری نے ایک نظر لوکیش بابو کو دیکھا اور شورنجن سے پوچھ بیٹھے۔
''یہ سب کیا ہے چودھری صاحب کون ہے یہ شخص؟''
''ان سے نہیں ڈاکٹر برہم راج چودھری مجھ سے پوچھئے۔ لیکن میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ یہاں موجود ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی رگوں میں وہی خون گردش کر رہا ہے وہی لال رنگ۔ کیوں ڈاکٹر چودھری کیا آپ دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بچوں میں بھی وہی خون ہے اور اس خون کا رنگ بھی واقعی وہی ہے''
ڈاکٹر برہم راج کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ انھوں نے غیر فطری طور پر رومال جیب سے نکال کر پسینہ پونچھ لیا۔ دونوں بیٹوں کے چہروں پر بے حس مسکراہٹ ہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔۔ ان روایتی بندشوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
''لیکن آپ ہیں کون؟ اور اس محفل میں کیوں کر وارد ہو گئے؟'' کہیں سے ایک آواز اُبھری۔
''یہ میں بتاتا ہوں'' یہ آواز شورنجن چودھری کی ہے۔ سب کی نگاہیں ان کی جانب مرکوز ہو گئیں۔
''بھئی یہ ہمارے سالے صاحب ہیں لوکیش ناتھ چودھری۔ نرمل کے سگے ماما انھیں ہم نے مدعو نہیں کیا تھا۔ کر ہی نہیں پائے تھے۔ وجہ؟ ان کے پیروں میں دراصل ایسی ریکھائیں ہیں جو انھیں ایک جگہ ٹکنے ہی نہیں دیتیں۔ آج روم کل روس۔ اس کے بعد کہاں کچھ ٹھیک نہیں۔ اسی لیے اس موقع پر انھیں دعوت نہیں دی جا سکی۔ کیوں نرمل بیٹا؟'' لیکن نرمل کی آنکھو ں میں تو خود سوال ہے۔
''وہ تو شکر کیجیے کہ سالے صاحب وقت پر شریک ہو گئے ورنہ نرمل کی ماں ہمیں کبھی معاف نہیں کرتی۔ سالے صاحب آپ کا آنا مبارک۔''
شورنجن چودھری نے جھپٹ کر لوکا بابو کو گلے لگا لیا اور کان میں پھسپھسائے۔
''روشنیوں پر تاریکی کا غلاف چڑھانے کی کوشش مت کیجیے سالے بابو''۔ شورنجن چودھری کی گرفت میں جوش اور اور خلوص مفقود تھا۔ البتہ طاقت کا مظاہرہ زیادہ تھا۔ یہ آج ہی لوکیش بابو کو اندازہ ہوا۔ ''یہ نہ بھولئے اس حویلی نے ہمیشہ آپ کا خیر مقدم کیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چوکھٹ آپ کے قدم ہی اُکھاڑ دے۔ پھر بلند آواز میں بولے آئیے۔ اب آئیے بھی۔ اپنے بھانجے اور بہو کو آشیرواد دیجیے''۔
اور لوکیش بابو شورنجن چودھری کی گرفت میں قید نئے جوڑے کو آشیرواد دینے پر مجبور ہو گئے۔
نرمل ایک خواب کے عالم میں لوکیش بابو سے ملا۔ ان کے قدم چھوئے۔ یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا کوئی ماما بھی ہے۔ وہ ماما کے چہرے میں اپنی ماں کے نقوش تلاش کرنے لگا۔ ایک خوشگوار ٹھنڈک کا احساس جاگ اُٹھا۔ یہ فطرت ہے کہ

آدمی زندگی سے جڑے گنے چنے رشتوں سے خود کو زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔

لوکیش بابو نے بھی ایسا ہی محسوس کیا۔ چہرے سے تو کم از کم یہی ظاہر ہو رہا تھا لیکن آنکھیں اس احساس کی نفی کر رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

شورنجن چودھری۔ تم اپنا داؤ تو کھیل گئے لیکن تم نے کچھ آسانیاں بھی مہیا کر دی ہیں مجھے اپنے بھانجے سے متعارف کرا کے۔

اور محفل یہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ بازیاں سیاست کی چالوں سے ہی نہیں عقل، ہوش اور سوجھ بوجھ سے بھی جیتی جاتی ہیں۔ اور شورنجن چودھری نے باون پتوں میں سے صرف جوکر لوکیش بابو کے ہاتھ میں رہنے دیا۔

شورنجن چودھری خوش تھے کہ انھوں نے ایک مشکل مرحلہ اپنی دوراندیشی اور سمجھداری سے حل کر دیا اور کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا کہ دوراندیشی اور سمجھداری کے درمیان جو نازک سا لمحہ آٹھہرا تھا اگر اس لمحہ کا تھوڑا سا بھی احساس انسانی ذہنوں کو ہو جاتا تو کیا شورنجن چودھری اس طرح اپنی فتح پر ناز اں رہ پاتے؟ کون جانے اس حویلی کی وہ ساکھ جو کوتر، رکت اور ونش کی بنیادوں پر کھڑی تھی قائم بھی رہ پاتی یا نہیں۔ اسی لیے باون پتوں میں سے صرف جوکر لوکیش بابو کی انگلیوں میں رہنے دیا۔

ہاں تو حویلی کا وہی وسیع و عریض صحن۔ وہی شورنجن چودھری کی اونچی کرسی۔ وہی ان کی آبنوسی چھڑی اور کرسی پر تمکنت سے بیٹھے شورنجن چودھری۔ فریادی اپنے اپنے مسائل لیے حاضر۔ اور وہی گووند، چودھری کے دائیں جانب کھڑا فریادیوں کے نام پکارتا ہوا۔

"ہرگووند۔"

"ہربیت رائے"۔

"شیامل ہالدار"

"علی رضا سین"

"حسن دتا"

"مہوا گوداوری"

"سودامنی بنرجی"

اور پھر گووند نے پکارا

"نرمل رنجن گھنک۔ رائے بہادر"۔

یہ کیا؟ یہ کون فریادی ہے؟

شورنجن چودھری کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ یہ تو انھوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوگا آنکھیں بند کیے وہ خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے منتظر ہوں کہ گووند کہے، اس سے نام پکارنے میں غلطی ہو گئی۔ وہ پھر سے پکارے نرمل رنجن گھنک نہیں، یہ تو شوبھنی گھنک ہے یا پھر کنال بھنجن ہے۔ لیکن نہیں۔ جو حقیقت ہے وہ آنکھیں بند کر لینے سے بھی حقیقت ہی رہے گی۔

شورنجن چودھری کے آگے ایک دن یہ سچ آنا ہی تھا۔ اور وہ دن آج۔ اس طرح فریادی کی شکل میں آئے گا، یہ نہیں سوچا تھا انھوں نے بہرحال سامنا تو کرنا ہی ہے۔ شورنجن چودھری نے آنکھیں کھولیں۔ اب ان کے چہرے سے سارا تناؤ

دور ہو چکا تھا۔ وہ پہلے جیسے ہی شورنجن چودھری ہو گئے۔ وہی منصف مزاج وہی ہمدرد۔ وہی نرم مسکراہٹ لبوں پر کھیلتی ہوئی۔

"گووند۔ یہ کسے لے آئے ہمارے سامنے؟"

"جی مالک یہ چھوٹے مالک ہیں۔ رائے بہادر نرمل۔"

"نرنجن گھنگ۔ گھنگ ہوں میں"۔ نرمل کی آواز مختلف تھی چہرے کے تاثرات بھی مختلف تھے۔

"گھنگ؟" چودھری نے دہرایا۔

"جی گھنگ"۔

"مگر تم تو رائے بہادر ہو۔ اس حویلی کے اکلوتے اور چودھری خاندان کے اکیلے وارث۔ ہمارے بعد اس کرسی پر بیٹھنے کے جائز حقدار۔"

"جائز حقدار۔ اکیلا وارث۔۔ چودھری خاندان۔ رائے بہادر۔۔ حویلی کی شان وشوکت"

"ہاں تم ہی ہو یہ سب"

"تو پھر میں گھنگ کیوں؟ آپ چودھری کیوں؟ رکت، ونش، گوتر آپ سے جدا کیوں؟ اگر میں ہی سب کچھ ہوں تو پھر میرا ماضی میرے حال سے مختلف کیسے ہو گیا۔"

"تو سالے صاحب نے تمھیں سب کچھ بتا دیا؟"

"ہاں۔ ماما جی نے ہی مجھے میری پہچان دی ہے"۔

"اس کا جواب تمھیں ملے گا۔ ضرور ملے گا مگر یہاں نہیں"۔

"میں فریادی ہوں"

"بے شک تم فریادی ہو لیکن عام فریادی نہیں۔ آؤ۔ آؤ میرے ساتھ تمھارے ہر سوال کا جواب آج تمھیں ملے گا"۔
اور شورنجن چودھری نرمل کو لیے ہوئے حویلی میں چلے گئے۔

دیوار پر نرمل کی ماں اور شورنجن چودھری کی بیوی نرملا دیوی کی بڑی سی آئل پینٹنگ فریم کی ہوئی ٹنگی ہے تازہ پھولوں کی مالا ہے اس پر۔ شیشے میں شورنجن اور نرمل کے عکس جھلک رہے ہیں۔

"برس گذر گئے۔ جب میں تمھاری طرح جوان تھا۔ تب شورنجن چودھری، میرے والد اس حویلی کے مالک تھے اور میں تمھاری طرح اُن کا وارث تھا مجھے یاد ہے" شورنجن چودھری، نرملا کی تصویر میں اپنی جوانی کے عکس تلاش کرنے لگے۔ دور ماضی ورق ورق ان کی آنکھوں کے کینوس پر متحرک ہوا تھا۔۔" مکتب کی ابتدائی تعلیم کا وہ دور، مکتب حویلی سے دور تھا۔ بگھی ہر روز مجھے مکتب لے کر جاتی اور پھر واپس لے کر آتی۔ اس مکتب میں ایک موٹی سی لڑکی بھی پڑھتی تھی۔ تب لڑکیاں لڑکوں سے الگ۔ فاصلہ دے کر بیٹھتی تھیں۔ اس لڑکی میں نہ معلوم کیسی کشش تھی کہ میں اسے ہی نہارتا رہتا۔ پڑھائی میں کم اور اسے دیکھنے میں مجھے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی مجھے چور نظروں سے دیکھ لیتی تھی اور پھر یہ کبھی کبھی ہر روز کا معمول بن گیا۔ کم سنی کی انسیت، لڑکپن کی محبت اور جوانی کا عشق ثابت ہوئی۔ ہم تنہائی میں ملنے لگے۔ محبت بے قراریوں میں بدل گئی نہ اسے چین نہ مجھے قرار"۔

شورنجن لمحہ بھر کو رُکے حلق میں آئی رکاوٹ کو کھنکار کر دور کیا اور پھر کہتے گئے!

"اور پھر وہ ہو گیا جس کا امکان ہم نے سوچا نہیں تھا۔ ہمارے عشق کی داستان حویلی کی گونج بن گئی۔ اس سے پہلے

کہ حویلی کی آبرو پر حرف آئے، ایک شریف، نیک اور بھلے انسان سے اس لڑکی کی شادی کردی گئی۔ وہ ایک اسکول میں ماسٹر تھا ۔آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ حویلی کا دبدبہ، ہیبت اور وقار سب نے ایک ہی کردار ادا کیا۔ دودلوں کے درمیان نجابت اور اعلیٰ نسبی کی دیوار اٹھادی گئی۔ ثابت کیا گیا وہ لڑکی اعلیٰ نسب نہیں تھی۔ اعلیٰ خاندان سے اس کا تعلق نہیں تھا اور اس کا خون وہ خون نہیں تھا جو حویلی کے مالکوں کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اور اس طرح محبت میں دھڑکتے، محبت کی گل پوش وادیوں میں پناہ تلاش کرتے دلو ں کو بے دردی سے روند ڈالا گیا۔ اُدھر وہ بے بس تھی۔ اُدھر میں بے بس تھا۔ دونوں اپنی بزدلانہ کمزوریوں میں محصور ہو گئے۔ تب شور نجن چودھری میری ہی طرح کچہری لگا کر بیٹھتے تھے لیکن میں اس کچہری میں فریادی بن کر کھڑا نہیں ہوسکا اپنی مجبور محبت کا احتجاج بھی نہیں کرسکا۔"

نرمل سحرزدہ سا یہ داستان سُن رہا تھا۔ نہ جانے کب سے شور نجن چودھری اس داستان کو اپنے اندر دفن کیے ہوئے تھے ۔آج نرمل نے اُس مردہ یا بظاہر سوئی ہوئی داستان کو جگادیا تھا۔ شور نجن چودھری کی نگاہیں اب بھی نرملا کی تصویر پر ٹکی تھیں۔

"اُس وقت میرے اردگرد کڑا پہرہ ہوا کرتا تھا۔ زبان بندی کا پہرہ اظہار مدعا کا پہرا۔ لیکن میرا جسم میرا اپنا تھا۔ میر ی سوچ میری فکر میری اپنی تھی اور میں نے صبر کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگالی۔ یہ میری خاموش بغاوت تھی۔ حویلی کا ایک مکین ہوتے ہوئے بھی سب سے بیگانہ ہوگیا۔ اپنوں میں رہ کر بھی غیریت کا ایک انجان احساس میرے حوصلوں کو پست کرتا گیا۔ رائے بہادر شومور نجن چودھری بیٹے کی شادی کی آرزو لئے وقت سے پہلے ہی دنیا چھوڑ گئے۔ ماں سدا کی بے زبان حویلی کی مریاداؤں میں جکڑی آنسوؤں کو اندر پیتی، کب راکھ ہوئیں، احساس ہی نہیں ہوا رائے بہادر کا خطاب مجھے ملا۔ کچہر ی کی کرسی پر بیٹھنے فریادیں سُن کر فیصلہ کرنے کا اختیار بھی مجھے حاصل ہوا۔ اور پھر۔ اسی کچہری میں میرا ایک بے بس۔ کمزور، لا غر اپنے ہی وجود میں سمٹی عورت سے سامنا ہوا۔ وہ خاموشی جو صبر کے پنجرے میں قید گمنام تقاضوں کی شاید منتظر تھی۔ اچا نک تجسیم پاگئی۔ صبر ریت کے ذرّوں کی طرح ہاتھ کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ وہ عورت اب بے سہارا تھی۔ شوہر زندگی کی سنگلاخ راہوں پر اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کی خودداری، نیکی اور ایمانداری اسے عذاب ناک فاقہ کشی میں مبتلا کرگئی۔ فاقہ کشی کا عذاب سہہ کر وہ تو چلا گیا لیکن اپنے پیچھے چھوڑ گیا ایک بے بس لاچار عورت کو کہ جاؤ اب تم اس دنیا سے اپنا خراج مانگو ۔اور وہ عورت میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اپنی تمام تر لاچار کیفیتوں کے ساتھ۔ اس کے اپنوں نے اسے ٹھکرادیا۔ اس کے ما ں جائے نے اسے دُھتکار دیا تو پھر وہ کہاں جاتی؟"۔

شور نجن نے اپنی سانسوں پر قابو پایا شاید وہ المناک کیفیت ان کے اندر پھر سے جی اٹھی تھی۔ انھوں نے تصویر سے رُ خ بدلا۔ اور کھڑکی کے قریب آٹھہرے نرمل نے دیکھا ان کی نظریں باہر کیاری میں لگے ہوئے پودوں پر ہیں جن میں سے ایک ننھا سا پودا قدرے مرجھا کر زمین کی طرف جھک آیا ہے۔ شاید مالی اسے ٹھیک سے پانی نہیں دے پایا نوخیز ہونے کی وجہ سے اسکی جڑیں زمین کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں۔

"اور پھر وہی ہوا جو کاتب تقدیر بہت پہلے لکھ چکا تھا۔ وہی ہوا جس کا صلہ ایک اذیت ناک زندگی بھوگنے کے بعد قدرت دینے کا فیصلہ کرچکی تھیں، میں نے فیصلہ کیا اور وہ عورت میری زندگی میں داخل ہوگئی۔ رائے بہادر شور نجن چودھری کی شریک زندگی بن کر۔ اس حویلی کی مالکن کی حیثیت سے اس نے پُروقار اور پُرآسائش زندگی کا آغاز کیا اور مجھے زمانے کی سا ری مسرتیں ایک ساتھ مل گئیں۔ نرملا جب اس حویلی میں آئی تو اس وقت اس کے ہمراہ ایک ناسمجھ اور معصوم بچہ بھی تھا"۔

انھوں نے پھر رُخ بدلا اور اب وہ ٹھیک نرل کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ان کی نظریں نرل کے چہرے پر تھیں۔نرم ،نمناک ،اور محبتوں، شفقتوں کی لو دیتی ہوئی نظریں "اور وہ بچہ تم تھے نرل۔بے شک تم میری اولا د نہیں ہو، بے شک تمہارے جسم میں چودھری خاندان کا خون نہیں ہے۔بے شک تمہارا نسب جدا ہے۔نرنجن گھنگ کے خون سے تمہارے جسم کی نشو ونما ہوئی ہے لیکن تمہاری توقیر تمہاری ترویج چودھری خاندان سے ہی ہوئی ہے۔میں نے.....ہاں تمہارے ہوتے اپنی اولاد پیدا ہونے نہیں دی۔ہاں میں نے نرملا اور نرنجن گھنگ کے بیٹے کو اپنا نسب اپنا نام دیا۔خون ایک نہ ہونے سے اعلیٰ نسبی کبھی کم نہیں ہوتی۔نرملا کو میں نے زندگی کی پہلی اور آخری سانس تک چاہا۔اسی لیے اس کے نام کی مناسبت سے تمہارا نام نرل رکھا تا کہ وہ ہمیشہ تمہاری شکل میں میرے نزدیک رہے۔بیٹے سماج معاشرہ اور ریت رواج میں جکڑے انسانوں کے نزدیک یہ کھوٹ ہو سکتا ہے لیکن درونا چاریہ کی طرح میں خود غرض نہیں ہوں کورو اور پانڈوؤں کے درمیان میں نے حد فاصل پیدا ہونے نہیں دی۔آہ ہم اونچے لوگ ہیں۔اونچی حویلی۔اونچا نام۔رائے بہادری، دولت، شہرت، شوکت، عزت کے پیچھے بھاگتے لوگ۔اسی لیے ہم اپنی کھال میں بٹے لوگ ہیں۔ہم اس ڈھول کی مانند بجتے رہنے والے لوگ ہیں جس کے خول پر چمڑا منڈھ دیا جاتا ہے ذرا سی ضرب پڑی اور گونج دے اٹھا بس یہ ہیں ہم لوگ! لیکن بیٹے... "

انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ نرل کے کاندھے پر رکھ دیے اور براہِ راست اسکی آنکھوں میں دیکھ کر بولے "تمہارے والد ٹھوس کردار کے مالک تھے نیک، پارسا اور خوددار اسی لیے چپ چاپ بنا آواز کے، آنکھیں موند گئے، چار کاندھوں کا سہارا بھی نہیں لیا، اسی لیے تم ہم سے بہتر ہو۔اسی لیے تم رائے بہادر کے خطاب اور اس حویلی کے جائز حقدار ہو نرل۔یہ تمام حقیقت لوکیش نے تم سے بیان نہیں کی ہوگی۔وہ ہمیشہ میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتا رہا۔اور میں ہمیشہ اس کے آگے کمزور ثابت ہوتا رہا۔مجھے اس وقت کا انتظار تھا۔جب اس نازک رشتے کی اصلیت سمجھنے کی صلاحیت تم میں پیدا ہو جائے۔اور وہ وقت۔وہ مناسب وقت آخر آ ہی گیا۔قدرت نے میری کاوش، میری نیت اور تمہاری ماں کے صبر کا صلہ دے ہی دیا اب۔اب فیصلہ تم کرو گے"۔

شورنجن چودھری نے اپنی نگاہیں نرل سے ہٹا لیں۔آبنوسی چھڑی اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔اپنی زندگی کے اُن سفری لمحات کو بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔تھوڑی دیر انھوں نے پھر نرل کو دیکھا آنکھوں میں ٹھہرا ہوا سوال تھا "کیا تم مجھے مکھیہ اگنی دینے کا فخر حاصل کرو گے یا"۔۔۔ چودھری نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

نرل اپنی آنکھیں فرشِ راہ کیے فکر میں غلطاں، سوچوں میں گم تھا۔اس کے اندر کشمکش جاری تھی۔آج تک وہ صرف رائے بہادر شورنجن چودھری سے واقف تھا۔اونچے آسن پر بیٹھا ایک متکبر شخص جسے اپنی اعلیٰ نسبی کا گھمنڈ رہا۔لیکن کہاں؟ آج ہی تو نرل نے اس شخص کو پہچانا۔آج ہی تو وہ چودھری کے اندر کے انسان کو جان پایا۔تاریکیوں کا کتنا کرب سہتا ہے، تب اُجالے کی تابناک رمق اس کے بطن سے پھوٹ کر ماحول کر منور کر پاتی ہے۔ شورنجن بھی ایسا ہی ایک اُجالا ہے۔

شورنجن چودھری کرسی پر بیٹھ چکے ہیں آبنوسی چھڑی دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے، گذرتے وقت کی مدھم آہٹ دل کے قریب دھڑکتی محسوس کر رہے ہیں۔آج وقت کیوں تیز رفتار نہیں رہا؟ دھیمے دھیمے آہستہ خرامی سے کیوں گذر رہا ہے؟۔

نرل نے آنکھیں اُٹھا کر شورنجن کو دیکھا۔آنکھیں سارے وجود سے پھسلتی اُن کے قدموں پر آ ٹکیں۔نرل قریب

آ گیا۔ دو آنسو ڈھلک کر چودھری کے قدم بھگو گئے۔ سارا جسم ان آنسوؤں کی ٹھنڈی لمس سے کانپ اٹھا۔ وقت تھما نہیں ،اس کی رفتار ٹھہری نہیں۔ نرمل نے ان کے قدموں پر اپنے دونوں ہاتھ ٹکا کر اپنا سر ان کی آغوش میں رکھ دیا۔ آہ اس سے بہتر۔ ں ایک بیٹے کا باپ کے لیے اس سے بہتر خراج عقیدت اور کیا ہوگا اور شورنجن چودھری نے محسوس کیا جیسے آج انھیں موکش حاصل ہو گیا۔

اور پھر برس بیت گئے !

شورنجن چودھری کی راکھ گنگا میں بہائی جا چکی ہے۔ نرمل کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے سرلا اور نرمل کے بالوں میں سفیدی اُتر آئی ہے۔ حویلی کے آس پاس کامپلیکس تعمیر ہو چکے ہیں۔ فلک بوس عمارتیں، فیکٹریاں، پختہ سڑکیں اور ان سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں اور ان گاڑیوں میں ٹھنسے ہوئے انسان۔ شور در شور۔ تھانے جوڈیشری، بلدیہ، کالج، کلکٹریٹ اور سب کچھ قائم ہو چکا ہے۔ انچ بھر زمین بھی اب خالی نہیں ہے۔ انسان کے مزاج میں اب ٹھہراؤ نہیں رہا۔ قناعت پسندی مفقود ہو چکی ۔تہذیب اور اقدار عجلت پسندی کی نذر ہو گئیں۔ لیکن حویلی کا دبدبہ اب بھی قائم ہے اب بھی لوگ آتے ہیں، اب بھی کچہری لگتی ہے۔ فرق صرف دن کا پڑ گیا ہے۔ اب کچہری ہفتہ میں صرف ایک بار لگتی ہے۔ اتوار کے اتوار۔ اب بھی فیصلے ہوتے ہیں ۔اب بھی فریادی ان فیصلوں کو مانتے ہیں۔ انصاف کی کرسی پر آبنوسی چھڑی لیے بیٹھے ہوتے ہیں رائے بہادر نرمل رنجن شودھری اور گووند کی جگہ آواز لگاتے ہیں لوکیش ناتھ عرف لوکا ماما !

”کل بھوشن“۔

”نصرت ہالدار کی عورت“۔

”حسنہ بی بی“۔

”بمل داس گھنک“۔

اور گھنک پر رائے بہادر نرمل رنجن چودھری چونک اٹھتے ہیں۔ بے اختیار ان کی نظریں فریادی کی طرف اٹھتی ہیں لیکن ان کے سامنے ہوتا ہے، ایک مدقوق، زمانے کا ستایا ہوا، غریبی کی مار سہتا ایک فاقہ زدہ چہرہ اور ان کے اشارے پر لوکا ماما اس کی جھولی میں ڈھیر ساری خیرات ڈال دیتے ہیں لیکن اس خیرات میں خیرات کا جذبہ کم، انسانی ہمدردی اور خلوص کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

سکوتِ دل کی بازگشت

گل بخت رانا اچھی پرسنالٹی کا مالک تھا۔ مردانہ وجاہت کا پیکر۔ شاید قدرت نے اسکے بعد ایسے پیکر بنانا ہی بند کردیئے ہوں گے۔ خوبروئی اور مردانہ کشش اُس پر آکے جیسے ختم سی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ صنفِ مخالف اسکے دامِ الفت میں گرفتار ہو کر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتی تھیں۔ گل بخت رانا میں ایک خصوصیت اور بھی تھی، وہ تھی اسکی بے حد جاندار اور بے حد دل کش مسکراہٹ۔ جب اسکے ہونٹ تھوڑے سے بھی وا ہوتے تو انتہائی متناسب دانتوں کی نقرئی کرنیں آسمانِ دہن سے خارج ہو کر مخاطب کو طرزِ تخاطب کی خوشبو سے منور کرتی چلی جاتیں۔ مخاطب اگر اسکے اپنے قبیل سے ہے تو صرف اسکے تاثر سے مرعوب ہوگا اور مخاطب اگر صنفِ مخالف ہے تو رات اسکی بے چین اور دن بے قرار ہو کر ہی رہتے تھے۔ وہ اپنے تمام اسلحہ سے بخوبی واقف تھا۔ اسی لئے جب بھی اسے جس کو اپنے قرب کی لذت سے آشنا کرنا ہوتا، ویسا ہی ہتھیار استعمال کرتا تھا ورنہ بڑی نفاست سے کترا کر نکل جاتا تھا کہ پلٹنا اور پلٹ کر دیکھنا اسکے نزدیک تضیع اوقات تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ میں بھی وہ بے حد نفاست سے کام لیتا تھا۔ یہ ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ایک لباس اگر ایک بار پہن لیا تو دوبارہ اسے پہننے کے قابل نہیں سمجھا۔ اسکا یہ ماننا تھا کہ لباس کو اگر سلیقے اور نفاست سے پہنا جائے تو وہ دوبارہ اور بتارا بھی پہنا جاسکتا ہے۔ لباس کی طرح عورتوں کے معاملات میں بھی وہ بے حد نفیس اور سلیقہ مند تھا۔ اپنی مردانہ وجاہت کا فائدہ اُٹھانا اسے بخوبی آتا تھا۔ لیکن جس طرح وہ لباس کی تراش خراش اور اسٹیچنگ پر دھیان دیتا تھا، اس سے کہیں زیادہ اسے عورتوں کی پرکھ تھی۔ باتونی عورتیں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ عورت وہی ذائقہ دیتی ہے، جسکی پیمائش میں سلیقہ برتا گیا ہو۔ کمر، سینہ، کولہے نہ ایک انچ آگے نہ ایک انچ پیچھے۔ نہ رتی بھر ابھار زیادہ نہ رتی ابھر ابھار کم۔ آنکھیں اور ناک کو وہ عورت کے چہرے کی کشش کا پیمانہ مانتا تھا۔ شاعروں نے عورت کے حسن پر جو کچھ بھی کہا ہو لیکن گل بخت رانا ان چند اعضاء کی تراش خراش اور پیمائش کو بے حد اہم مانتا تھا۔ اسکی حساس مردانگی کا جوش تبھی عبور پر آتا تھا جب ایسی کوئی عورت اسکی آنکھوں کے نیلگوں آسمان پر اپنی آتشی تحریر چھوڑ دے۔ ورنہ چکھنا تو دور وہ چھونا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ رنگ کا وہ قایل نہیں تھا۔ آبنوسی یا سیاہی مائل رنگ اسے بہت بھاتے تھے۔ بھڑکتے، چمکیلے اور سفید جھلکتے رنگ ایسے ہی تھے کہ کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے آدمی نے گھر کا کھانا کھالیا بس۔ اسکی مردانگی نے اسے یہ تجربہ بھی دیا تھا کہ ن سے اگر اسکا نقطہ نکال لو تو وہ اور بھی بامعنیٰ ہوجاتا ہے۔ کوئی بھی عورت اسکے سمپرک میں آکر نون غنّہ ہی بن جاتی تھی۔ پھر اسے صرف گل بخت رانا ہی سمجھتا اور اسکے معنیٰ جانتا تھا۔ دنیا کے لئے تو وہ بے معنیٰ ہوجایا کرتی تھی۔

گل بخت رانا سٹیزن رایل کلب کا لائف ممبر تھا۔ شہر کا یہ سب سے مہنگا کلب تھا جسکی ممبر شپ حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ انتہائی متمول، تاجر پیشہ اور بزنس ورلڈ کی باوقار اور معزز ہستیاں ہی اس کلب کی ممبر شپ حاصل کرپاتی تھیں۔ اسی لئے اس کلب میں بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ جو لوگ بھی آتے، اُن کا لائف اسٹینس، ان کی گفتگو اور لباس و رفتار سے جھلکتا تھا۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں خاصی تعداد میں اس کلب کی ممبر تھیں۔ ان میں شادی شدہ، متمول بیوائیں، دولت مند طلاق شدہ اور کنواریاں سبھی شامل تھیں۔ گل بخت رانا نے کافی اسٹڈی کے بعد اس کلب کی ممبر شپ حاصل کرنا اپنی

تشنہ آرزوؤں اور تشنہ تمناؤں کے لئے اہم سمجھا تھا۔ ایک ہی سیڑھی تھی جس پر چڑھ کر وہ بلندیوں تک پہنچ سکتا تھا اور بہت جلد اس نے بلندیوں پر پہونچنے کے ذرائع پائے۔

گل بخت رانا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جب گل بخت رانا نے اس جگمگاتے، دوڑتے، بھاگتے شہر میں قدم رکھا تھا۔ تب وہ صرف گل بختا تھا۔ دور دراز صوبے کی ایک نواحی بستی کا بدقسمت گل بختا۔ مقدر کی ستم ظریفی اور قدرت کی بے رحمی نے جب اس سے اسکی زندگی کا سارا اثاثہ چھین لیا اور سیلاب میں سب کچھ تباہ ہو گیا تو دیگر لوگوں کی طرح اس نے بھی ہجرت کو ہی تقدیر کا فیصلہ مان لیا۔ کیونکہ جب حالات سنگین، مقدر برگشتہ، زندگی بے منظر ہو جائے اور وقت عذاب نازل کر دے تو ہجرت ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ ہجرت میں حرکت ہے اور حرکت ہی تدبیر کے وسیلے سے بند دروازوں میں مقید روشنی کو باہر لاتی ہے۔ اور روشنی باہر آ گئی۔ پہلے پہل تو گل بختا نے اس شہر کو پہچانا ہی نہیں۔ وہ تو اس خطۂ ارض سے آیا تھا جہاں زندگی ایک پگڈنڈی سے شروع ہو کر دوسری پگڈنڈی پر ختم ہو جاتی ہے۔ بہت ہوا تو پہاڑی سلسلوں سے اترتے نشیب یا کسی کھیت یا کسی باؤڑی اور کنویں یا پھر چھوٹی چند دوکانوں پر مشتمل بازاروں تک۔ اس سے آگے زندگی کے کتنے رنگ اور تھے، گل بختا کی چھوٹی سی سمجھ واقف نہیں تھی۔ صبح، دوپہر، شام چہروں میں کوئی نیا پن نہیں۔ بس اڈا بھی بستی سے بہت دور تھا۔ وہ واقف ہوتا بھی تو کیسے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ دیہات کے اکلوتے اسکول ماسٹر نے اسے تعلیم سے ضرور آراستہ کر دیا تھا۔ جس نے اسے خود اعتمادی تو دی ہی تھی اس کے ساتھ اس نے دنیا کے جغرافیہ کو بھی کافی حد تک سمجھ لیا تھا مگر اس شہر کی عظمت نے تو اسے چکرا ہی دیا تھا۔ یہ تو جانتا ہی نہ تھا کہ اس شہر میں الفاروں لوگ بستے ہیں۔ پھر دنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس چھور سے اُس چھور تک۔ ایسیں کتنے لوگ ہوں گے؟ اسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں آ گیا ہے اور اب آ گیا ہے تو کہاں جائے؟۔۔ اُس نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی کو پلیٹ فارم پر رکھا اور اس پر بیٹھ کر انسانوں کی بھیڑ کو ایک طرف سے دوسری طرف اور دوسری طرف سے پھر پہلی طرف دوڑتے بھاگتے چیختے پکارتے اور آتے جاتے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا، اسکے بائیں کاندھے پر ہلکا سا دباؤ آ گیا ہے۔ اس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ایک خوش پوش شخص اسکے برابر کھڑا تھا۔ نظریں اُسے دیکھ رہی تھیں اور چہرے پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید کوئی اسے ٹھگنے آ گیا۔ مگر نہیں۔ ٹھگ ایسے نہیں ہوتے۔ پھر شاید ٹکٹ چیکر ہو گا۔ اس نے جلدی سے اپنی بنڈی میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اسکے آگے کر دیا۔ مگر اس شخص نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"لو۔۔ چائے پیو۔۔" اس نے پہلی بار دیکھا۔ اس شخص کے عقب میں ایک ویٹر ٹرے لئے ہوئے کھڑا تھا۔ ٹرے میں چائے کا کپ اور کچھ بسکٹ پلیٹ میں رکھے تھے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ تو بہت دیر سے بھوکا ہے۔ سارے سفر میں اس نے صرف ایک بار ہی کھانا کھایا تھا۔ وہ بھی چند پوریاں اور ساگ جو چلتے وقت ماسٹر جی نے اسکے ساتھ کر دیا تھا کتنے مہربان تھے۔ کتنے مہربان تھے وہ، لیکن وہ تو میرے اپنے تھے مگر یہ شخص؟۔۔ شاید مہربانوں کی کمی نہیں رکھی اوپر والے نے۔۔!

"کیا سوچنے لگے؟۔ لو یہ چائے پی لو اور بسکٹ بھی کھا لو"۔

اس نے چائے کا کپ اسکے ہاتھ میں تھما دیا اس نے چائے کے ساتھ چند بسکٹ لئے اور شکر گزاری سے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ کافی تباہی پیچھے چھوڑ آئے ہو؟"۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو قدرت دوسرا دروازہ کھول دیتی ہے۔میں ہی وہ دروازہ ہوں جو خود چل کر تمہارے پاس آگیا۔ہاتھ بڑھاؤ اور یہ دروازہ کھول لو"۔اس شخص کی باتیں اسکی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔وہ ہونقوں کی طرح اسکی شکل دیکھ رہا تھا۔"آشرم تو سمجھتے ہونا؟" بمبئی میں اس شہر میں ایک رفاہی ادارہ چلاتا ہوں۔یوں سمجھ لو تم جیسے مظلوم اور ستائے ہوئے نوجوانوں کو اپنے آشرم میں پناہ دیتا ہوں اور انہیں دنیا میں جینے اور زندہ رہنے کے گر سکھاتا ہوں۔ہر روز یہاں آتا ہوں اور تم جیسا خوبصورت، حسین اور مردانہ وجاہت۔میرا مطلب تم جیسا کوئی لاچار اور بے بس نوجوان مجھے مل ہی جاتا ہے۔کیا تم میرے ساتھ چلنا چاہو گے؟"۔اسکا لہجہ بے حد نرم اور مشفقانہ تھا۔گل بختا کو اسکے سحر میں گرفتار ہونا ہی تھا سو ہو گیا۔

جس کار میں وہ اسکے ساتھ بیٹھا وہ اس شخص سے بھی زیادہ مرعوب کن تھی اور پھر جس بلڈنگ کے پاس کار سے اترا اس بلڈنگ کی اونچائی۔اُف۔ایلی ویٹر جب انہیں لیکر اوپر روانہ ہوا تو شفاف شیشے سے اوپر سے نیچے کے سارے مناظر اسے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ آسمان کی اونچی سطح پر سوار ہو۔رہائش کے لئے اسے اچھا سا کمرہ دیدیا گیا۔پہننے کو لباس آگئے اور دو شخص اسکی تربیت پر مقرر کر دئے گئے جو اسے اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے، گفتگو کا سلیقہ اور ڈنر ٹیبل سے بیڈروم میں سلیپنگ بیڈ کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ماسٹر جی کی دی ہوئی تعلیم نے اسکے ذہن کو جو روشنی دی تھی آج وہ روشنی جھم جھم برس اٹھی تھی۔تھوڑی سی پرت ہٹی تو شخصیت میں چھپی مردانہ وجاہت کے شاہزادے پری خانوں کی داستان بیان کرنے لگے اور گل بختا سے گل بخت رانا بننے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

بہت جلد اس نے اس شخص کے متعلق بہت کچھ جان لیا۔مہارانا ٹوڈرمل سماج کی مختلف تنظیمیں اسکی سربراہی میں چلتی تھیں۔فلموں کو فائنانس کرنے کرنے کے ساتھ آرٹسٹ سپلائر بھی تھا۔قانون، سیاست اور شہری انتظامیہ میں وہ خاصا جانا پہچانا اور باوقار نام تھا۔مہارانا ٹوڈرمل۔اس نے تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا۔مغل بادشاہ اکبر کے نورتنوں میں ایک رتن راجہ ٹوڈرمل بھی تھے۔بہت باصلاحیت، ذہین اور سمجھ بوجھ نے ہی انہیں اکبر کے نورتنوں میں شامل کیا تھا جن کا نام تاریخ میں بھی عزت سے لیا گیا ہے۔پہلے وہ اسے بھی ایسا ہی رتن سمجھتا تھا مگر حقیقت اس وقت آشکارا ہوئی جب اُسے ایک کلب میں انٹروڈیوس کرایا گیا۔

وہ شام اسکی زندگی میں ایسی یادگار شام بن گئی جس نے اسکے آنے والے وقت کو پہلے ہی اسکے قدموں کے نیچے ڈال دیا تھا۔بہت سے چہرے تھے، نوجوان بھی ادھیڑ بھی اور وہ بھی جن کی گرفت اپنے جسم پر ڈھیلی ہونے لگی تھی۔وہ سب شہر کی ون ٹری ہلس سوسائٹی کی انتہائی دولتمند خواتین تھیں جن کے چہروں پر غازے کی تہوں میں چھپی نفسانی خواہشات تہوں کے اوپر تک آ کے ان کے اندر کی تشنہ طلبی اور تن کی پیاس کا اعلان کر جاتی تھی۔یہ سب تو اس نے بعد میں جانا۔پہلے تو اس نے ان سب کے بیچ خود کو بہت کم تر محسوس کیا۔ایک اجنبی سا احساس اسکے اندر جاگ رہا تھا بہت ممکن تھا کہ وہ لڑکھڑا جاتا لیکن مہارانا ٹوڈرمل اسکی بیساکھی بنا ہوا تھا۔

گل بختا اس شام گل بخت رانا بن گیا۔جسم پر بہترین سوٹ اور چہرے کی دمک نے اسکے مردانہ حسن کو خیرہ کن کر دیا تھا۔وہ تو اس شام جان ہی نہیں پایا کہ پہلے ہی دن اسکی آئندہ کئی راتوں کی بکنگ ایڈوانس میں ہو چکی تھی لیکن ٹوڈرمل ایک

جہاندیدہ بزنس مین شاطر جواری اور صابر سیاستداں تھا۔ جلد بازی اسکے مزاج میں نہیں تھی۔ وقت نے اور طلب نے اُسے کئی گُر سکھادیئے تھے اور سب سے اہم اور بڑا گُر اس نے یہ سیکھا تھا کہ طالب کی طلب اتنی بڑھاؤ کہ وہ خود مطلوب ہوجائے۔ اس نے یہ قول کہیں پڑھا تھا کہ انتظار بے قراری کا نام ہے۔ جس سے وہی لوگ آشنا ہوتے ہیں جو نفس کو لذتوں کا کرب سہہ کر رات میں صبح کی آمد کو ترستے ہیں۔ اور یہ بھی کہ پرندے کے پروں کو سونے کے تاروں سے باندھ دو، وہ اپنی پرواز بھول جائے گا۔ یہ دونوں قول اسکی گرہ میں بندھے ہوئے تھے، اسطرح کہ دل کی بستیوں کے حق ملکیت وہ اتنے پوشیدہ ذرائع سے اپنے نام کرلیتا تھا کہ دل کی دھڑکنیں بھی لاعلم رہتی تھیں۔

وہ "ینگ مین کلب" تھا۔ رائل اپارٹمنٹ کی چودھویں فلور پر۔ وسیع وعریض۔ اس کلب کے میں ہال میں بے حد قیمتی صوفے، فرش بیش قیمت، دیواروں پر لاجواب پینٹنگ اور چھت سے لٹکتے فانوس جن میں مزین بلب روشن ہوتے تو ہال میں ایک خواب گوں کا ماحول انگڑائیاں لینے لگتا اور اس ہال میں شام ڈھلتے ہی کلب کے میل ممبر آنا شروع ہوجاتے۔ اٹھارہ سال سے پچیس سال کے درمیان اور تیس سال سے کم عمر نوجوان۔ مردانہ جسم، مردانہ خوبیاں اور مردانہ حرکات وسکنات جن کے ہر عضو سے چھلکتی ہوئی۔ یہ کلب بظاہر ماڈل اور فیشن ورلڈ ڈیزائننگ میں ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس سے نکلے ماڈل اور فیشن بیرونی دنیا میں کئی دھماکے کرچکے تھے لیکن درپردہ اسکا کاروبار کچھ اور ہی تھا اور وہ تھا جسم فروشی۔!

شام پر رات کی جب ہلکی سی دستک اُبھرتی تو ہال کی تیز روشنیاں گل ہوجاتیں اور فانوس کی مدھم روشنیاں جل اُٹھتیں۔ یہ شاید الیکٹرک کی جدید ترین تکنیک تھی جس کی روشنیاں بڑی نرم اور بے حد مدہوش کن شوخیاں، شرارتیں، خواہشات اور بے قراری نفسانی لذتیں جسموں میں جگادیتیں اور جگمگاتے روپ میں چھپی اپنی کامنا کی تکمیل کا مریضانہ اضطراب لئے آموجود ہوتیں۔ یہ وہ ترسی ہوئی عورتیں ہوتیں، جنکے پاس سب کچھ ہوتا، بہترین جسم، بہترین غذا، بہترین زندگی کے بہترین لوازمات، دولت کے انبار اور سماج میں بارعب لائف اسٹیٹس لیکن جسم کو جو غذا جس مقدار میں درکار ہوتی ہے، اُس مقدار میں کمی رہ جائے یا سرے سے ملے ہی نہیں تو چٹخنے لگتا ہے، ٹوٹنے لگتا ہے اور سارا بدن پیاس اور صرف پیاس کا ریگزار بن جاتا ہے۔ اس ریگزار کو کسی نخلستان کی تلاش ہوتی ہے تاکہ راحت اور سکون سے وہ سانس لے سکے۔ "ینگ مین کلب" ایسا ہی نخلستان تھا جو انسانوں کے اس جنگل، صحرا اور دشت میں ایک انسان، مہارانا ٹوڈرمل نے آباد کررکھا تھا تاکہ "ریگ زار" کی تپش سے جھلستے بدنوں کو آرام کے چند پل مہیا کراسکے۔ یہ تو بڑے ثواب، انسان دوستی اور بے حد فلاح کا کام تھا اور یہ فلاح کا کام وہ بے حد سلیقے، ضابطے اور منظم طریقۂ کار کے تحت کرتا آرہا تھا۔

ہال میں خاموش سناٹے رہتے۔ صرف جسم بولتے، چہرے لودیتے اور اعضا حرکت کرتے۔ اور اسی خاموشی سے سودے ہوتے اور دھیرے دھیرے ہال خالی وہوجاتا۔ ایکارڈر، ٹویوٹا، سینٹر وشیورلیٹ اور بیش قیمت گاڑیاں اپنی اپنی پسند کے جسم لئے روانہ ہوجاتیں، چند ہی لمحوں میں پارکنگ لان خالی ہوجاتا اور مہارانا ٹوڈرمل کی خفیہ تجوریوں میں دولت اپنے دبے پاؤں پہ رہ کر بیٹھ جاتی!

اسکی پہلی بکنگ بہت مہنگے داموں میں ہوئی تھی۔ یہ اسے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ وہ تو صرف اتنا جان سکا کہ ایک کے بعد کئی بندیاں لگی ہوئی تھیں لیکن اس پہلی رات کو جو "ٹپ" اسے دی گئی اسے پاکر تو اسکے ہوش ہی اُڑ گئے۔ نئے

کڑکڑاتے نوٹوں کو ایک ساتھ اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا پھر جب وہ نوٹ اس نے مہارانا کو دیئے تو مہارانا نے مسکرا کر وہ سارے نوٹ اسے واپس کر دیئے۔

"یہ تیرا حق ہے مٹر۔ جا عیش کر"۔

اور پھر اسے اپنا صحیح مصرف معلوم ہو گیا۔ جوانی کا ٹھاٹھیں مارتا جوش ساری رکاوٹیں توڑ کر آتش فشاں کے منہ زور لاوے کی طرح اپنے نیچے بچھی دھرتی کو جلاتا اور اسے خس و خاشاک کی طرح بہاتا لے جاتا تھا۔ یہ منڈی بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ ناپ تول کر پوری پیمائش کے ساتھ خریدار اپنا مال اُٹھاتا ہے۔ مال اگر کسوٹی پر کھرا اترا تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ٹوڈرمل کی اس منڈی میں بھی بکاؤ مال کی کمی نہ تھی۔ بے روزگاری اور معاشی مسائل اس منڈی میں اضافہ ہی کرتے رہتے تھے۔ مگر گل بخت کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ ناتجربہ کاری بھی کبھی ہنر میں یکتا کر جاتی ہے۔ نوعمری میں جب وہ پہلی بار بک کر جس خوابگاہ میں پہنچا تو اسکے ہوش و حواس پر جو پہلی بجلی گری وہ اس سیلاب سے کہیں زیادہ تباہ کن تھی جسمیں اسکا لڑکپن غائب ہوا تھا۔ اس سیلاب نے اس کی غربت، لاچاری اور ماں باپ کو چھینا تھا مگر یہ خوابگاہ تو ایک طلسم خانہ تھی، جسمیں رنگ و بو رقصاں تھی۔ جذبات کی کھنک، سانسوں کے اتار چڑھاؤ میں بلاخیز تلاطم تھا۔ اسکا خریدار بہت شاطر اور پکا فن میں ماہر کھلاڑی ثابت ہوا جس نے پہلی ہی شب میں اسے لڑکے سے مرد بنا دیا۔ اسکو پہلی بار ماسٹر جی کی پڑھائی اُس تعلیم کے معنیٰ معلوم ہوئے کہ دنیا میں جو ہر دو ہیں۔ روشنی اور تاریکی۔ جنکے ملاپ سے کائنات کا وجود ہوا۔ مگر جس تاریکی نے اسکے وجود کو کائنات عطا کی اسمیں روشنی کا فقدان ضرور تھا مگر نشاط و انبساط کے اجالے کچے اور ناتراشیدہ جذبوں کو آبگینہ بدنی اور مخفی احساسات کو نفس کی رونق خوشبوؤں کا جہاں آباد کرتی چلی گئی۔ اسکے بدن کا پہلا تعارف اسے یہ تجربہ سونپ گیا کہ آتش اگر جسم کی ہو تو جلاتی نہیں آتش پرست بنا دیتی ہے اور وہ آتش پرست بن گیا۔ مگر اس طرح کہ "انڈر گیمز" میں اس نے مہارت حاصل کی تو اسکی مارکیٹ ویلیو بڑھتی چلی گئی۔ اس نے یہ بھی جان لیا کہ مرد میں اگر وجاہت کے ساتھ مردانگی بھی ہے تو جنسِ مخالف اسے منہ مانگے معاوضہ پر حاصل کر لیتی ہیں اور یوں اس نے اپنے رزق کو حاصل کر لیا۔ ہزاروں روپے کی شاپنگ، قیمتی سوٹ، جوتے کاسمیٹک اور بھاری ٹپ۔ عورت جب مرد پر یلغار کرتی ہے تو ایک طرف سے نہیں کرتی۔ اسکی یلغار ہر طرف سے ہوتی ہے کہ مرد کو بچاؤ کا صرف ایک راستہ نظر آتا ہے کہ وہ اسے زیر کرے۔ بہت ہی کم عرصہ میں اسے جسم کی بھاشا کا گیان حاصل ہو گیا۔ اس گیان میں موکشیہ نہیں پروپکار (دوسروں کی بھلائی) کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔

دو سال کا عرصہ تو یوں تو بہت زیادہ نہیں ہوتا لیکن گل بخت رانا کی زندگی میں بہت معنیٰ رکھتا تھا۔ ان دو سالوں میں وہ نہ صرف اس شہر کے مزاج سے واقف ہو چکا تھا بلکہ سماج، معاشرہ، سیاست، فلم اور اعلیٰ قدروں اور ہائی سوسائیٹز کے تمام رگ و ریشے کو جان گیا تھا۔ عورت کی کتنی قسمیں شاستروں اور صحیفوں میں بتائی گئی ہیں ان سے اسے کوئی غرض نہیں تھی، وہ تو عورت کا صرف ایک ہی مصرف جانتا تھا اور اس مصرف نے ہی اسے اس دو سال کے عرصہ میں کہیں سے کہیں پہونچا دیا تھا۔ پہلی رات کی ناتجربہ کاری ساری عمر کا تجربہ بن گئی اور وہ "نعمتوں" کے ان بیش بہا خزینوں سے اپنا مستقبل ایک ٹھہراؤ ایک اعتدال کے ساتھ تعمیر کرتا رہا۔ جلد بازی کو اس نے اپنا مزاج نہیں بننے دیا۔ ابتداء کے چند ماہ اٹھارہ سال سے ۱۹ سال کی عمر کے بے تحاشہ خرچ ہوئے اور اس شاہ خرچی نے اُسے یہ گُر بتا دیا کہ اگر یہ خرچ اسی طرح سخاوت سے ہوتا رہا تو بہت جلد وہ کنگال ہو جائے

گا۔اس کی منزل یہ نہیں تھی۔ یہ تو زندگی کا ایک پڑاؤ تھا اور اس پڑاؤ میں اس نے سفرِ حیات کے کئی رنگ دیکھ لئے تھے۔ یہ گر جاننے کے بعد ہی اس نے خود کو اس طرح معتدل کر لیا کہ ندی اُبھان پر آ کے اپنے سارے بند توڑ کر پُر سکون ہو جاتی اور وہ بہت ضبط اور صبر کے ساتھ ان ہوش رُبا مناظر کو خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ یہ شہر بہت تیز رفتار تھا اور اسے بخوبی احساس تھا کہ اگر اس نے اپنی رفتار دھیمی رکھی تو بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اس کے کردار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس نے شراب کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیا۔ واڈ کا، شیری اور اسکاچ جب اسکے خریدار کے ہوش وحواس پر ٹھوکریں مارتیں تب بھی وہ چاق وچوبند رہتا تھا۔ غذا میں کوئی کسر باقی نہ رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی دو سال میں اسکی مردانہ وجاہت میں رتی برابر بھی کمی نہیں آئی تھی۔ اسکا مردانہ حسن ہر حسین کے لئے باعثِ کشش تھا جو اسکی ڈیمانڈ سے زیادہ اسکی قیمت اور پھر بھاری ٹپ اسکے پاس شاندار اپارٹمنٹ انتہائی پوش علاقے میں تھا جسمیں ضروریاتِ زندگی کا بہترین کلیکشن موجود تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اسکی بیش قیمت کاریں رہنے لگیں اور وہ اعلیٰ سوسائٹی کا ایک ایسا فرد بن گیا جس کے بغیر ہر محفل سونی، ہر تقریب ادھوری اور جوان جوان جسموں کی سانسیں، دل کی دھڑکنیں اور چہروں کی رونقیں اپنا جمال کھو دیتی تھیں!

اس نے اپنی اہمیت کو جان لیا تھا اس لئے غیر محسوس انداز میں مہارانا ٹوڈرمل کے اندر جال سے خود کو نکال لایا۔ یوں بھی مہارانا کے میل کلب میں کسی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی تھی۔ نہ پہرے بٹھائے جاتے تھے اور نہ کوئی خفیہ آنکھ ان کی نگراں ہوتی تھی۔ یہ تو خوشی کا سودا ہوا کرتا تھا۔ یوں بھی مہارانا نے اسکی مردانگی کا کمیشن منہ مانگا وصول کیا تھا۔ دو چار سال اگر گل بخت اور رہ جاتا تو مہارانا کی تجوریوں میں اضافہ ہی ہوتا۔ اب نہ رہا تو کمی بھی نہیں آئی۔ اسکی جگہ دوسرے نوجوانوں نے لے لی مگر جو گل بخت رانا کا قرب پا چکی تھیں وہ ہمیشہ اسی کی طلب گار رہیں!

گل بخت رانا کو بھی یہ چاٹ لگ چکی تھی لیکن اب وہ اپنی پسند اور مرضی سے اپنا بیڈروم پارٹنر منتخب کرتا تھا۔ اسی لئے اُس نے رایل کلب کی مہنگی ممبرشپ حاصل کی تھی۔

رابی اپنی عمر سے زیادہ تجربہ رکھتی تھی اور اسکی سوچ بہت آگے کی سوچ تھی۔ مزاج میں ٹھہراؤ اور صبر تھا۔ جلد بازی اُسے پسند نہیں تھی۔ اعتدال کے ساتھ ہر چال چلنا اس نے دنیاوی ہتھکنڈوں سے سیکھ لیا تھا۔ وہ اس قول کی قائل تھی کہ انسان کی شناخت اسکے حال سے ہوتی ہے چونکہ ماضی گزر چکا ہوتا ہے اور مستقبل پسِ غبار پوشیدہ رہتا ہے۔ کب غبار چھٹے اور کب مستقبل کا چہرہ دکھائی دے بڑی صبر آزما اور غیر یقینی کیفیت ہوتی ہے اسلئے وہ ترکِ دنیا پر نہیں، دنیا طلبی پر یقین رکھتی تھی۔ والد بہت مشہور صحافی تھے۔ ساری زندگی حقائق پر لکھتے رہے اور حقائق سے پردہ اُٹھاتے رہے۔ ریاکاری ان کے کردار میں نہیں تھی۔ اسی لئے کسمپرسی کا شکار رہے اور اپنی اولادوں اور بیوی کو بھی اسی کسمپرسی کی زندگی جینے پر مجبور رکھا۔ رابی سمجھدار تھی، بچپن سے ہی اس نے اپنے والد کو بسوں میں، لوکل ٹرینوں میں دھکے کھاتے دیکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی، والد ٹوٹ سکتے ہیں، حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ ٹوٹ گئے اور ایسے ٹوٹے کہ بستر کی سلوٹوں میں ان کا جسم سماتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا تھا کہ بستر کی سلوٹ کونسی ہے اور ان کا جسم کہاں ہے؟۔۔ جب جمع پونجی بھی علاج پر خرچ ہو چکی اور اماں کے سر پر صرف حیا اور سہاگ کی اوڑھنی رہ گئی تو رابی کو گھر سے قدم نکالنا ہی پڑے۔ باپ نے اتنا تو کر دیا تھا کہ اسے گریجویشن تک تعلیم دلا دی تھی۔ تعلیم کی وہی روشنی لئے دنیا کے جگمگاتے اندھیروں سے نبرد آزمائی ہونے نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے والد کا ہی پیشہ اپنایا اور

صحافت کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا کہ صحافت ایک راہِ پُر خار ہے۔ اس راہ پر چلنا پیروں میں پتھر باندھ لینا ہے تبھی کانٹوں کی چبھن سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

اس نے یہاں بھی جلد بازی نہیں کی۔ چھوٹے چھوٹے آرٹیکل سے اس نے اپنی صحافت کی شروعات کی۔ اسکے آرٹیکل صاف ستھرے، سماج کے آئینہ دار ہوتے تھے جن میں کہیں کہیں بدنمائی بھی چمکتی تھی۔ تحریر شگفتہ، بامعنی اور کہیں کہیں طنز آمیز ہوا کرتی تھی۔ اپنے آرٹیکل کے لئے اسے سلم ایریا میں بھی جانا پڑتا تھا اور ان بستیوں میں بھی جہاں انسان کیڑوں کی طرح بلبلاتے ہیں، کلبلاتی اور رینگتی زندگی بسر کرتے ہیں اور عالیشان عمارتوں کو منہ چڑاتے ہیں۔ ان کے دکھ درد، ان کی تکلیفیں اور ان کے جسم پر رینگتے صبح، دوپہر، شام اور رات بے شکل جذبے اور ان بے شکل جذبوں سے آکار لیتی نسل جو بے سمتی کی طرف گامزن اپنے نامکمل تشخص کی تلاش میں سرگرداں۔۔ یہ نئے انسان کی کربناک سچائیاں تھیں جو رابی کے قلم کی گرفت میں آکر جب کسی میگزین یا اخبار میں جگہ پاتیں تو پڑھنے والے کو اپنا ہی آئینہ تھمادیتیں۔ ان آرٹیکل سے جو کچھ بھی حاصل ہوتا اس سے باپ کا علاج اور چولہے کی گرمی قایم رہنے لگی۔ مگر کب تک؟۔۔ یہ اسکی منزل نہیں تھی۔ اگر اس طرح وہ بسوں اور لوکل ٹرینوں کی بھیڑ کا حصہ بنی رہی تو بہت جلد وہ بھی کسی بستر کی شکن بن جائے گی۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے عام قطار سے خود کو نکال لینا ہی بہتر سمجھا۔!

صحافت نے اسے ایک پلیٹ فارم دیا تھا اور اس پلیٹ فارم پر صرف لوکل ٹرین یا پسنجر گاڑیاں نہیں رکتی تھیں۔ سپر فاسٹ گاڑیاں بھی رکتی تھیں۔ اس نے ایسی ہی سپر فاسٹ ٹرین کے ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں جگہ بنالی اور یہ کمپارٹمنٹ جس پلیٹ فارم پر ٹھہرتے تھے، وہاں پوش لائف اور پالشڈ فیس کی جگمگاتی دنیا شروع ہوتی تھی۔ اس دنیا سے وہ پہلے تو بہت مرعوب ہوئی لیکن جب اس نے اس کا قریب سے مطالعہ کیا تو ساری حقیقت آشکارا ہوتی چلی گئی سلم ایریا اور پوش ایریا میں واقعی بہت فرق تھا۔ سچ کا اور جھوٹ کا۔ دونوں دنیائیں غیر متوازن تھیں۔ فرق بہت واضح تھا۔ وہاں غربت تھی، یہاں ثروت تھی، وہاں افلاس تھا یہاں انفاس تھا۔ وہاں سارے زخم کھلے ہوئے تھے یہاں سارے زخم دولت اور صرف دولت نے ڈھانک لئے تھے۔ وہاں فریب، ریاکاری، دھوکہ اگر پانچ فیصد تھا تو یہاں سو فیصد تھا۔ وہاں کچھ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا اندھیرے میں بھی بہت واضح اور انتہائی ظاہر تھا۔ یہاں سب کچھ بے انتہا چکاچوند میں پوشیدہ تھا۔ اس چہرہ پر کوئی نقاب نہیں تھا یہاں ہر چہرہ گلیمر اوڑھے ہوئے تھا!

اپنی انتہائی پرکشش جسمانی ساخت، حسین چہرے اور فراٹے دار انگریزی لہجے نے اسے ان اعلیٰ سوسائٹیز کا بہت اہم حصہ بنادیا۔ وہاں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ پارکنگ لاٹ پر نگاہ ڈال کر یہ جاننے کی کوشش کرے کہ رابی کے پاس کونسے ماڈل اور کونسے میک کی کار ہے یا اسکے بلاؤز کی تراش کس درزی نے ڈیزائن کی ہے یا اس نے جو ہیل پہن رکھی ہے وہ میٹرو سے خریدی گئی ہے یا داؤد سے۔ یا اسکے کانوں میں جو رنگ ہیں ان میں ننھے ننھے سفید لودیتے ہیرے ہیں یا امیٹیشن کوئی نگ! سب اپنے اپنے رنگ میں مست اور مصروف نہ ہوتے ہوئے بھی عدیم الفرصت ہونے کا ناٹک کرتے ہوئے کیونکہ یہ جادوئی نگری انہیں مصنوعی بنیادوں پر کھڑی اپنے زوال کی جانب پورے کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں تھی۔

رابی کو اسکے نام کا بھی بہت فائدہ ملتا تھا۔ ایک حلقہ اسے اپنی برادری کی فرد سمجھتا تھا تو دوسرا کوئی طبقہ اپنا ہم جلیس۔

رابی نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ اس دنیا میں بھی طبقاتی کشش قایم ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتو دولت، حسد، حرص اور گلیمرس کو یہاں پاؤں پسارنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا !

اب اسکے آرٹیکل کا لہجہ بدل گیا تھا۔ غیر محسوس طور پر اسکے آرٹیکل اندر تک جھانکنے لگے اور بے اختیار سماج میں پہنچنے کے لئے فریضانہ اضطراب کی کڑوی صداقتیں زمانہ شناس ہوتی چلی گئیں اور جادونگری کے باسی اپنی ہی نگری کا اترتا دیکھ چونک گئے۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ رابی کو اپنی privacy میں بلا کر انہوں نے جو مضحکہ خیز حماقت کی ہے، اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہی تھا۔ اپنا دروازہ انہوں نے خود ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس امید میں کہ جو بھی آئے گا اپنا ہی آئے گا مگر کوئی خفیہ آنکھ اندر کا منظر قید کرسکتی ہے اور کوئی چہرہ تاریک گلاسوں کی عینک لگائے بھی آسکتا ہے تا کہ نگاہوں کی عبارت پڑھی نہ جاسکے یا آنکھیں محفوظ رہیں کہ تاریک گلاسوں کے پیچھے پتلیوں کا رنگ کالا ہے یا نیلا یا سبز !

بہر حال تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب اسے کمان میں واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ جو عقلمند تھے انہوں نے رابی سے سمجھوتہ کرلیا، جو ہٹ دھرم تھے انہوں نے رابی کو دھمکیاں دیں، نتیجہ یہ کہ دوسرے دوسرے آرٹیکل میں ان کی دھمکیاں اجاگر ہوگئیں۔ جنہوں نے سمجھوتہ کیا تھا وہ مطمئن ہوگئے کہ رابی سب کچھ کرلے گی لیکن ان کی نشاندہی نہیں کرے گی۔ رابی کو اس سے دہرا فائدہ ہونے لگا۔ آرٹیکل کی قیمت منہ مانگی ملی تو پردہ پوشی کا معاوضہ بھی بھرپور ملنے لگا۔

کچھ ایسے بھی تھے جو ایک جیسی زندگی جیتے ہوئے اکتا چکے تھے۔ دولت نے جو آسائشیں فراہم کی تھیں ان سے زندگی میں بے اعتدالی آنا فطری تھا۔ اور اس نے نروس سسٹم کو متاثر کیا تو ڈپریشن داخل ہوا اور اس ڈپریشن نے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کیا اور طبیعتوں میں اکتاہٹ۔۔ خود کو بہت زیادہ خرچ کردینا بے حد مضر ہوتا ہے اور اس مضرت رساماحول میں سانس لینا دوبھر ہوتا جاتا ہے مگر نفس کی خواہشات اسے عروج سے اترنے نہیں دیتیں۔ ایسے ہی ماحول میں اسکی ملاقات اس عورت سے ہوئی جو بظاہر جانِ محفل اور دولت وثروت کی اونچائیوں پر متمکن تھی۔ لیکن اسکے مساموں میں ایک گھٹن اپنی جگہ بنا چکی تھی اور جب رمنیک راجپوت نے رابی کے آرٹیکل پڑھے تو اسے اپنے اندر ایک تسلی کا احساس ہوا کہ کوئی تو ہے جو اپنی ہی سچائیاں بیان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہی تسلی اسے رابی کے قریب لے آئی۔ رمنیک راجپوت اپنے نام کی ہی طرح پرکشش، خوش منظر اور بھرپور عورت تھی۔ عمر تو چالیس سے تجاوز کر چکی تھی مگر جسم کو بھرپور غذا ملتے رہنے کے باعث اسکے ہر عضو سے جہاں آسائش کا اظہار ہوتا تھا وہیں آنکھوں میں تیرتے خوابیدہ ڈورے اور رخساروں پر دمکتے گلابی رنگ نظر آشنا منظر اجاگر کردیتے تھے کہ جسم کہیں سے بھی پیاسا نہیں ہے۔ رمنیک کا شوہر ملٹری میں اعلیٰ عہدے پر تھا اور تین سو پینسٹھ دن اسے برفیلی وادیوں میں اپنے فرائض انجام دینا ہوتے تھے۔ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں صرف پینسٹھ دن ہی اسے میسر آتے تھے جب مسٹر راجپوت، رمنیک کو یہ یاددلانے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ رمنیک کے شوہر ہیں اور ازدواجی فرائض سے غافل نہیں ہیں۔ بقیہ تین سو دن رمنیک یہ بھول جاتی تھی کہ وہ کسی کی بیوی اور ایک جوان بیٹے کی ماں بھی ہے۔ جس نے امریکہ سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور وہیں کا ہورہا۔ جسم کی طلب ہر طلب سے اہم اور ہر بھوک سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ یہ مقولہ اسکی زندگی میں کبھی صادق ہی نہ ہوسکا کہ جب پیٹ خالی ہوتو جسم کی پکار اور اسکی طلب ماند پڑجاتی ہے لیکن رمنیک نے تو جسم کی طلب کو ہر جذبے اور ہر شے پر حاوی پایا تھا اور یہی طلب اسے ٹوڈرمل کے میل کلب تک لے گئی تھی۔ اسی کلب میں اس نے پہلی بار جب گل بخت کو دیکھا تو ایک ایسی

پیاس اپنے اندر امنڈتی محسوس کی جس سے اسکے بدن کے کنارے چھلکنے کو ہو گئے۔ منہ مانگی قیمت پر اس نے گل بخت کو ہار کیا اور پھر ایک لمبا سفر اسکے ساتھ طے کرتی رہی جو بیڈ روم سے شروع ہوتا اور بیڈ روم پر ختم ہوتا۔ پھر نہ جانے کیسے گل بخت گم ہو گیا۔ اور گم ہوا تو زمانوں تک اسے نہ مل سکا۔ اس نے اسکا مداوا تلاش کیا لیکن اس جیسا کوئی نہ ملا۔ رمنیک کی پیاس نے ہی اسکے اندر گھٹن بھر دی اور وہ خود فراموشی کا شکار ہوتی گئی مگر جب اس نے رابی کے آرٹیکل پڑھے تو نہ جانے کیوں اسے آسودگی کا احساس ہوا اور اس نے رابی سے دوستی کر لی۔

اتفاق ہی تھا کہ دونوں کی راشیاں بھی ایک ہی تھیں۔۔۔ تُلا۔۔۔ میزان شاید اسی لئے وہ بہت جلد ایک دوسرے کی مزاج شناسا ہو گئیں۔ دونوں میں ایک چیز اور مشترک تھی۔ رمنیک عیاش عورت تھی لیکن اس نے شراب کو کبھی اپنی کمزوری نہیں بننے دیا اور رابی تو خیر تھی ہی شراب سے کوسوں دور۔۔۔ رمنیک راجپوت نے ہی اسے ٹوڈرمل تک پہونچایا، ٹوڈرمل لاکھ عیار تھا۔ اوپر تک اسکی پہنچ بھی تھی لیکن وہ اپنی ساکھ، اپنی پوزیشن اور اپنا شخصی تناظر جسے اس نے بڑی محنت اور رازداری سے قائم کیا تھا، کسی کے آرٹیکل کی سرخی بننے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں، یہ عجیب سا نام جسکا اس زمانے میں چلن ہی نہیں، کیوں اختیار کیا؟''۔

''آپ کیا لیں گی؟''۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، آپ کا نام ہرنام سنگھ ہے۔ کہئے تو سرنیم بھی بتا دوں''۔

اس نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکی جو بظاہر دھان پان سی ہے، اپنے اندر بڑی قوت چھپائے ہوئے ہے۔

''اور کیا جانتی ہیں آپ؟''۔

''آپ کا گاؤں۔۔ آپ کی پچھلی زندگی۔ ماضی کا سارا کچا چٹھا جسمیں تلخیاں ہیں۔ کڑواہٹیں ہیں۔ دوغلا پن ہے اور بھی بہت کچھ ہے''۔

ٹوڈرمل نے گہری نظروں سے رابی کو دیکھا اور خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''اور یہاں۔۔ جو کاروبار آپ کرتے ہیں ایسے کاروبار کرنے کو عوامی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ شاید بتانے کی ضرورت نہیں ہے''۔ رابی کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ کہیں سے بھی یہ شائبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سرکشی پر آمادہ ہے۔ ٹوڈرمل خاموشی سے اسکا جائزہ لیتا رہا اور چپ چاپ اٹھکر اس طرف بڑھ گیا جہاں اسکی خفیہ تجوری تھی۔ رابی نے جان لیا کہ اب اسے ترقی کی سیڑھی مل گئی ہے ٹوڈرمل پہلا زینہ تھا اور اس زینے پر اس نے اپنا پہلا قدم رکھدیا تھا۔ اُدھر ٹوڈرمل کشمکش میں تھا۔ رابی، یہ دھان پان سی لڑکی، تو ویمپائر ثابت ہو رہی تھی۔ ویمپائر بھی تو بظاہر بے ضرر سا ہوتا ہے۔ اگر اس نے ذرا سی بھی ناسمجھی سے کام لیا تو اتنے سالوں کی محنت سے کھڑا ہوا امپائر کا سارا لہو یہ امپائر پی جائے گی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنے بیڈ روم میں گیا اور جب وہاں سے واپس آیا تو اسکے ہاتھوں میں بڑے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ رابی نے اندازہ کر لیا کہ یہ بہت بڑی رقم ایک ہی چھلانگ میں اسکی ہونے جا رہی ہے۔ ٹوڈرمل نے وہ ساری گڈیاں اسکے سامنے ڈھیر کر دیں۔ لمحے بھر کو رابی کو ایسا لگا وہ ان نوٹوں میں چھپ جائے گی۔ ٹوڈرمل سوچتی نظروں سے اسکا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ یہ ویمپائر اتنے قطروں کو اپنے معدے میں اتار کر اڑ جائے گی یا کچھ قطرے اور شامل کرنا ہونگے مگر رابی نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔۔ اسکا وار کارگر ہوا تھا تو اب اسے عمل

کرنا تھا۔اس نے ہاتھ سے ان تمام گڈیوں کو ٹوڈرمل کی طرف کھسکا دیا۔

''کیوں۔۔کم ہیں؟'' اسکے لہجے میں حقارت سمٹ آئی۔''میں جانتا ہوں،تم جیسی مڈل کلاس لڑکیاں کتنی لالچی ہوتی ہیں۔۔بہت تجربہ ہے مجھے۔۔تم جیسی لڑکیاں بستر پر آکے۔۔۔۔۔''

''مسٹر ٹوڈرمل'' ۔وہ سخت لہجے میں بولی۔''مہارانا بنے ہو تو مہارانا کا وقار بھی سیکھو۔اپنی سطح سے گرو گے تو کتنا نیچے جاؤ گے،قلم کی طاقت سے واقف نہیں ہوا بھی'' ۔کوئی اتنا سخت لہجہ اختیار کرے گا،ٹوڈرمل کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔اسنے خود کو فوراً سنبھال لیا۔اب جو بولا تو آواز نیچی اور نرم تھی۔

''پھر کیا چاہتی ہو تم۔دولت تمہیں جتنی چاہئے بتادو۔میرے پاس کمی نہیں ہے''۔

''دولت تمہارا مطمع نظر ہے،میرا نہیں۔تم جیسے لوگ دولت کے لئے کیا کچھ بیچ دیتے ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے''۔دولت کتنی ہی کیوں نہ ہو،ایکدن ختم ہو جاتی ہے۔وہ تو ایک پائیدار مستقبل کی خواہشمند تھی۔جس میں دولت کے ساتھ اسکی اپنی پہچان ہو سوسائٹی میں۔

''پھر مطمع نظر کیا ہے تمہارا؟''۔

''مجھے رایل کلب کی ممبرشپ چاہئے۔لائف ممبرشپ''۔

''مگر وہ۔اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے''۔

''تمہارے لئے مشکل نہیں ہے۔سوچ لو،دو دن ہیں تمہارے پاس۔رایل کلب کی لائف ممبرشپ میرے نام سے یا پھر۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔میں کچھ کرتا ہوں''۔

رایل کلب کی ممبرشپ حاصل کرنا ٹوڈرمل جیسے بااثر اور متمول شخص کے لئے کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔وہ خود اس کا ممبر تو نہیں تھا مگر ایسے کلب اسکی لسٹ میں شامل ضرور رہتے تھے۔

دو دن سے قبل ہی رابی کو رایل کلب کی ممبرشپ حاصل ہو گئی اور وہ پہلی فرصت میں ہی اس کلب میں پہونچ گئی۔ واقعی یہاں شہر کی سلیکٹیڈ پرسنالٹیز جمع ہوتی تھیں۔حسن اور دولت کا عجیب سنگم تھا یہ کلب۔دو دن اس نے اس کلب کو سمجھنے اور جاننے میں لگا دیئے۔دو چہرے اسے جانے پہچانے مل گئے۔یہ دونوں سرمایہ دار طبقے کی اہم پرسنالٹیز تھیں۔ترلا دارو والا اور فخری بائی حکمت اللہ۔دونوں تھل تھل بدن کی چربی چڑھی عورتیں تھیں ترلا دارو والا اور فخری بائی میں ایک چیز قدر مشترک تھی۔ وہ تھی ان کی خوش دلی۔مسکراتے ہونٹ مسکراتی آنکھیں اور مسکراتے چہرے۔رابی کو رایل کلب میں دیکھ کر دونوں کو حیرت ہوئی تھی۔چونکہ رابی محض جرنلسٹ تھی اور ایک جرنلسٹ میڈیا میں کتنی ہی کیوں اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو،کیپٹل ورلڈ میں اسکی حیثیت معمولی ہی رہتی ہے لیکن دونوں یہ بھی جانتی تھیں کہ ممبرشپ کے بغیر کوئی اس کلب میں آ بھی نہیں سکتا۔وہ چاہے کسی ممبر کا قریبی کیوں نہ ہو اسے بھی ممبرشپ لینا لازمی تھا۔فخری اور ترلا میڈیا میں اسکی عظمت سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔دونوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور پھر دیگر ممبران سے اسکا تعارف بھی انہوں نے ہی کرایا تھا۔یہاں رابی نے سمجھداری سے کام لیا تھا۔ اس نے دونوں سے درخواست کی تھی کہ کلب میں اسکے جرنلزم کے پیشے کو اجاگر نہیں کیا جائے۔دونوں کو کیا اعتراض ہوتا۔خندہ

پیشانی سے اسکی درخواست مان لی گئی۔

دو دن تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی۔ وہ محتاط تھی اور صابر بھی۔ کسی سے پوچھنا اسے گوارہ نہیں تھا۔ دو دن مزید گزر گئے اور پانچواں دن جب اس نے کلب کے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار پارک کی تو اس کی نظروں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ بھی کار سے اتر کر کار کو لاک کر رہا تھا۔ رابی اپنی دھڑکنوں پر قابو نہ پا سکی۔ دل جیسے کانوں میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنی کار کو لاک کرنا بھی بھول گئی اور جب وہ کلب کے دروازے کی طرف چلا تو اسکی شاندار شخصیت کا سحر رابی کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ واقعی رمنیک راجپوت نے اسکا جو سراپا کھینچا تھا، گل بخت رانا اس سے کہیں زیادہ تباہ کن تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جو بھی اسکی زد میں آیا ہوگا ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر خود کو تباہ کر چکا ہوگا۔ رمنیک راجپوت کی ایک مثال ہی اسکے لئے بہت تھی اور اب وہ خود۔ اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ اپنی کمزوری کا اظہار اسے منظور نہ تھا۔ وہ گل بخت رانا کے ہاتھ میں عورت کی فطری کمزوری دینے کی قایل نہیں تھی۔ وہ شطرنج کی بساط پر ایسی چال چلنے کی قایل تھی جو اسے ماہر کھلاڑی ثابت کر دے۔ شہ اور مات دونوں اسکے پاس ہوں۔ یہ سب طے کرنے کے بعد اس نے لاپرواہی کو اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ کلب میں سب اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپنے میں مصروف تھے۔ بہت جلد اسے گل بخت رانا نظر آ گیا جو حسینوں کی جھرمٹ میں گھرا ایک ایسا قادر الوجود شخص لگ رہا تھا جسکی شخصیت میں انقلابی اور اشتراکی دونوں اقسام مشترک تھیں۔ وہ طالب بھی تھا اور مطلوب بھی۔ اسکے مردانہ حسن میں بڑی ہی دلآویز شرارتیں جنسِ لطیف کو گدگدانے اور خود پر مائل کر کے گھائل کرنے میں ماہر تھیں۔ اپنی بے چین دھڑکنوں اور بے ترتیب سانسوں کے درمیان رابی نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ ایک میز پر تنہا بیٹھی بظاہر راحت بخش مشروب سے شغل کر رہی تھی لیکن اسکی نگاہیں رہ رہ کر گل بخت کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اس نے کسی طرح خود کو سنبھالے رکھا۔ جلد بازی مناسب نہیں تھی۔ بات تو تب بنتی جب پروانہ خود شعلے پر قربان ہونے چلا آتا۔ دوسری عورتوں کی طرح اپنی سطح سے گرنا اسے پسند نہیں تھا۔

پھر وہ ہر روز نظر آنے لگا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کئے رہی جیسے گل بخت کی اہمیت اسکے نزدیک کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے محسوس کیا جیسے دو نگاہیں اسکے جسم کی سرحد سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں لیکن اس نے ان کا نوٹس نہیں لیا۔ اگر وہ بھی پلٹ کر دیکھ لیتی تو بات ہی کیا رہ جاتی؟

اس دن شاید قدرت اس پر مہربان تھی۔ فخری حکمت اللہ اپنا جنم دن منا رہی تھی۔ بہت بڑا کیک اور اس پر ایک چھوٹی سی کینڈل روشن تھی۔ فخری حکمت اللہ اور ترلا دار و والا ہمیشہ کی طرح ایک ساتھ تھیں اور تمام ممبرزان کے آس پاس جمع تھے۔ اسی مجمع میں گل بخت رانا اور رابی بھی کیک کٹنے کے منتظر تھے۔ گھڑی میں ابھی ایک منٹ کی دیر تھی اور بارہ بجنے میں صرف ساٹھ سیکنڈ باقی تھے۔ فخری نے مسکراتی نظروں سے سب کو دیکھا اور پھر نہ جانے کیا سوجھی اس نے گل بخت کو پکار لیا۔

"اے ڈھیکرا۔ میرے نزدیک چلا۔ آنا بابا۔ اور اوہ چھوکری تو بھی آ"۔ فخری نے رابی کو بھی بلا لیا۔ رابی تو چاہتی تھی گل بخت کی تھوڑی بھی قربت حاصل ہو۔ وہ دونوں فخری کے پاس آ گئے۔

"فخری بائی۔ یہ تمہاری کونسی سالگرہ ہے"۔

"اے بکواس نہ بک۔ چھوکری لوگ سے ان کا ایج نہیں پوچھتے۔ ایکدم سیکریٹ میٹر۔ اے تم دونوں ایسا کیوں کھڑا

ہے۔اے ڈھیگرا۔اس سے ملو۔یہ اپن کی بیسٹ فرینڈ رابی ہے اور رابی یہ اپنا ڈھیگوا ہے۔گل بخت رانا"۔رابی نے ہلکے سے مسکرا کر سر کو جنبش دی جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔اس نے دیکھ لیا تھا کہ گل بخت اسکی توجہ چاہتا ہے مگر وقت نے موقع نہیں دیا۔

گھڑی نے بارہ بجنے کا اعلان کیا اور سارا ہال ہپی برتھ ڈے ٹو یو کی تکرار سے گونج اُٹھا!

وہ دن جس کا اسے انتظار تھا۔آخر کار آ ہی گیا۔اپنی ٹیبل پر وہ تنہا تھی۔فخری اور ترلا اُٹھ کر ابھی ابھی گئی تھیں۔وہ اپنے پسندیدہ مشروب کے سپ لینے میں مشغول تھی کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔اس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔گل بخت رانا اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اسکے نزدیک کھڑا تھا۔بڑی دلآویز مسکراہٹ اسکے پورے چہرے پر دمک رہی تھی۔

"اگر اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو کمپنی دے سکتا ہوں؟"۔ایک ساعت اسے لگا وہ خود کو فراموش کر چکی ہے مگر یہ تو ہونا ہی تھا۔اُس نے جلدی سے مسکرا کر اسے اجازت دیدی۔

"تھینکس"۔وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"کیا لیں گے آپ؟"۔

"جو آپ مناسب سمجھیں"۔

"جن، رم، واڈ گا، اسکاچ یا۔۔۔"وہ اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ کس دنیا کا باسی ہے۔

"شکر ہے ابتک ان نعمتوں سے محروم رہا ہوں"۔

"اوہ۔۔"اس نے ویٹر کو بلا کر سافٹ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔جلد ہی ویٹر مطلوبہ ڈرنک لے آیا اور دونوں نفاست سے سپ کرتے رہے۔

"کیا بات ہے آپ خود کو سب سے الگ رکھتی ہیں؟"۔

"ایسا تو نہیں ہے"۔

"پھر یہ تنہائی کس لئے؟"۔

"کس نے کہا میں تنہا ہوں؟۔میرے خیالات اور میری پرسنالٹی میرے ساتھ ہے"۔

"صرف خیالات کی ہمراہی سے پرسنالٹی میں نکھار نہیں آتا"۔بڑی شاعرانہ بات کہی اس نے۔

"پریکٹیکل ہونے کے لئے لائف میں کرافٹ مین شپ ہونا ضروری ہے۔اس طرح تو انسان کے ہاتھ صرف قنوطیت ہاتھ لگتی ہے اور کچھ نہیں"۔

وہ بہت ماہرانہ اور تجربہ کارانہ انداز میں اسے دانہ ڈال رہا تھا مگر وہ اتنی جلد دانہ چگنا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں۔ایسا کچھ نہیں ہے۔انسان کو خود پر اعتماد ہو تو وہ کبھی بے اختیار نہیں ہوتا"۔گل بخت نے بھی محسوس کیا، اسکے حسن کی طرح اسکی گفتگو میں بھی لطافت ہے، یقیناً وہ دیگر عورتوں سے مختلف ہے۔

"آپ جانتی ہیں، آپ کتنی حسین ہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔دانتوں کی قطار سے ایک قوس نکلی اور گل بخت رانا کو پہلی بار لگا، اس ہنسی میں وہ کھنک ہے جس سے اسکے کان ابتک نا آشنا ہے۔

"مجھے کبھی ایسا گمان نہیں ہوا"۔ سیدھا سا جملہ جس میں سادگی اور معصوم سی شرارت چھپی ہوئی تھی۔

"پھر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"۔

"ایک جرنلسٹ کو جستجو اور تجسس کی تلاش کہاں کہاں لئے پھرتی ہے"۔ اس نے خود کو ظاہر کر دیا۔

"اوہ۔ تو آپ پروفیشنل جرنلسٹ ہیں"۔ اس نے اس طرح کہا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ ایک معمولی جرنلسٹ اتنے مہنگے کلب کی ممبر شپ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اچانک وہ محتاط ہو گیا۔

یہ ان کی پہلی اور کافی حد تک طویل ملاقات تھی جس میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا تھوڑا سا موقع ملا تھا لیکن آئندہ ملاقات کے لئے رابی نے خود کو کچھ روز کے لئے غائب کر دیا۔ کئی روز وہ کلب نہیں آئی۔ یہ دن اس نے اپنے والد کی تیمارداری، ماں کی تنہائی اور عرشی کی معیت میں گزارے۔ ورنہ وہ تو اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ ستم پیشہ وقت اسے مہلت ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ فرصت کی گھڑیاں نکال سکے۔ اب جو اس نے فرصت پائی تو اسمیں کتنا جبر اس نے برداشت کیا یہ کچھ وہی جانتی تھی۔ ایک ہفتہ اور اس ایک ہفتہ کا ہر دن جابر اور سفاک نکلا جو اسکے جذبات پر تنہائی کے کرب کے نشتر لگاتا رہا مگر اس نے خود پر بے حسی طاری کر لی تھی۔ آج اگر اس نے سپر ڈال دی تو پھر تا زندگی مفتوح ہوتی رہے گی اور جس منزل کی وہ خواہشمند ہے وہ ریگ زاروں میں دفن ہو کر رہ جائے گی اور عرشی کی آنکھوں میں پلتے خواب کبھی تعبیر نہ پا سکیں گے۔

دس دن کا جبر سہہ کر جب وہ کلب پہونچی تو اس نے پارکنگ لاٹ میں ہی گل بخت کو اپنا منتظر پایا۔۔ وہ تقریباً جھپٹتا ہوا سا اسکے پاس آیا۔

"رابی۔۔ تم۔۔ تم کہاں رہیں اتنے دنوں؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟ کہیں کچھ" وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور رابی اندر ہی اندر اپنی خود اعتمادی پر مسکراتی رہی۔ اسے پہلی بار فخر ہوا کہ جسکی وہ تمنائی ہے، وہ اس سے بڑھکر اسکے لئے بے تاب و بیقرار ہو چکا ہے۔ اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

"ہاں۔ میں کچھ دن ادھر نہ آسکی۔ دراصل میرے والد سخت علیل ہیں۔ اسی وجہ سے"۔

"اوہ۔۔ کبھی تم نے بتایا ہی نہیں"۔ یہ طرز تخاطب ظاہر کرتا تھا کہ گل بخت رانا اپنی دنیا میں اسکے وجود کا طالب ہے۔

"جی۔۔ بس کچھ ایسے ہی معاملات ہیں۔ آیئے۔ اندر نہیں چلیں گے؟"۔ اس نے اسطرح کہا جیسے وہ گل بخت کو اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دے رہی ہو اور اگلے چند دنوں میں یہ ثابت بھی ہو گیا۔ رابی کی بے اعتنائی اسکی کامرانی کا سبب بن گئی۔ عورت اگر اجتناب برتے تو مرد کی انا مضطرب ہو جاتی ہے۔ پکے پھل تو خود سے شاخ سے ٹپک جاتے ہیں۔ مزہ تو جب ہے جب ڈالی کو جھنجھوڑ کر پھل توڑا جائے۔ گل بخت رانا ان مصنوعات میں رہتے رہتے اکتا چکا تھا۔ اسے اور یجنل کی جستجو تھی۔ جس میں سب کچھ اصلی ہو تھوڑی سی بھی ملاوٹ نہ ہو اور رابی ایسی ہی اوریجنل تھی۔

پھر ایک دن جب وہ گھر پہنچی تو اس نے دروازے سے ہی جان لیا کہ اندر کوئی آیا ہوا ہے۔ عرشی نے اسے آتا دیکھا تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ عرشی کے چہرے سے خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی۔

"کیوں اپیا۔ آپ نے تو اپنی زنبیل میں نہ جانے کس کس کو چھپا رکھا ہے"۔

"زنبیل۔۔ یہ تجھے آج عمرو عیار کیسے یاد آگیا؟"۔

"ایک شاہزادہ آیا ہوا ہے ہمارے گھر۔۔اسی نے بتادیا"۔

"شاہزادہ۔۔وہ سوچتی ہوئی بیمار باپ کے کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹک گئی۔گل بخت رانا کرسی پر بیٹھا اسکی ماں اور باپ سے محوِ گفتگو تھا۔ماں بہت خوش نظر آرہی تھی لیکن بیمار باپ کے چہرے پر فکر کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئیں تھیں۔اس نے محسوس تو کیا لیکن بیماری پر محمول کر کے ٹال دیا۔

"ارے۔۔آپ کب آئے؟"۔

"اری یہ تو بہت دیر سے بیٹھے ہیں"۔گل بخت کے بجائے اسکی ماں نے جواب دیا۔"تیرا انتظار کر رہے تھے۔جانے والے تھے،میں نے ہی روک لیا۔آ۔تو چل میرے ساتھ۔آنا"۔

ماں اسے تقریباً کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

"رابی۔دیکھ مجھ سے کچھ مت چھپانا"۔

"میں سمجھی نہیں"۔

"یہ چکر کیا ہے؟"۔

"کیسا چکر اماں"۔

"گل بخت رانا۔۔تو اسے کب سے جانتی ہے؟۔کب تم دونوں ملے؟۔کب ایک دوسرے کو پسند کیا اور اب۔۔؟"۔

"کیسی پسند اماں۔تم کیا کہہ رہی ہو،میں کچھ بھی نہیں سمجھی"۔

"بھولی مت بن۔۔تو نے بھی وہی پیشہ اپنایا ہے جو تیرے ابو کرتے تھے۔میں جانتی ہوں،اس پیشے سے پیٹ تو بھر جاتا ہے،تھوڑی آبرو بھی قایم رہتی ہے لیکن پہاڑ سی زندگی نہیں کٹ سکتی۔میں ہمیشہ تیرے اور عرشی سے ہولتی رہتی ہوں۔یہ دنیا ہمیشہ سے مردوں کے تسلط میں رہی ہے۔عورت کتنا ہی اونچا مقام پالے،مرد کے بغیر اسکا وجود ادھورا اور اسکی تخلیق نامکمل رہتی ہے۔مرد ہی اسے تحفظ دیتا ہے اور مرد سے ہی اُسے سماج میں رتبہ ملتا ہے۔بیٹی تو!تو اپنے ابو کی حالت کو سمجھتی ہے،میں بھی بس انہیں دیکھ دیکھ جی رہی ہوں"۔اماں رو پڑیں۔آواز فرطِ جذبات سے بھرا گئی۔وہ گم صُم اماں کو دیکھے جارہی تھی۔پھر اماں نے خود کو سنبھالا اور پھر گویا ہوئیں۔

"تو سمجھدار ہے۔تعلیم یافتہ ہے۔باہر کی دنیا میں آتی جاتی ہے۔مگر بیٹی زمانہ شناس پھر بھی نہیں ہے۔گل بخت نے تیرا ہاتھ مانگا ہے۔"وہ سن سی رہ گئی۔یہ تو اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اسکے گھر تک آجائے گا اور اتنی تیزی سے اسے ماں باپ سے طلب بھی کرلے گا۔واہ بھئی واہ۔مگر اس سے ایک بات صاف ہوگئی۔گل بخت اسے اپنی زندگی میں عزت کے ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا۔یوں بھی وہ اتنے عرصہ میں اُس نے گل بخت میں سطحیت محسوس نہیں کی تھی۔!

"وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے"۔

"یہ بات اس نے خود سے کہی ہے"۔

"اور کون کہے گا؟۔۔اس نے سب کچھ بتادیا ہے۔اسکے گاؤں میں سب کچھ سیلاب میں بہہ گیا۔ماں باپ۔گھربار سب۔یہاں آکر اُس نے آپ اپنی پہچان بنائی ہے۔اب تک اس نے شادی اسی لئے نہیں کی کہ اسکے معیار کی کوئی لڑکی نہیں

ملی۔اب ملی تو وہ تو ہے۔اور ہاں وہ کہہ رہا تھا،تو بھی اسے پسند کرتی ہے"۔

اماں کو پہلے اتنی باتیں کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا اُس نے۔آج تو اماں کو جیسے اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔

"تو بول کیا کہتی ہے؟"۔

"اماں۔۔یہ ساری عمر کا فیصلہ ہے۔میں اتنی جلدی کیسے ہاں کہہ دوں۔کچھ تو سوچنے کی مہلت دو"۔

"بس تجھے انکار نہ ہو۔"اماں چھپاک سے باہر نکل گئیں اور اسکے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

فخری حکمت اللہ اور ترلا دارو والا کے کانوں تک نہ جانے کیسے یا بات پہونچ گئی کہ گل بخت رانا،رابی سے شادی کرنے جارہا ہے۔بس سارے کلب میں جیسے بھونچال آ گیا۔خوش ہونے والے چند ہی تھے۔۔باقی کے تو دھانوں پر اوس پڑ گئی۔بھلا گل بخت رانا جیسا جوان رعنا کو ایک دھان پان سی لڑکی سالم ہضم کرنے جارہی تھی۔بیٹے ماں باپ کے لئے جہاں فخر کا باعث ہوتے ہیں وہاں بیٹیاں ان کی عزت کی کیاریوں میں کانٹوں کی طرح اُگتی ہیں۔دھیرے دھیرے ماں باپ کے دلوں میں چبھتی رہتی ہیں۔جوانی کا پیش لفظ بنتے ہی ماں کو اسکی فکر ستانے لگتی ہے۔

نیاز احمد نے تمام عمر اپنی سفید پوشی قایم رکھی تھی۔کبھی اس پر داغ نہیں لگنے دیا تھا۔صحافت میں انہوں نے جو کچھ لکھا بے باک اور صاف گوئی سے لکھا،کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔جو نیک نامی انہوں نے کمائی تھی شاید اسی کی سزا انہیں اسطرح ملی کہ خود بیماریاں سمیٹ کر بستر پہ ڈھیر ہو گئے اور جوان بیٹی کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔کیا ہی اچھا ہوتا،وہ رابی کی شادی کر چکے ہوتے خواہ وہ لڑکا غریب ہی کیوں نہ ہوتا مگر شریف تو ہوتا۔مگر انہیں اپنے ماضی پر پچھتاوا نہیں تھا۔ان کا ضمیر مطمئن تھا کہ انہوں نے جتنا جیا سر اُٹھا کر خودداری اور عزت آبرو سے جیا مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا اس نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔گل بخت رانا بے شک بہت وجیہ اور اسمارٹ نوجوان تھا۔رابی کے لئے بے حد مناسب تھا۔بات کرنے کا سلیقہ اور گفتگو سے ذہانت کا اندازہ ہوتا تھا مگر نہ جانے کیوں انہیں لگتا تھا کہ اسکی پچھلی زندگی ایسی نہیں گزری جس پر فخر کیا جاسکے۔کہیں کچھ چھوٹ گیا تھا جو نیاز احمد پکڑ نہیں پا رہے تھے اور پھر عرشی نے انہیں بتایا تھا،اُسکی کار بہت شاندار تھی،وہ تو اس نے اس وقت دیکھی جب عرشی گل بخت رانا کو الوداع کہنے اسکے ساتھ سڑک تک گئی۔کار اُس نے سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی تھی۔اور پھر اسکا یہ بتانا کہ پین سی روڈ پر اسکا اپنا اپارٹمنٹ ہے،اپارٹمنٹ۔۔وہ تو انتہائی پوش علاقہ ہے۔بے حد قیمتی۔کافی مہنگا۔اور سوٹ جو اس نے پہنا ہوا تھا وہ اور ٹائی میں لگا ہوا کلپ؟۔۔غالباً اس میں ہیرا جڑا ہوا تھا۔پھر رسٹ واچ۔۔انگلی میں پلاٹینم کی انگوٹھی۔۔نہیں کچھ نہیں بہت کچھ پوشیدہ ہے مگر نیاز احمد کیا کر سکتے تھے۔اُن کی حس کچھ اور اشارے کر رہی تھی۔ایک خوددار،باضمیر اور غیرتمند باپ کر بھی کیا سکتا ہے۔اتنا ہی کہ اپنا ضمیر اپنے وجود میں چھپائے بیماریاں اور امراض اوڑھے بے بسی سے بستر مرگ پر پڑا ہوا تماشہ دیکھتا رہے۔

رہی اماں کی بات تو ہر ماں اپنی بیٹی کے جوان ہوتے ہی ہولنے لگتی ہے۔کہیں سے کوئی رشتہ آئے اور وہ جھپٹ لے۔۔گل بخت کے معاملے میں ماں نے زیادہ سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ایک بیٹی عمر کی اُس کگار پر کھڑی تھی جہاں سے چند قدم کے بعد پھسلن شروع ہو جاتی ہے۔پھر دوسری بیٹی بھی تو ہے،ایک کا مستقبل سنورے تو دوسری کا ٹھکانہ ہو۔آگے نصیب۔ہم کے دن جئیں گے۔باقی تو انہیں ہی جینا ہے۔اسلئے صبر،شکر اور راضی خوشی سے رشتہ تسلیم کرلو۔۔اور نیاز احمد نے

رشتہ تسلیم کر لیا۔ وہ بیٹی کی آنکھوں میں یہ تحریر پڑھ چکے تھے کہ باپ کی خودداری سے وہ مطمئن نہیں ہے۔ ایک پُرآسائش، لکورڈ، کلچرڈ اور پوش لائف کو جس نے خود ان کے افلاس کے دروازے پر دستک دی ہو چھوڑ دینا یا ٹھکرا دینا عقل مندی نہیں ہے۔!
ہائے رے مجبوری۔۔ آنکھیں اشکوں سے محروم، کنارے جھلسے ہوئے، اشک نہیں تو کیونکر۔ اشک تو آنکھ سے نہ نکل سکے ہاں جسم سے روح نکل گئی۔ اور نیاز احمد نے بیٹی کی ڈولی اُٹھنے سے پہلے ہی اپنا جنازہ گھر میں تیار کرا دیا۔ بھلا وہ اس گھر سے نکل کر کسی اپارٹمنٹ میں کیسے جا سکتے تھے؟

عرشی کے لئے وہ صبح صبحِ درخشاں تھی جب اس نے بالکونی کا پردہ ہٹایا، ایک عجیب دنیا اسکے آگے روشن ہو گئی۔ نیچے بسیں اور لوگ کھلونوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ جیسے ان میں چابی بھر دی گئی ہو۔ دور تک سمندر کی نیلی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایک لمحہ کو ایسا لگا۔ سمندر اچھل کر بالکنی میں آگیا ہو۔ اسی دن بریک فاسٹ ٹیبل پر عرشی چہک رہی تھی۔

"بجیا۔ آج آپ کی اس تحریر کا مطلب مجھے معلوم ہو گیا"۔

"کونسی تحریر؟"۔

"ارے وہی۔

چپ کر۔۔ ہر کچھ بولتی رہتی ہے"۔ اماں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"بولنے دیجئے نا۔ آج پہلی بار تو مجھے، بہن کا پیار اور آپ جیسی ماں کی شفقت ملی ہے"۔ گل بخت نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اماں کو منع کیا۔

"اور میں۔۔" رابی سے رہا نہیں گیا۔

"وہ تم ہی تو ہو جسکی ہستی نے میری سناٹوں کو آوازوں سے سجا دیا ہے"۔

گل بخت رانا کی آواز میں بلا کا لوچ تھا اور اس لوچ میں پیار اور صرف پیار کی خوشبوئیں کائنات کی طرح دھڑک رہی تھیں۔
رابی نے اُسے غور سے دیکھا۔ گل بخت کے چہرے پر ایسی خوشیاں تھیں جن سے شاید وہ زمانے سے محروم رہا تھا۔
اور رابی؟۔۔ اُسے تو اپنی آئیڈیلٹی چاہئے تھی جو اسے مل گئی۔۔ کاروبار محبت کا ہو یا جنس کا۔۔ اگر سلیقے سے کیا جائے تو دام واجب ملتے ہیں اور ساکھ بھی بنی رہتی ہے۔ اس نے بھی ایک ماہر تاجر کی طرح اپنے جذبات، احساسات اور زندگی کے جوان منہ زور امنگوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس نے اپنی مانوس شبیہ کو انا کی شکست نہیں بننے دیا اور حکومتِ دل کی بازگشت آج اُسے اپنی شناخت کا خراج دے گئی تھی۔ گل بخت رانا کی پناہ میں آکر۔۔ اگر اسے سمجھو تو پیار تھا ورنہ ایک پیار بھرا کاروبار۔ حیات کا بھی اور محبت کا بھی !

☆☆☆

نفیسن

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ حسو کے گھر میں چوہے اور چھچھوندروں کی طرح دوڑتے ہوئے فاقے نفیسن کی اُٹھتی، اُبھرتی اور ربر کی طرح کھنچتی جوانی کو روک لیتے۔ بیچارا حسو تو اپنی بیٹی کی اُپھنتی ہوئی جوانی کو دیکھ دیکھ کر ہی پیپل کے پتے کی طرح حالات کی سڑاند پا کر پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنی کھپریل کی چھت کو دیکھتا جنکے کویلو بلیوں کی ہڑ دنگ لیلا کی وجہ سے جگہ جگہ سے ہٹ چکے تھے اور ان میں روزن بن گئے تھے تاکہ سورج کی شریر کرنیں آسمان سے کچے، گوبر سے لپے ہوئے فرش پر اُتریں، کچھ دیر چھلک بلیاں کھیلیں اور جب تھک جائیں تو جھر جھراتی دیواروں سے دو گھڑی پیٹھ ٹیک کر کے آرام کر سکیں اور پھر واپسی کا سفر اختیار کریں۔!

حسو کبھی دروازے کو دیکھتا جس پر پڑا ہوا ٹاٹ کا پردا لبیریوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور ان لبیریوں میں سے لنگڑی سڑک سے عاشقوں کا ریلا نفیسن کی دہکتی ہوئی جوانی کی بھٹی میں ہوسناک نگاہوں کو لمحے بھر کی لذتیں دیتا گزرتا چلا جاتا تھا۔!

ایک کوٹھری، پھر دالان جس پر ٹین کا سائبان اور پھر چھوٹا سا آنگن جس میں ایک جانب سنڈاس بنی تھی جہاں سے روز مہترانی میلہ کما کر لے جاتی تھی۔ اسکے عوض نفیسن اُسے دو روٹیاں اور کبھی کبھی رات کا بچا ہوا سالن دیدیتی تھی۔ صحن میں امرود کا پیڑ لگا تا تھا اور اُس سے ملحق ننھی سی کیاریاں جن میں نفیسن کی ماں نے چنبیلی کا پودا لگایا تھا جو اب نفیسن کے قد سے بھی اونچا نکل کر گلی کی طرف اُٹھی مکان کی منڈیر کو چھونے لگا تھا۔ امرود سال میں دو بار پھل دیتا تھا جو یا تو کچے پکے امرود نفیسن کھا جاتی یا گلی کی طرف سے شریر بچوں کا آوارہ ٹولہ کبھی پتھر اور کبھی بانس سے ڈالیاں جھکا کر امرود توڑ کر بھاگ جاتا۔ امرود کے پیڑ سے پیلے پتے جھڑ کر اچھے خاصے جب صحن میں جا بہ جا بکھر جاتے تو نفیسن کھجور کی جھاڑو سے سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیری کی شکل میں جمع کر دیتی۔ جنھیں مہترانی اپنی بانس کی ڈلیا میں بھر کر لے جاتی اور محلے کے کچرہ گھر میں پھینک آتی۔ یہ اس کا فاضل کام ہوتا تھا اس خدمت کے عوض مہترانی نفیسن سے چونی، اٹھنی اور کبھی کبھی روپیہ تک وصول کر لیتی تھی!

حسو جب اپنے ٹوٹے پھوٹے اور ننگے بھوکے گھر کا جائزہ لے چکتا تو پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتا۔ اسکی نگاہوں میں ویران سی شفقت ہوتی۔ آنچ دیتے ہوئے سوال ہوتے اور نفیسن باپ کی سوال کرتی آنکھوں اور چہرے پر جمی جذبات کی گرد سے بے خبر اپنے آپ میں مگن آنگن میں کھلتے چنبیلی کے پھول چننے میں مصروف رہتی۔ اُسے کیا پڑی تھی کہ وہ خواہ مخواہ باپ کے احساسات سمجھنے کی کوشش کرتی۔ اُسے تو خود اپنے جذبات تک سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ آخر نفیسن کو اتنی جلدی جوان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی تو اُسے پیدا ہوئے بھی پورے سترہ سال نہیں ہوئے تھے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نفیسن کی ماں اور اپنی بیوی شریفن کے خیالوں میں کھو جاتا۔ کس چاؤ، کس اپنائیت سے وہ شریفن کو بیاہ کر لایا تھا۔ تب تو اسکی اماں بھی زندہ تھیں۔ اسی مکان میں شریفن دلہن بن کر آئی تھی، اسی کوٹھری میں تو وہ پہلی بار اُتری تھی۔ تب اس کوٹھری میں اسکی ماں بی کی کھٹیا ڈلی تھی۔ ساتھ ہی نماز کی چوکی! یہیں وہ سوتی تھیں۔ چھوٹے سے پان کی کلیوں میں کتھا چنا اور کتری ہوئی چھالیہ بھری رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہو یا رات کا یا پھر صبح کا ناشتہ۔ اماں بی کو پان کی طلب ہمیشہ رہتی تھی۔ جب شریفن دلہن بن کر آئی تو اماں بی نے

اپنی کھٹیا دالان میں ڈلوادی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہیں شریفن اور حسو کوٹھری میں سوتے تھے اور اماں بی دالان میں۔ دالان میں ہی اماں بی اپنی عمر کی دہلیز پھلانگ کر موت کی پناہ میں جابسی تھیں۔ تب نفیسن شریفن کے پیٹ میں تھی !

شریفن بہت نیک بخت گرہستن اور شوہر پرست عورت تھی۔ جب تک وہ زندہ رہی، حسو کا کاروبار بھی اچھا چلتا تھا ۔ کاروبار ہی کیا تھا۔ روز صبح خالی ہاتھ ٹھیلہ لیکر نکلتا دروازے دروازے پہنچ کر کباڑے کا سامان اکھٹا کرتا اور پھر حاجی کباڑیئے کو بیچ آتا۔ اچھی خاصی فاضل رقم مل جاتی جو وہ شام کو شریفن کے ہاتھ پہ لا کے رکھ دیتا۔ اُسے یاد ہے، جب شریفن نے اس گھر میں قدم رکھا تھا تو یہ گھر اس کے رُوپ سے کیسا جگمگا اُٹھا تھا۔ اِس گھر کے پتھر پتھر۔ ایک ایک اینٹ اور ایک ایک کویلو نے اُسے خوش آمدید کہا تھا۔ کتنی سگھڑ تھی شریفن اور جب نفیسن کی پیدائش قریب آئی تھی تو وہ کتنی خوبصورت ہوگئی تھی۔ بالکل بیر بہوٹی۔ نہیں نہیں ۔۔ بیر بہوٹی تو بہت سُرخ ہوتی ہے۔ شریفن تو سانولی تھی مگر اس کی سنولاہٹ میں لاہوری نمک کی آمیزش تھی۔ تو وہ بالکل لاہوری نمک کی طرح ہوگئی تھی ۔۔ جس طرح لاہوری نمک میں سفیدی کے ساتھ گلابی پن اور ہلکی سی نیلاہٹ ہوتی ہے، بالکل اسی طرح ۔۔ ہو بہو ۔۔۔!

اور وہ شریفن کے خیالوں میں گم ہو کر سو سا گیا تھا۔ شریفن آ کے اسکے پاس بیٹھ گئی۔ ہونٹوں پر محبت آمیز مسکراہٹ لئے ۔۔ شریفن کی لمبی مخروطی انگلیاں آہستہ آہستہ اسکے گھنے اور کھچڑی بالوں کی گلیوں میں دوڑنے لگیں۔ شریفن کی آنکھیں اسکے چہرے پر جمی تھیں جہاں اسے زمانے کی سختیوں نے اسکے چہرے کی ساری کشش اور مردانگی کا سارا رس نچوڑ لیا تھا اور ان کی جگہ عمر نے اپنے تقاضے چھوڑ دیئے تھے !

شریفن نے اسکا سر اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اور حسو نے محسوس کیا، کتنا لامتناہی سکون ہے اس آغوش میں۔ بس شریفن تو اسی طرح مسکراتی رہ۔ اسی طرح مجھے اپنی آغوش میں چھپالے اور میں ۔۔۔ میں بھول جاؤں گا کہ تیرے گزر جانے کے بعد میں نے تیری نفیسن کو کن مصائب میں پرورش کیا۔ جب تک تو میری حیات میں شریک رہی، میں نے تجھے ہی اپنی خوشیوں کا محور سمجھا ۔ اپنی زندگی کی معراج جانا۔ لیکن خوشیوں کا تانا بانا اتنا چھوٹا ہوگا، میں نے احساس ہی نہیں کیا تھا۔ تُونے نفیسن کو تو میری آغوش میں ڈالدیا لیکن اسکے پیدا ہوتے ہی تو چلی گئی۔ شریفن تُو سن تُو رہی ہے نا؟ ۔۔ تیرے جاتے ہی کام کاج بھی بے برکتی ہوگئے۔ کتنی نیک بخت تھی تُو ؟ ۔۔ شریفن ۔۔۔ شریفن ۔۔"

"ابا ۔۔ ابا ۔۔۔" نفیسن نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔

"ایں ۔۔ آں"۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنی آغوش دیکھی۔ وہ خالی تھی ۔۔ تو ۔۔ یہ سب خواب تھا؟

"میں کب سے جگا رہی ہوں۔ اُٹھو۔ کھانا نہیں کھانا؟"۔

"ہاں ۔۔ کھاؤں گا"۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ مٹکے سے کٹورے میں پانی نکالا۔ منہ پر دو چار چھپکے دیئے اور ہاتھ دھو کر پٹلے پر آ کے بیٹھ گیا۔ نفیسن نے رکابی میں ارہر کی دال اور گیہوں کی روٹیوں کا توڑا کر سامنے رکھ دیا۔!

حسو خاموشی سے کھانا کھانے لگا ۔۔ وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے شریفن اُسکے پاس آئی تھی ۔۔ خواب اسی لئے تو ہوتے ہیں کہ انہیں بھلا دیا جائے۔ آخر حقیقت اور خواب میں کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیئے۔

نفیسن پر جوانی کیا آئی گویا محلے پر آفت آگئی۔ سترہ کا سن اس غضب سے اُٹھا کہ کم عمر لونڈوں کو بھی بالغ کرتا چلا گیا۔ ایک بلا کی طرح نازل ہوا اور انسانی خواہشات کو چوما چاٹی کا شعور بخشتا چلا گیا ! وہ تھی بھی تو نری الھڑ بے جوڑ۔ململ کی بٹن لگی کرتی اور اُس پر بالش بھر چوڑی ڈوپٹہ ڈال لیتی اور جب کبھی ڈوپٹہ سینے سے کھسک جاتی اور کرتی کے کاج ڈھیلے ہونے کی وجہ سے کوئی بٹن کاج میں سے الگ ہو جاتا تو ایمان والوں کا ایمان تو غارت ہوا سمجھو۔۔بس یوں لگتا کہ ایک دس پھوٹ یا تو پوکرن میں ہوا تھا یا اس محلے میں نئے نئے جوان ہوتے لڑکوں کے حواس پر ہوا۔ !

کلو پان والے کی دوکان پر پان کھاتے اور بیچ بیچ تھوکتے ہوئے یا حاجی کی چائے کے ہوٹل پر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے نوعمروں کا موضوع گفتگو صرف نفیسن کے دو مسکراتے ہوئے ہونٹ ہوتے جنہیں چوس کر کتر کتر کھا لینے کی خواہش کوئی بھی چھپا نہیں پاتا۔ دو آنکھیں ہوتیں جن میں سب اپنے لئے ایک بلاوا محسوس کرتے۔ !

"سالی۔۔آج میں اُدھر سے نکلا تو سالی پردے سے چمٹی کھڑی تھی"۔ سعیدا نے سڑک پر بیچ سے پان کی پچکاری مارتے ہوئے ممدو سے سرگوشی کی !

"یار وہ تو اپنے باپ کی وجہ سے ڈرتی ہے"۔ ممدو نے سعید کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"ورنہ وہ تو آج۔۔۔"

"ارے ممدو تو یاں ہے؟"۔ زاہد نے اُسکی پیٹھ پر پیچھے سے ہاتھ مارا۔

"کیا بات ہے۔ بہت خوش نظر آ رہا ہے"۔؟

"ہاں یار۔۔آج بس کچھ نہ پوچھ۔۔بس جنت مل گئی پیارے جنت"۔

"ابے بدقوے۔۔۔"سعیدا نے زاہد کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہوئے کہا۔

"بتا کیا بات ہے؟۔۔دھندے میں فائدہ ہوا یا کسی کی جیب کاٹ لی؟"۔

"ہت تیرے کمینے کی"۔ زاہد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔"آخر تو سب کو اپنے جیسا کیوں سمجھتا ہے؟۔اپن تو خاندانی اشراف ہیں۔۔تُو یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ پیسے دھیلوں سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے دنیا میں"۔ زاہد نے ممدو کو دیکھ کر فحش اشارہ کیا اور پھر قہقہہ لگا کر سعیدا سے بولا۔۔"اور وہ ہے پیارے عشق۔۔کیا سمجھا۔۔؟ مجنوں تو لیلیٰ پہ مرتا تھا سالے۔۔جانتا ہے، اپن پہ کون مرتا ہے"۔؟

"اچھا تو تم بھی عاشق ہو سالے"۔ سعیدا نے چونے سے لُسری انگلی کو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔"ذرا اپن بھی تو سنیں، کون مرتا ہے آپ جناب پہ؟"۔

"نفیسن۔۔"

"ہونہہ۔۔یہ تھوتھڑا اور لنگو چمار کا جوتا"۔

"ابے وہ تو مجھ پہ جان دیتی ہے"۔ زاہد بولا۔

"ہونہہ۔۔مجھ پہ مرتی ہے"۔ سعیدا نے اسی کے انداز میں منہ بنا کر کہا۔

"ابے ابھی اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔ جب میں نے اسے آنکھ ماری تو تب بھی وہ مسکراتی رہی۔ میں

کھڑا رہا۔ وہ مسکراتی رہی اور پھر ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی"۔

"ابے بیٹے خان۔۔ایسے تو وہ اپن کو بھی دیکھ کے مسکراتی ہے"۔ سعید بولا۔

"اچھا بھئی۔ اپن تو چلدیئے۔ کام پہ جانا ہے۔" ممدو نے دونوں کو الجھتا چھوڑا اور پاس سے گزرتے ہوئے لبے ٹیھو کو روکا اور سوار ہو کر چلا گیا۔

اُس دن شام کو جب حسو گھر لوٹا تو خاصا لدا پھندا تھا۔ ہاتھ ٹھیلہ بھی پوری طرح خالی تھا۔ اُس نے گھر میں داخل ہوتے ہی نفیسن کو پکارا۔

"نفیسو۔۔اری کہاں ہے؟"۔

نفیسن کوٹھری میں گھسی چوٹی کو موباف میں گوندھ رہی تھی۔ باپ کی آواز سنتے ہی لپکی اور دالان میں آکر دیکھا تو حسو کھٹیا پر سامان رکھ رہا تھا۔

"ابا۔۔آج یہ تم کیا اُٹھالائے؟"۔

"اری پگلی اُٹھا کے نہیں خرید کے لایا ہوں۔ آج سارا کباڑا بک گیا اور دام بھی اچھے ملے۔ یہ دیکھ تیرے لئے شلوار کرتہ اوڑھنی اور چپل بھی لے آیا ہوں۔ اور یہ دیکھ پوڈر کا ڈبہ بھی لے آیا۔ ٹھیلے والے کے پاس سستا مل گیا۔ دیکھ دیکھ کتنی بڑھیا خوشبو ہے۔ حسو نے ڈبا نفیسن کی ناک سے لگا دیا۔ نفیسن پاوڈر کی خوشبو سونگھ کر خوش ہوگئی۔ "اچھی ہے"۔

"اور دیکھ آج میں گوشت بھی لے آیا ہوں۔ آہ۔۔کب سے نہیں کھایا۔ تیری ماں زندہ تھی تو ہر دن گوشت پکاتی تھی۔ تب بکری بھی اچھی ہوتی تھی نا"۔ وہ جلدی ہی سنبھل گیا۔ ورنہ جذبات اُسے کہاں سے کہاں لے جاتے۔۔!

"جا۔۔جلدی سے پکالے اور روٹیاں بھی تازی ڈال دے"۔ وہ نفیسن کو گوشت اور مصالحوں کی تھیلی تھماتا ہوا بولا۔ تھیلی اُٹھاتے کوئی بھاری سی چیز فرش پر گری۔ کچے فرش پر دھپ کی سی آواز اُبھری۔ نفیسن نے اُسے اُٹھا کر دیکھا۔۔پرانا سا تالا تھا۔!

"یہ کیا ہے ابا؟"۔

"تالا۔۔آج کباڑے میں آگیا تھا، سو گھر کے لئے لے آیا۔" حسو نے اسکے ہاتھ سے تالا جھپٹ لیا۔ "رات بے رات چور تو اندر نہ آسکیں گے"۔ نفیسن کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرادی۔ اب بھلا اس گھر میں چور کو کیا ملے گا؟۔۔اور پھر دروازے سے آئیں یہ کیا ضروری ہے؟۔ گھر کی دیواریں ہی کونسی اونچی ہیں؟۔۔ چھلانگ بھر کی تو ہیں۔ لیکن نفیسن یہ نہیں سمجھتی تھی کہ حسو کے اس کچے گھر میں اگر ہیرے موتی، مال ومتاع سے بھی کوئی قیمتی شئے ہے تو وہ خود نفیسن ہے۔۔گوشت کی بساند تو گوشت خور ندیدوں کو دور سے کھینچ لاتی ہے اور جب تک گوشت کا چٹخارہ زبان کو نہ چھوئے ندیدوں کی اشتہا برقرار رہتی ہے۔

رات کا کھانا کھا کر حسو اپنے اور نفیسن اپنے بستر پر پڑ کر سو گئے۔ حسو چند ہی لمحوں میں بے خبر سو گیا۔ آج اُسے نیند بھی ٹوٹ کر آئی۔ ہر رات دروازہ صرف سائکل کے سہارے بند رہتا تھا۔ رات بے رات کسی آہٹ پر اسکی نیند کھل جاتی تو وہ دروازے کو بعد میں سب سے پہلے نفیسن کے بستر کی طرف دیکھتا تھا جو دالان سے صاف نظر آتا تھا۔ نفیسن کو سوتا دیکھ وہ مطمئن ہو جاتا تھا لیکن آج دروازے پر تالا لگا کر اور چابی اپنے ازار بند میں باندھ کر اس مصرع کے مصداق نیند میں غرق تھا

کہ سوئیں گے ہم تمام رات کوئی ہمیں جگائے کیوں؟

حاجی کے ہوٹل میں چائے پیتے اور سستی سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے معشوق صاحب، اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ ہر شام کا معمول تھا۔ معشوق صاحب چائے پینے ہر شام حاجی کے ہوٹل میں آتے اور اپنی منتخب میز پر بیٹھ جاتے۔ یہ میز سڑک کی جانب تھی اور ہوٹل کی کھڑکی سے حسو کے گھر کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔ دو تین اور کبھی چار سے پانچ تک نوجوان ان کے شریکِ چائے ہوتے۔ معشوق صاحب گفتگو نپے تلے انداز میں کرتے تھے۔ لہجہ صاف اور تلفظ نقادانِ اردو ادب کے نزدیک انتہائی ''بلیغ'' ہوا کرتا تھا۔ موضوع کبھی امن، کبھی سیاست، کبھی گاندھی خاندان، کبھی تقسیم ہند، کبھی امریکہ کی پھٹے میں پاؤں الجھانے والی حرکتیں، کبھی فلموں میں بڑھتی ہوئی فحش نگاری، کبھی محبوب خان، امیہ چکرورتی، بر جابیہ، رشی کیش مکھر جی، ایس یو سنی، یش راج چوپڑہ اور کئی صاف، سلجھے اور ذہن کی پراگندگی کو اپنی فلموں سے تسکین بہم پہونچاتے فلم میکرز کا آج کے فلم میکرز سے تقابل اور ایسے ہی کئی مختلف موضوع ہوا کرتے تھے۔ چائے میں اُن کی ''ہم نوائی'' کرتے معشوق صاحب کے مہمان ان کی ہر تقریر کو بہت توجہ سے سنتے اور اُن کی طرف سے پیش کی گئی کانچ کے چھوٹے چھوٹے، بقول معشوق صاحب ''نابالغ'' گلاسوں سے چائے کی چسکیاں لیتے اور اُن ہی کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر پیتے ہوئے نوجوان، بہت کم معشوق صاحب کی گفتگو کا اثر قبول کر پاتے ! دورانِ گفتگو خود معشوق صاحب کی نگاہیں حسو کے دروازے کی جانب اٹھی رہتی تھیں اور جب کبھی ''قتالہ'' دروازے پر پڑے پردے سے جھانکتی نظر آجاتی تو معشوق صاحب تو کیا ان کی ساری لیکچر بازی کو قتل کرتی گزر جاتی اور معشوق صاحب کا لہجہ بھی لڑکھڑا جاتا۔۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ان کے مہمان کھسک جاتے۔!

آج بھی معشوق صاحب بیکار اور بے روزگار لونڈوں کی ٹولی کو جمع کیے حسب دستور سرکار اور سرمایہ دارانہ مزاج کے سیاستدانوں کے ذریعہ پیدا کیے گئے بے روزگاری کے مسائل پر لیکچر دے رہے تھے۔ !

''اوئے۔ایک چائے لا۔'' ممدو نے چائے سرو کرنے والے لڑکے کو آرڈر سرو کیا اور معشوق صاحب کی میز کے قریب والی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ممدو کی کرخت آواز نے معشوق صاحب کے منہ کو کڑوا کر دیا۔ وہ چونک کر ممدو کی طرف دیکھنے لگا جواب کھڑکی سے نظر آتی سڑک اور اسکے پار گلی کے نکڑ پر بنے حسو کے گھر کی جانب نظریں دوڑا رہا تھا۔۔ اُسے بھلا معشوق صاحب کی خشک لیکچر بازی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ عرصہ سے انہیں اسی طرح لیکچر دیتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے سنتا آرہا تھا۔ یہ صرف وہ جانتا تھا کہ وہ کھڑکی کے پاس کیوں بیٹھتے ہیں؟۔۔ ورنہ زیادہ تر لوگ تو یہ بھی جانتے تھے کہ معشوق صاحب صرف زبان کے چٹخارے کے معاملے میں سیاست کے شہسوار ہیں ورنہ عملی زندگی میں بالکل ناکارہ۔۔ جہاں کوئی عملی کام آیا کہ ان کے پیٹ میں یا تو باؤ گولہ ٹل گیا یا کسی وقتی مرض میں مبتلا ہو گئے۔۔ !

معشوق صاحب کی عمر ۳۵ سال سے تجاوز کر رہی تھی۔۔ کم از کم ممدو کا تو یہی اندازہ تھا۔۔ چہرہ گول، ڈاڑھی مونچھوں سے بے نیاز، رنگ گیہواں، کہیں کہیں چہرے پر چیچک کے داغ، قد درمیانہ۔۔ نہ اتنا اونچا کہ محلے کا جوان طبقہ انہیں ''لمبو چچا'' سے تشبیہ دے اور نہ اتنا نیچا کہ ''فطرۃ'' کی مصداق صادق آتی ہو۔ ہونٹ زیادہ تر مسکراتے ہوئے۔ شیروانی چوڑیدار پاجامہ اور اُس پر کبھی گاندھی تو کبھی جناح کیپ، غرض یہ کہ وہ نہ بدزیب تھے کہ صفِ مخالف انہیں یک قلم و یک ابرو مسترد

کردے وہ قبول صورت بھی نہ تھے کہ "معشوقانِ شہر" کے چہرے گلاب کی طرح ضو دے اُٹھتے۔ مجھ سے نظر ملی تھی کہ وہ جگرگا گئے !

ممدو کے تو وہ ایک طرح سے رقیب تھے۔ ممدو ہی کیوں، سعیدا۔ زاہد اور کرانہ کی دوکان چلانے والے رؤف جسکی دوکان سے اکثر و بیشتر نفیسن کرانہ خریدنے آجاتی تھی۔ رؤف بھی پکا حرامی پن کی حد تک بدمعاش تھا۔ سو گرام دال کی جگہ ڈیڑھ سو گرام دال اور ایک روپے کی چائے کی پتی کی بجائے سوا روپے کی چائے کی پتی باندھ دیتا اور جب نفیسن احتجاج کرتی تو رؤف بڑی بے غیرتی سے ادھار کو لین اور دین کی اصطلاح میں نفیسن کو سمجھاتا۔ "دیکھ میں نے تجھے سودا دیدیا۔ اور تو نے لے لیا۔ زیادہ جو دیا اسکا پیسہ تو مانگ نہیں رہا۔ اب تجھے ادھار چکانا ہے تو گھر بلا کے ایک کپ چائے پلا دینا اور یہ رکھ" وہ پارلے جی بسکٹ کا پیکٹ تھماتے ہوئے کہتا۔

"چائے کے ساتھ بسکٹ مزہ دیتے ہیں۔ آدھا تیرے منہ میں آدھا میرے منہ میں۔ کیا سمجھی؟۔ اور ہاں۔۔ جب بھی چائے پلانے کا موڈ ہو تو ایسے ٹیم بلائیو جب تیرا باپ گھر پر نہ ہو"۔ نفیسن سودا تو لے لیتی لیکن حسو کو باپ مخاطب کرنے پر بھڑک اٹھتی۔ بھلا اسے میرے ابا کو باپ کہنے کا کیا حق ہے؟۔۔ بدتمیز کہیں کا۔۔ وہ تن تناتی، کبھی ہنستی کھلکھلاتی گھر کی جانب بھاگ جاتی !

یہ روز ہی کا معمول تھا۔ گھر میں کبھی بھی مہینہ بھر کا راشن نہیں لایا تھا حسو۔ جو شے ختم ہوئی لپک کے رؤف کی پرچون کی دوکان سے آگئی اور لپکنا بھی نفیسن کو پڑتا تھا۔ حسو کو اس سے زیادہ روزی روٹی کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ یوں بھی اُس نے ساری زندگی محنت مزدوری ہی کی تھی۔ ایک دن نہ گیا تو چولہا برف ہوگیا۔ پیٹ تو ایسا دوزخ ہے جسے ہر مقررہ وقت پر ایندھن چاہیے ہی چاہیے !

نفیسن نے اکثر سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا تو مگر سمجھی نہیں کہ آسمان پر اُڑتے پرندوں کے مساوی جو دوسرا چیختا پھنکارتا پرندہ اڑتا ہے اسکے اندر زیادہ سینکڑوں انسان بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور اسے اُڑانے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور اُس جیسی مگر شفاف لڑکیاں اپنی تجارتی مسکراہٹ سے مسافروں کی پذیرائی کرتی ہیں۔ وہ بدنصیب تو کبھی اُس سڑک پر بھی نہیں گئی تھی جو بہت چوڑی دور تک لمبی، دونوں اطراف اونچی عمارتیں اُٹھائے نہ جانے کہاں تک جا رہی تھی اور اسکے وشال سینے پر بڑی بڑی موٹریں دندناتی گزرتی رہتی تھیں۔ ان کا سلسلہ رُکتا ہی نہیں تھا !

مگر فطرت نے ہر انسان کو ایک جذبے سے ضرور نوازا ہے۔ یہ جذبہ اسکے لاشعور میں کہیں پوشیدہ ہوتا ہے۔ عمر اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ لاشعور سے شعور اور پھر اسکے ہر موئے تن سے آشکارا ہونے لگتا ہے۔ اس کو محبت اور صنفِ مخالف کے باہمی ربط کا نام دیا گیا ہے۔

رؤف نے اُسے آج ایک لپ اسٹک دی تھی۔ لپ اسٹک دیتے ہوئے اس نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جب وہ اُسے اپنے ہونٹوں پر لگائے گی تو سارا بدن لو دے اُٹھے گا۔

بہت منت سے اُس نے کہا تھا کہ لپ اسٹک لگا کر وہ ایک بار، چاہے رات کے اندھیرے میں ہی سہی اپنے قریب آنے کا موقع ضرور دے۔ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا نفیسن نے، شرمائی اور لپ اسٹک لئے گھر کی طرف بھاگ اُٹھی تھی۔ رؤف

نے اسکا شرمانا اپنے جسم کے ہر حصے میں محسوس کیا تھا اور ایک طرح سے لپ اسٹک قبول کر کے، نظریں جھکائے، مسکراہٹ کو زیرِ لب چھپائے اسکا بھاگ جانا رؤف کے لئے گویا کھلی دعوت ہی تھا!

رات کو کسی نے پتھر مار کر پول پہ لگا اکلوتا بلب توڑ دیا تھا۔ سڑک اور اس سے ملحق گلی تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ رؤف کے لئے گویا قدرت نے موقع فراہم کر دیا تھا، وہ چوکنا، چاروں طرف دیکھتا، قدموں کی چاپ دبائے اسکے دروازے پر جا رُکا، دل کی دھڑکن جیسے کانوں میں ساز بجانے لگی۔ ایک بار پھر اُس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ایک۔ دو۔ پھر کوئی سرگوشی اُبھری۔

''کون۔۔؟''۔

''میں۔۔رفو''۔

''ابا نہیں ہیں''۔ یہ گویا خاموش اظہارِ قربت تھا۔

''میں ابا سے نہیں۔۔تجھ سے ملنے آیا ہوں''۔

''ابا آتا ہی ہوگا۔۔ آ گیا تو؟''۔

''اندھیرا کام دے گا۔۔ دروازہ تو کھول''۔ رؤف نے اپنے ہونٹ دروازے کی سن پر رکھے ہوئے تھے تاکہ آواز آس پاس نہ جائے! کچھ دیر خاموشی رہی۔ یہ سناٹا رؤف کے لئے بہت طویل تھا۔ دل کی دھڑکن اور بڑھ گئی۔ پھر اسے لگا کہ کچھ ہوا۔ کنڈی گرنے کی آواز اس نے صاف سنی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے دروازہ ڈھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ دوسری طرف نفیسن سرو قد کھڑی تھی۔ دور دالان میں مدھم سی لالٹین کی روشنی صحن پار کرنے سے قاصر تھی۔ رؤف نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی! رؤف نے دیکھا۔ اسکے ہونٹ لو دے رہے تھے۔ وہ مست ہو گیا۔ نفیسن نے اسکی دی ہوئی لپ اسٹک قبول کر لی تھی، اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی ایک قدم۔۔ دو قدم۔۔ نفیسن مطلق پیچھے نہیں ہٹی۔ اسکا اپنی جگہ نہ چھوڑنا رؤف کا حوصلہ بڑھا گیا۔ ابھی اسکے ہونٹوں نے لپ اسٹک سے مزین ہونٹوں پر اپنی آگ رکھی تھی کہ دروازہ چیخ اُٹھا۔ نفیسن سارے بدن سے لرز گئی اور رؤف کے جسم کی ساری آگ راکھ بن گئی۔ نفیسن نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ دروازہ پھر چیخا اور اس کے ساتھ حسو کی آواز ابھری۔

''ابا''۔ نفیسن کی سرگوشی ابھری رؤف اتنی دیر میں دروازے سے ملحق دیوار میں دبک چکا تھا۔ نفیسن نے خود کو سنبھالا اور بڑھ کر دروازے کی کنڈی گرا دی۔ حسو اندر آ گیا۔ اس نے نفیسن کو دیکھا مگر اندھیرا اسکے ہر راز کا امین ثابت ہوا۔ حسو نے کنڈی چڑھائی اور سیدھا سنڈاس میں جا گھسا۔ رؤف کے لئے یہ وقفہ غنیمت تھا۔ لپک کے اس نے سانکل کھولی اور تاریکی میں بھاگ نکلا!

نفیسن کے لئے رؤف کا لمس ایک عجیب تجربہ ثابت ہوا۔ پہلا لمس، پہلا جذبۂ بے خودی اسکے سارے لڑکپن کو تیاگ گیا۔ وہ جیسے ایک ہی رات میں بچپن اور لڑکپن کی دہلیز پھلانگ کر جوانی کی تپتی دوپہر میں آ ٹھہری۔ ایک آتش فشاں پھٹنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ کوری مٹکی پہ جس طرح پانی کی ایک بوند مٹکی میں سن سن کی بازگشت پیدا کر دیتی ہے، رؤف کے ہونٹوں نے اسکے ہونٹوں کو چھو کر اسے سنسنا دیا تھا۔ سارا جسم جیسے تنی ہوئی کمان بن گیا تھا اور تیر چھوٹنے کو بے قرار تھا!

مگر درمیان میں ایک فطری حجاب مانع تھا۔ایک شرم کہر آلود موسم کی مانند اسکے وجود پر احاطے کئے ہوئے تھی۔اور سب سے بڑی رکاوٹ حسو تھا۔اس کا باپ۔جس سے اسکا معتبر رشتہ تھا۔مقدس تعلق تھا۔اسکے آنے والے کل کے فیصلے کا اختیار معاشرے اور مذہب نے اسے ہی سونپا تھا۔کب وہ اسکے بارے میں فیصلہ لے گا نفیسن نہیں جانتی تھی۔لیکن اس ایک رات نے اور اُس رات میں سانس لیتے ہزارویں پل کی قربت نے مرد کی ضرورت کا اُسے اتنا احساس دلایا کہ ہر رات رؤف کو اس نے اپنے قریب محسوس کیا مگر وہ رات اور اس رات کی تاریکی پھر نصیب میں نہ آسکی۔ٹوٹے بلب کی جگہ نئے بلب نے گلی کو ایسا روشن کیا کہ نفیسن کی ہر رات کے مقدر میں اندھیرے اتر آئے!

اُس دن صبح ہی سے موسم ابر آلود تھا۔شاید بارش کے آثار تھے۔سردی کا موسم آ گیا تھا اور مہاوٹ کبھی بھی گر سکتی تھی۔حسو اس دن گھر پر ہی تھا۔نفیسن نے ناشتہ کرا دیا تھا اور حسو آلکسی سے کھٹیا پر لحاف میں دبکا پڑا تھا۔نفیسن کی خاموشی اور سنجیدگی کو حسو نے محسوس کر لیا تھا۔وجہ بھی پوچھی تھی لیکن کوئی تسلی بخش جواب اُسے نہیں ملا تھا۔انہیں سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔دروازے کی کنڈی کھلی تھی صرف پٹ بھڑے تھے۔حسو نے دروازے کی جانب دیکھا اور منتظر رہا کہ دوسری دستک پر اُٹھے یا نفیسن سے دروازہ کھولنے کو کہے مگر شاید آنے والے نے محسوس کر لیا تھا کہ دروازہ کھلا ہے اور کوئی اندر داخل ہوا،لیکن آنے والی تو کوئی خاتون تھی۔گہرے اودے رنگ کا غرارہ پہنے جس پر سستا سا گوٹا ٹانکا ہوا تھا۔تنگ جمپر اور سرخ دوپٹہ پر حاشیہ بانگڑی اور گوٹے سے مزین بھر کم جسم گھسٹتا ہوا دالان کے قریب آ ٹھہرا۔حسو سنبھل کر بیٹھ گیا۔اُس نے غور سے دیکھا،موٹی،کالی رنگت پر بڑی بڑی سرمہ بھری آنکھیں اٹھائے سپڑ سپڑ کرتی یہ تو نذیر باورچی کی گھر والی ہے۔حسو نے لحاف پائتی کیا اور پاؤں اتار کے کھٹیا پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔نذیر کی گھر والی پاس آ چکی تھی۔

”ساما لیکم بھائی حسو“۔موٹے بھدے ہونٹوں سے خارش زدہ سی آواز نکلی۔

”پچھانا؟۔۔ہم۔۔نجیر کی لگائی۔۔اے وئی آپ کا یار ہے نا“۔

”اوہ۔۔ہاں ہاں۔پہچان لیا۔آؤ۔اری نفیسن۔ذرا وہ مونڈھا رکھدے لا کے“۔نفیسن کمرے سے نکلی اور مونڈھا لا کے کھٹیا کے پاس رکھدیا۔نذیرا کی گھر والی نے چٹ چٹ بلائیں لے ڈالیں!

”نجر نہ لگے دسماں کی۔بڑی کھبسورت ہے یہ تو۔تب تو کوں،لونڈا ایسے ویسے ئی نئیں مرا ہوگا“۔نفیسن تو کیا سمجھتی یہ زبان البتہ حسو نے الجھی ہوئی آواز میں پوچھ ہی لیا۔

”یہ کس کی بات کر رہی ہیں بھابی؟“۔

”ائے اور کس کی بات کروں ہوں؟۔اپنے لمڈے کی وئی چندے آپھتاب چندے مہتاب۔۔کب جوان ہو گیا،میرے کو تو کھبر ئی نہ پڑی۔اللہ رکھے کدکھاٹ ایسا نکالا ہے وے نے کہ پردے سرک جاوے ہیں جس ویر سے نکلے ہے۔پر دل کا کیا کسور۔آیا بھی تو اس لونڈیا پہ۔آتے جاتے نجر وجر پڑ گئی اور بھائی ایسی نجر پڑی کہ اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ گیا،بولا بیاہ رچاؤں گا تو نفو سے ورنہ جہر کھا کے پٹڑی پہ لیٹ جاؤں گا“۔

”نفو۔کون نفو؟“۔

”ائے یہ ترپ کی بٹیا بھائی صیب،میرا بیٹا اسے پیار سے نفو پکارتا ہے،جب سے دیکھا ہے تب سے“۔نذیرا کی گھر

والی پھر اُٹھی اور چھپاک سے پھر نفیسن کی چٹ چٹ بلائیں لے ڈالیں۔

"تو۔۔میں کیا کروں؟"۔

"اب سب کاج آپ ہی کو کرنا ہے بھائی صیب۔ میں رستہ لے آئی ہوں تمہارے پاس۔اپنے نصیرے کا آپ کی نفو کے سنگ۔ بچی بھائی صیب چندا سورج کی جوڑی ہوگی سبرے محلے میں"۔

حسو اب پوری طرح نذیرا کی گھر والی کی آمد اور اسکا مدعا سمجھ چکا تھا۔اس نے ایک نظر نفیسن کو دیکھا۔۔وہ تاز جیسی اپنی جگہ منجمد تھی۔اس نے پہلی بار بیٹی کی اہمیت کو سمجھا۔اس ایک نظر نے حسو کے شعور میں سارے مخفی راز منکشف کر دیئے۔ اس نے صحن میں نظر ڈالی۔ بیری کا کوئی پیڑ نہیں تھا۔صرف امرود کا پیڑ تھا۔بیری کا پیڑ ہونا ضروری نہیں ہوتا، اہم ہوتا ہے گھر میں بیٹی کا جوان ہونا۔۔ پتھر نہ آئے تو کیا لوگوں کی نظریں کسی پتھر سے کم نہیں ہوتیں۔۔ حسو نے چند ساعت خود کو سنبھالا۔ نفیسن کو دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ جٹا پایا۔مگر نذیرا کی گھر والی کے منہ سے نکلے جملے اس کے اندر کڑواہٹ گھول گئے۔ کچھ بھی ہو، وہ محنت مزدوری کرتا ہے مگر ہڈی اسکی نرم نہیں ہے۔ نہ نفیسن اس پر بوجھ ہے کہ ہرا یرے غیرے اور بدقوے کے ساتھ دو بول پڑھادے۔ لیکن اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ گھر آئے مہمان سے کیسا سلوک کرنا چاہئے۔اندر ہی اندر کھولتے زہر کو اس نے نرم لہجہ دے کر پوچھا!

"بڑی مہربانی بھابی جو تو نے میرے نفیسن کو یہ درجہ دیا"۔

"ارے خوش رہ بھائی صیب۔خوش رہ"۔نذیرا کی گھر والی کھل اٹھی۔"دیکھو جی میرے لال نوں رستے تو بہتیرے ہیں۔ایک سے ایک کھاندانی۔یوں بھی بھائی صیب آپ تو نجیرا کے گھرانے سے واکف ہو۔ایسا ویسا تو ہے نا۔۔ نگر کا مانا ہوا باورچی گھرانہ ہے۔اے لو۔۔دس پیستیس واہ واہی لوٹتے گجر گئیں۔ محفلیں چھپاک چھپاک انگلیاں چاٹتی اُٹھی ہیں بستی سے"۔

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں"۔حسو نے آنکھ سے اشارہ کیا اور نفیسن اندر جاکے دبک گئی۔

حسو کا منہ اور کڑوا ہو گیا۔کیا زمانہ آگیا ہے، بدقوے اپنی قومیت کا بکھان کرنے لگے ہیں۔اس نے والان پر دور تک نظر ڈالی۔یہیں تو اماں جان کا تخت بچھا رہتا تھا سفید براق چادر اس پر سفید غلاف چڑھا گاؤ تکیہ۔ہلکی اور سبک سلیپر تخت کے نیچے رکھی رہتی تھیں۔جب بھی ضرورت ہوتی اماں بی اپنے سفید دودھیا پیر سلیپر میں ڈالتیں اور قلعی شدہ آفتابہ اٹھا کر اس تپائی پر جا بیٹھتیں جو ان کے لئے مخصوص دالان سے ملحق کیاری کے کنارے رکھی رہتی تھی۔وضو کرتیں جب تک اذان ہو چکتی اور پھر مصلیٰ باندھ کر چوکی پر آبیٹھتیں اور نماز ہمیشہ انہوں نے کھڑے ہو کر پڑھی۔کبھی بیٹھ کر نہیں۔ململ کے سفید مصلیٰ میں ان کا چہرہ کچھ اور روشن ہو جاتا۔۔۔!ابا جب پنشن لے کر آتے تو سارا اساسہ اماں بی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔مہینے بھر کا انتظام اماں ہی کرتیں۔کب کیا اور کتنا بازار سے سودا سلف آنا ہے، سب اماں ہی کرتی تھیں۔ابا کی شیروانی لیکر سلیقے سے کھونٹی پر ٹانگنا اور ابا کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا اماں کی ذمہ داری تھی۔اس نے اماں اور ابا کو کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ایک مسکراہٹ ہمیشہ چہروں پر سجی دیکھی۔دونوں کے ہوتے گھر میں کتنی رونق، کتنی برکتیں تھیں۔ہر دیوار سے نور برستا محسوس ہوتا تھا۔مکان تو یہی تھا۔نہ کم ہوا نہ زیادہ۔پھر اب یہ نحوستیں کیوں اُتر آئی ہیں؟کیوں برکتیں اُٹھ گئیں؟۔۔کیوں نفسانفسی ان کے وجود میں آگھسی۔؟اب بھی تو دو جانیں ہیں۔ایک باپ ایک بیٹی۔تب بھی تو دو جانیں تھیں۔اماں اور ابا۔وہ تو بہت چھوٹا تھا۔

دینی مکتب میں پڑھنے جاتا تھا۔ گھر آتا تو اماں بی منہ دھلاتیں۔ کپڑے تبدیل کراتیں اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر اسکو کھلاتیں۔ نماز کی تلقین۔ کلام پاک کی تلاوت ضروری دنیاوی تعلیم اور زندگی کا سلیقہ اسے سکھاتیں۔ وہ اماں کے کلیجے میں گھس کر رات کو جب سوتا تو کتنا سکون اسکی رگ و پے میں اُتر آتا۔ ایک لامتناہی ابدی سکون اُسے ہمیشہ محسوس ہوتا۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا؟ مکتب سے جب لوٹا تو گھر مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ صحن میں چادر تان کر کچھ کیا جا رہا تھا۔ ایک سمت عارضی چولہا بنا تھا جس پر بڑے سے دیگ میں پانی ابل رہا تھا اور نہ جانے کیا کچھ اسمیں ملایا گیا تھا کہ پانی کا رنگ سفید سے زرد اور کچھ مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ سفید تہبند ململ کے کرتے اور میلی سی ٹوپی اوڑھے ایک شخص اس دیگ سے بالٹی میں گرم پانی انڈیلتا اور اسمیں ٹھنڈا پانی ملا کر بالٹی لئے پھر چادروں کے اندر گھس جاتا۔ اسکا ننھا سا ذہن یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ سی پارہ اور کتابیں سنبھالے دالان میں پہونچ گیا۔ آنکھیں حیران یہ مناظر دیکھ رہی تھیں اور عقل پریشان کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بہت سی عورتیں تھیں۔ کچھ نے برقعے پہنے ہوئے تھے۔ کچھ سر پر مصلے باندھے قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں، پورے دالان میں دری بچھی تھی۔ سب کے چہروں پر حزن و ملال تھا۔ ایک عجیب سی غمی سب کے چہروں پر منڈھی ہوئی تھی۔ آنکھیں جیسے ابھی رو کر خاموش ہوئی ہوں۔ وہ ایک ایک کو دیکھتا آگے بڑھا۔ سی پارہ اور کتابیں طاق میں رکھ دیں۔ اب اسکی آنکھیں اماں کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر کار اماں اسے نظر آ گئیں۔ بہت سی عورتوں کے درمیان دیوار سے پیٹھ لگائے خاموش، متوحش، متورم آنکھیں لئے یہی اسکی اماں ہیں؟ ایک لمحہ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے تو اماں کو مسرور و مطمئن اور مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے آتے ہی وہ کیسے کھل اٹھتی تھیں۔ آج کیا ہوا؟ انہوں نے نظر اٹھا کے بھی اسکی جانب نہیں دیکھا۔ وہ ان کے پاس جا ٹھہرا۔ اس نے دھیرے سے پکارا۔

"اماں"۔ پھر بھی جنبش نہیں ہوئی۔ آنکھیں کسی نکتے پر مرکوز اور ہونٹ کوئی دعا ورد کرتے ہوئے پھر کسی نے اماں کو احساس دلا کر متوجہ کیا۔!

"بھابی۔۔ دیکھو حسن۔۔ تمہارا بیٹا"۔

اماں کے بدن میں جنبش ہوئی۔ آنکھوں نے زاویہ بدلا اور اسکے سراپے پہ آ رکیں۔ اُف ! کتنی سرخ ہیں یہ آنکھیں۔ پھر کچھ ہوا۔ چند قطرے آنکھوں سے نکل کر رخساروں کو تر کرتے بہہ نکلے۔ دونوں ہاتھ اُٹھے۔ ورد کرتے ہونٹ لرزے اور اماں نے اسے اپنے اندر سمو لیا۔ وہ ان کے سینے سے ایسا لگا کہ مانو جہاں کی آسائشیں اسے میسر آ گئی ہوں مگر ان آسائشوں میں ایک درد کا احساس بھی پوشیدہ تھا اور یہ اماں کے لرزتے کانپتے وجود سے اس نے جانا۔ وہ رو رہی تھیں۔ مسلسل رو رہی تھیں۔ اور اسے اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ شاید انہیں ڈر تھا، اسے اپنے سے الگ کرتے ہی وہ تنہا ہو جائیں گی۔ نہ معلوم کتنے لمحے گزر گئے۔ پھر صحن سے کسی نے پکارا۔!

"میت تیار ہے۔ آخری دیدار کر لیں"۔

کسی بی بی نے اماں کی آغوش سے اسے کھینچ لیا۔ دوسری بی بی نے اماں کو سہارا دے کر اُٹھایا اور میت کے پاس لے آئیں۔ وہ بی بی اسکے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھے اُسے بھی میت کے پاس لے آئیں۔ کیا ہو رہا ہے یہ؟ کیوں یہ سب اسکے گھر آ گئے؟ مرد بھی عورتیں بھی۔ رو بھی رہے ہیں۔ آیات کو ورد بھی کر رہے ہیں۔ سب کے چہروں پر ایک جیسی تحریر نقش ہے اور پھر

اسے اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔تابوت میں کوئی سفید کفن میں لپٹا لیٹا ہوا تھا۔سارا بدن ڈھکا ہوا صرف چہرہ کھلا تھا۔ارے یہ تو اسکے ابا ہیں۔۔ہاں ابا ہی تو یہ۔۔یہ۔۔یہ انہیں کیا ہوا۔اس نے چہرے اُٹھا کر ان خاتون کو دیکھا جو اسے میت کے پاس لے آئی تھیں !

"حسن بیٹے۔۔اپنے ابا کو آخری بار دیکھ لو"۔

"ابا کو کیا ہوا؟"۔

"یہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے"۔

"کیوں؟"۔

"تمہارے ابا بہت نیک، بہت اچھے تھے نا اسلئے"۔

تو کیا ہر اچھے آدمی کو اللہ میاں بلا لیتے ہیں۔یہ تو انکی زیادتی ہے اور پہلی بار اسکے دل میں یہ ارمان بغاوت لئے پیدا ہوا ۔میں اگر اچھا نہ بنوں تو اللہ میاں مجھے اپنے پاس کبھی نہیں بلائیں گے۔میں ہمیشہ یہیں رہوں گا۔۔اسی دنیا میں ! اس نے ابا کو دیکھا۔کتنے اچھے تھے میرے ابا۔اتنے اچھے تو زندہ رہ کر بھی نہ لگے۔کیا کیا ہوتا رہا۔اماں سے جانے انجانے میں شوہر کی غلطی کی معافی دلوائی گئی۔کوئی مطالبہ بھی معاف کرایا گیا۔ہاتھ میں پہنی ہری اور دھاتی چوڑیوں کو توڑا گیا۔اماں خاموش، بے حس زبانی جو کہا گیا کرتی چلی گئیں۔پھر میت کو ڈھک دیا گیا۔چار لوگوں نے کلمہ پڑھتے ہوئے جنازہ اٹھایا اور گھر سے نکل گئے۔۔ بہت بہت دیر ہوگئی۔تلاوت مکمل ہونے کے بعد عورتیں اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔اماں اور وہ تنہا رہ گئے !

تین دن تک دوسرے گھروں سے ان کے لئے کھانا آتا رہا۔شاید پڑوسیوں کے گھر سے کیونکہ اسے تو یاد نہیں تھا کہ اس نے کسی کو چچا یا پھوپھی یا ماموں یا خالہ کہا ہو۔نہ کسی بچی یا بچے سے کبھی اسکا تعارف کرایا گیا تھا کہ حسن، بیٹے یہ تمہارا چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد یا خالہ زاد بھائی بہن ہیں۔تین دن بعد یہ سلسلہ بھی موقوف ہوا۔وہ پھر پابندی سے مکتب جانے لگا۔ابا کی ایک ماہ کی پنشن واجب تھی۔منشی آکر اماں کے ہاتھ پہ رکھ گیا۔وہ چند دن آسائش سے گزر گئے۔اماں بالکل خاموش ہوگئی تھیں۔زیادہ وقت اللہ کے حضور گزرنے لگا۔وہ جب مکتب سے واپس آتا یا محلے کے بچوں کے ساتھ چند ساعت کھیل میں بتا کر گھر لوٹتا تو اماں اسے کھانا کھلاتیں۔اپنے ساتھ وضو کرا کے نماز پڑھواتیں اور جب رات کو اسے ساتھ سلاتیں تو سونے سے پہلے ضروری دعائیں پڑھواتیں۔یہ ہر روز اور ہر رات کا معمول تھا !

وہ شاید ابا کو گزرے دوسرا مہینہ تھا۔منشی پھر لوٹ کر نہیں آیا۔اماں نے اپنا کوئی زیور پڑوسی چاچا کے ہاتھ بکوایا تھا۔اس سے ملی رقم سے گھر میں کچھ روز رونق رہی اور جب یہ رونق ماند پڑنے لگی تو پھر کوئی زیور بک جاتا۔دھیرے دھیرے گھر کی ہر وہ شے بک گئی جس کے عوض کچھ رقم مل سکتی تھی۔اب وہ سمجھدار ہو گیا تھا۔بچپن سے لڑکپن کی اس روش پر آٹھہرا تھا جہاں سے ایک جست میں جوانی کی حد میں قدم رکھا جا سکتا ہے ! وہ اماں بی کے چہرے پر جمی پریشانی کو صاف طور پر محسوس کرنے لگا۔اس کے شعور نے اسے آمادہ کیا۔خاندانی وجاہت نے غیرت دلائی اور ایک دن اس نے مولوی صاحب سے اپنی مالی پریشانی کا ذکر کر دیا۔مولوی صاحب ہمدرد انسان تھے۔انہوں نے بچے کے عزم کو دیکھا، آنے والے ہولناک حالات کا جائزہ لیا اور ازراہِ کرم اُسے سائیکل مرمت کی دوکان پر ۵ روپے روز پر رکھوا دیا۔مکتب سے چھٹی پا کر وہ سائیکل کی دوکان پر چلا جاتا اور مغرب

تک کام کر کے ۵ روپے محنتانہ لیتا۔ اور گھر آ کے اماں بی کے ہاتھ پر ۵ روپے کے پانچ سکے رکھ دیتا۔ اسے یاد ہے جب اُس نے پہلی بار اپنی محنت کا صلہ اماں کو دیا تھا تو ان کے تاثرات کتنے عجیب تھے۔ ان میں غصہ بھی تھا۔ سرزنش بھی تھی۔ اپنی بے کسی بھی تھی۔ آنے والی غربت کا احساس بھی تھا۔ آنکھ میں چھلکتے آنسو سارا افسانہ پل بھر میں کہہ گئے تھے ۔۔!

اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔ آج بھی حسو کے ذہن میں وہ دن روزِ اول کی طرح زندہ تھا۔ کبھی بھی کسی بھی مرحلے پر مردہ نہیں ہو سکا۔ اُسے یاد ہے اماں بی فجر کی اذان کے ساتھ اُٹھ جایا کرتی تھیں اور اپنے ساتھ اُسے بھی جگا لیتی تھیں۔ پھر وضو خود بھی کرتیں اسے بھی کراتیں، ساتھ نماز پڑھتے دونوں۔ اماں ناشتہ تیار کرتیں۔ ناشتے کے بعد وہ کپڑے پہن کر ٹوپی اوڑھ کر مسجد چلا جاتا۔۔ اس دن اسکا قرآن ختم ہونا تھا۔ اماں نے مولوی صاحب کے لئے رومال اور تسبیح منگا کر پہلے ہی رکھ لی تھیں۔ صرف ہار اور جلیبیاں لینا تھیں جو سویرے چندا کی دوکان سے منگوا لیتیں۔ وہ صبح اُٹھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مسجد سے اذان کی پہلی اللہ اکبر کی آواز کان میں آتے ہی اسکی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے چند پل کچھ سوچا۔ کلمہ پڑھ کر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ دوسری چارپائی پر سوتی اماں کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر اور وضو کر کے جب وہ کمرے میں آیا تو اماں اسی طرح سوئی ہوئی تھیں۔ اس نے دو تین بار انہیں آوازیں دیں لیکن جب وہ نہ جاگیں تو اس نے ان کو ہلایا مگر اماں کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔۔ وہ ڈر گیا۔ متوحش نگاہوں سے اماں کے چہرے کو دیکھا۔ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں ان کا پُرنور چہرہ تھام کر اٹھایا۔ اسکی آنکھوں سے کب آنسو چھلک کر ان کا چہرہ بھگو گئے وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ اور پھر ایکبار پھر وہی منظر اسکے کچے گھر کے صحن میں اُگ آیا جو ابا کی موت کے وقت ابھرا تھا!

وہ اکیلی جان تھا۔ جو کماتا اپنے پر خرچ کرتا۔ کبھی اماں اور ابا کے نام پر قرآن ختم کراتا اور انہیں بخش دیتا۔ ہر جمعہ کو ان تربتوں پر جاتا، نماز میں ان کی مغفرت کی دعائیں کرتا مگر زندگی کے ماہ و سال نے اتنی تیزی سے رفتار پکڑی کہ سارے احساسات، جذبات، محبتیں اور شفقتیں ایک ایک کر کے پیچھے چھوٹتی گئیں۔ وقت نے اسکے وجود میں سختیاں بھر دیں۔ چہرے پر عمر کا اضافہ نظر آنے لگا اور پوشیدہ جذبات جب تلاطم خیز ہوئے تو اُس نے ایک شریف گھرانے کی بیٹی سے شادی کر لی۔۔!

شریفن پوری طرح گھریلو ثابت ہوئی۔ بے زبان، صابر اور خدمت گزار۔ بہت سی خوبیاں تھیں اسمیں۔ کبھی کبھی تو اُسے یہ گمان ہوتا تھا جیسے اماں اسکے وجود میں پھر سے جی اُٹھی ہوں۔ جو کچھ کماتا اسکے ہاتھ پر لا کے رکھ دیتا۔ اور وہ عورت اللہ کا شکر ادا کرتی۔ اسی میں گزارہ دیتی۔ حسن، پھر حسو ہو گیا۔ یہ نام اسے کس نے دیا یا کیسے حسن سے حسو بن گیا، اُسے اب یاد نہیں۔ ہاں اس نے اچھا بننے کی ساری کوششیں چھوڑ دیں۔ اُسے یاد نہیں کہ کب اس نے نماز ترک کی۔ قرآن کو تو اس نے جب سے جزدان کیا پھر نہ کھولا۔ زکوٰۃ تو دور اس نے تو کبھی روزہ بھی نہیں رکھا۔ وہ شریفن کو اپنی ماں کی طرح دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسکے باپ نیک اور پارسا تھے، اس لئے اماں کو بیوگی ملی۔ شریفن کو بیوگی دینا نہیں گوارہ تھا اسے۔ ہاں شریفن کے کہنے پر وہ جمعہ کی نماز ضرور پڑھ لیتا مگر وہ بھی بے دلی سی!

لیکن ہر شے کا مقدر ہے۔ قدرت کے فیصلے اٹل ہیں۔ اُن میں سر مو فرق نہیں آ سکتا۔ نفیس کے پیٹ میں آتے ہی شریفن کے جسم میں نمایاں تبدیلیاں آ گئیں۔ وہ خوش تھا۔ ایک نیا اور تازگی دیتا مہکتا مہکتا پھول اسکی زندگی کی کیاری میں کھلنے والا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اس پھول کو سانس لے کر زمانے کو معصوم نظروں سے پہچاننا تھا مگر یہ پہچان ان کے رشتے کو

کربناک عذاب سے دوچار کرگئی۔نفیسن نے ادھر وجود حاصل کیا اور اُدھر شریفن نے کفن اوڑھا۔۔!

اور آج اُسی نفیسن کے لئے ایک نئے رشتے کی شروعات کرنے کوئی اس کے در پہ آیا تھا۔

''بھائی صیب۔۔بھائی صیب۔کاں گم ہو گئے؟''۔

''آں۔ہاں۔کہیں نہیں''۔وہ ہوش میں آکر بولا۔''کیا کرتا ہے تمہارا بیٹا؟''۔

''اے لو۔۔وئی مسل ہوئی۔بنئے کا لمدا مسالچی تو ہو گا نئیں، بنیا ہی رہے گا۔وئی نصیرا ہے۔ایک ہوٹل میں کھانا پکاوے ہے۔بھائی صیب ہمارے گھر میں تو چولہا بھی جلائی نہ۔نجیرا بھی پکوان بھرے رہوے تھا گھر میں اور نصیرا بھی طرح طرح کے کھانے لے آوے ہے۔آپ کی نفو بھی کھانے پکانے کی جھنجھٹ سے نچیت رئے گی ساری زندگی۔راج کرے گی راج''۔نذیرا کی گھر والی کا لہجہ ایک دم مدھم ہو گیا۔سرگوشی میں بولی۔

''نصیرا تو کہوے ہے، وہ اپنی جورو کو سلیما بھی دکھانے لے جاوے گا جب اسکا من کرے۔سیر سپاٹ بھی کراوے گا۔۔''پھر اونچے لہجے میں بولی۔''بس اب آپ جلدی سے ہاں کہدو۔لیو میں بھی نری پگلا گئی ہوں۔سگون تو باہیر ہی کھڑا رہ گیا''۔تب ہی دروازے پر کسی نے زور سے پکارا۔

''اماں۔۔او اماں۔میں کتے دیر کھڑا رہوں۔تو کیا بھول گئی''۔

''ارے نا رے۔۔تجھے نہ بھولوں، اسی کا جے تو دہلیز چڑھی ہوں۔آندر آجا''۔دروازہ کھلا۔ایک نوجوان ڈرتا جھجکتا صحن میں آگیا۔!

''بڑا سرمیلا ہے یہ۔آج کل کے نوجواں کے تو جرا بھی لچھن نہیں اسمیں۔آ پاس آ۔ارے ان سے کیا سرمانا۔وہ تو یہ ئی تیرے سب کچھ ہوویں گے''۔نصیرا دالان کے پاس آرکا۔حسو نے نظریں اٹھا کر جائزہ لیا۔قد کاٹھ سے تو اچھا ہے۔رنگت ملیح ہے۔ہاتھ پاؤں بھی چوکھے ہیں۔اُس نے اسکے چہرے پر نظر ڈالی۔آنکھوں میں سرمہ اور سر میں کوئی سستا سا تیل چپڑا ہوا تھا جو بہہ کر پیشانی تک آگیا تھا۔عجیب وضع قطع کا نوجوان تھا۔!

''ارے نصیرے۔بالکل ہی ہونق ہو رہا ہے۔۔بیٹا سلام کر''۔

''سام لیکم''۔اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔آواز بھاری تھی مگر اس سے اندازہ ہو گیا کہ تہذیب اور تعلیم اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔صورت شکل تو خاصی ہے مگر قومیت؟۔۔وہ تو ہر لحظہ اپنا تعارف دے رہی تھی اور اس پر سونے پہ سہاگا جب ماں نے بیٹے سے کہا۔

''ارے باؤلے۔۔یہ تو رکھ دے۔۔''نصیرا نے دیگچی زمیں پر رکھ دی۔پہلی بار حسو نے دیکھا۔اسکے دونوں ہاتھ دو دیگچیاں تھامے ہوئے تھے جو اس نے دالان میں رکھ دیں۔قلعی کی ہوئی صاف ستھری دیگچیاں جن پر تام چینی کی ڈھکنیاں تھیں اور جن کے پیندے آگ کی لو سے کالے ہو رہے تھے اور یہی کالونچ نصیرا کی قمیض پر بھی لگ گئی تھی۔۔!

''یہ کیا ہے؟''۔

''سگون ہے بھائی صیب۔نصیرا کے ہاتھوں کا پکایا ہوا قورمہ اور میٹھے چاول''۔وہ اس طرح فخر سے بولی جیسے اُس نے اس رشتے کے لئے اپنی ساری جمع پونجی قدموں میں ڈال دی ہو۔!

"مگر۔۔یہ کس لئے؟"۔

"لیو۔۔رستے کے لئے کھالی ہاتھ آنے کا رواج ہمرے گھر نہ ہے۔نصیرے کے ہاتھ کے پکے کھانے سے اچھا سگون اور کیا ہووے۔۔آپ ہی بولو بھائی صیب۔۔لڑکا آپ کا روبرو ہے۔اب اسے اپنی دامادی میں کبول کرلو بھائی صیب تو میری جندگی سوارت ہو"۔

حسو کافی دیر کچھ نہیں بولا۔وہ سوچ رہا تھا۔فیصلے کر رہا تھا۔بیٹی تھی۔آج اسے کسی کو تو سونپنا تھا مگر اسکی آنکھوں میں بصارت قایم تھی۔اندھے پن کا اظہار تو وہ کرتے ہیں جنہیں بیٹیاں بھاری لگتی ہیں لیکن نفیسن تو خدا کی طرف سے ودیعت کیا ایک ایسا تحفہ تھا جس نے شریفن اور اماں کو بیک وقت اسکے اندر زندہ رکھا تھا۔نذیرا جیسے باورچی کے بیٹے کو وہ داماد بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔اس نے نظریں اُٹھا کر نصیرا اور پھر اسکی ماں کو دیکھا۔نصیرا کو تو اس نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔وہ اسی طرح کھڑا سر ے بھری آنکھوں سے کبھی اسے اور کبھی چور نظروں سے اس کمرے کی طرف دیکھ لیتا جس کے اندر نفیسن روپوش تھی۔!

"تو بھائی صیب۔آپ کو یہ رستہ کبول ہے؟۔۔دیکھو نا نہ کرنا۔میرے بیٹے کا دل ٹوٹ جائے گا۔وہ مجنوں بن کے جنگل کو سدھار گیا بھائی صیب تو اس نگوڑ ماری عمر میں میرے کو پھر چولہا پھونکنا پڑے گا۔آپ میری بپتا کو سمجھ رئے ہیں نا بھائی صیب؟"۔

"میں سمجھ رہا ہوں"۔اس نے خود کو سنبھال کر حلیمی سے کہا۔"دیکھو بھا۔۔بی"۔اسے اس عورت کو بھابی کہنے میں عار محسوس ہو رہا تھا پر مجبور تھا۔!

"یہ فیصلے پل بھر میں تو ہوتے نہیں۔۔بیٹی کا معاملہ ہے۔ابھی آپ نے رشتہ دیا ہے۔کچھ سوچنے کا وقت دو مجھے۔۔"

"جیتے رؤ بھائی صیب اللہ آپ کو کھجر کی عمر بخشے۔آپ نے جی کھوش کر دیا۔آپ سوچو۔کھوب سوچو پر جب بھی فیصلہ کرو، میرے نصیرے کے حق میں ہی کرنا"۔

"ٹھیک ہے"۔پھر کہنے، ماننے اور منوانے کو کچھ رہا ہی نہ تھا۔نذیرا کی عورت اُٹھی۔غرارے کو سنبھالا اور بیٹے کو لئے دروازے سے نکل گئی !

حسو بہت دیر تک بیٹھا کھلے دروازے کی طرف نگاہیں گاڑے دیکھتا رہا۔پھر آہٹ پر ہی چونکا تھا۔خیالات کا سلسلہ منقطع ہوا تو اس نے دیکھا، نفیسن اسکے پاس آ گئی تھی۔!

"ابا۔۔یہ کیوں آئی تھی؟"۔

"بیٹیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو دروازے کی سانکلیں بج اُٹھتی ہیں۔بار بار۔۔کئی بار۔آج پہلی بار یہ سانکل بجی ہے۔"

نفیسن اسکی لایعنی باتوں کو پوری طرح کیا سمجھتی؟۔ہاں اتنا ضرور سمجھ گئی کہ نذیرا کی گھر والی اپنے نصیرا کے لئے اسکا رشتہ لے کر آئی تھی۔نفیسن نے دیگچیوں کو دیکھ کر پوچھا۔؟

"ان میں کیا ہے ابا؟"۔

"ایں۔ہاں۔جو بھی ہے، مسجد میں بھجوا دے۔مولوی کے گھر والے کھا لیں گے"۔

حسو کے مزاج پر ایکدم سنجیدگی اُتر آئی۔ابتک اس نے نفیسن کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔کئی دن اس نے سوچ و فکر

میں گزار دیئے۔ کوئی حل کوئی راستہ ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اسے اسکے مقصد تک پہونچادے۔ ایسے دوست یا بزرگ رشتے دار بھی نہیں تھے جو اسے مشورہ دے سکتے۔ ہر طرف اس نے نظر دوڑائی۔ ایک ایک چہرہ کا جائزہ لیا آخر روشنی کی ایک کرن اسے نظر آہی گئی۔ چہروں کی بھیڑ میں اُسے ایک چہرہ ایسا شناسا سا لگا جو کافی حد تک اسکی مشکلات میں معاون ہو سکتا تھا۔ اور وہ چہرہ تھا معشوق صاحب کا چہرہ۔ اس نے دیکھا تھا مگر دور سے۔ ان کی گفتگو سنی تھی جب چائے پینے کسی ٹیبل پر تنہا بیٹھا ہوتا اور معشوق صاحب حسب معمول حالات پر تبصرہ کر رہے ہوتے۔ نہ معلوم کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس پھکڑ اور بے فکرے انسان میں کہیں کوئی وقار کوئی وجاہت پوشیدہ ہے۔ اس نے بہت غور کیا ہر پہلو کا جائزہ لیا۔ باپ ہونے کے ناطے غیر مرد کو گھر بلانے میں جو قباحتیں مانع ہوتی ہیں ان پر سوچا۔ آخر کار وہ اسی نتیجے پر پہونچا کہ معشوق صاحب سے بہتر اسے کوئی اور نہیں مل سکتا۔ !

ایک دن ان چاہا بوجھ اچانک ہی اسکے شانوں سے اُتر گیا۔ یک بیک وہ خود کو مطمئن اور بشاش محسوس کرنے لگا۔ کام پر جانے سے پہلے اُس نے یہ اہم فرض ادا کرنا ضروری سمجھا۔ خیال بھی نہ آیا تھا کہ معشوق صاحب سے اسے کسی مدد کی ضرورت درپیش آسکتی ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ رہتے کہاں ہیں۔ بس اندازے سے وہ اس گلی میں داخل ہو گیا۔ جس میں ان کے ملنے یا رہنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ جھجکتا، خود کو سمیٹتا ہر دروازے پر نظر ڈالتا تھا کہ معشوق صاحب کا نام کسی دروازے پر لکھا نظر آجائے یا وہ خود دکھائی دے جائیں، آگے بڑھتا رہا۔ اسے خوش خوبی قسمت کہیئے یا قسمت کی یاوری تھی کہ جب وہ ایک دروازے کے قریب پہنچے تو اچانک ہی دروازہ کھلا اور کسی ہاتھ نے کاغذ کے چند ٹکڑے گلی میں بنے ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ حسو اتنا قریب تھا کہ وہ ٹکڑے اس پر بھی گر سکتے تھے۔ اس نے قدرے غصہ سے پھینکنے والے کو دیکھا اور جس چہرے پر اسکی نظر پڑی، اسکا غصہ کافور ہو گیا۔ ایک مسرّت سے چہرہ اچانک ہی دمک اُٹھا۔ وہ معشوق صاحب ہی تھے۔ شاید معشوق صاحب نے بھی حسو کو دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حسو کچھ بولتا، معشوق صاحب نے لپک کر اسے مخاطب کر لیا !

"ارے حسن صاحب آپ" ۔ یہ۔۔ یہ نام تو وہ کب کا فراموش کر چکا تھا۔ اب تک اسکا احساس بھی اسے اِس نام کی یاد نہیں دلاتا تھا۔ کجا یہ کہ کوئی زبان، کوئی چہرہ یا کوئی آواز اسے اس نام سے پکارتی۔ ہر شناسا اسے حسو کے نام سے ہی مخاطب کرتا رہا تھا۔ یہ نام تو اماں اور ابا کی تربتوں میں دفن ہو چکا تھا۔ اسکی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ صدیوں کا کرب چہرے کے تاثرات میں گھل کر اسکی وجاہت کو روشن کر گیا !

"یہ نام۔۔ آپ نے مجھے کس نام سے پکار لیا معشوق صاحب؟"۔

"اُسی سے جو آپ کا اصل نام ہے"۔ وہ اسطرح مسکرائے جیسے برسوں کی شناسائی ہو اس سے یا مدتوں وہ اسکے خاندان سے واقف رہے ہوں۔

"یہ تو ہماری روایت بن گئی کہ اصل نام کو فراموش کر دیتے ہیں اور عرفیت سے مخاطب کا انداز نباہے جاتے ہیں"۔ نپا تلا لہجہ۔ الفاظ کی بندش میں ٹھہراؤ۔ آواز میں ایک کشش جو سامنے والے کو رکنے، ٹھہرنے اور قریب آنے پر مجبور کر دے !

"آپ باہر کیوں ٹھہر گئے۔۔ اندر آجائیے"۔ وہ دروازے سے ہٹ گئے۔ حسو ڈرتا کچھ جھجکتا اندر داخل ہو گیا۔ ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا جس پر نفیس کشن پڑا ہوا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ درمیان میں

آرچ بنا تھا جس میں نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ غالباً اس جانب سونے کا کمرہ ہوگا۔ یہ بیٹھک تھی۔ متعدد کتابیں نفاست سے ریکوں میں سجی ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کی میز۔ چند کرسیاں، فرش انتہائی صاف، چھت میں کہیں جالا تک نہیں، سفیدی سے دمکتی دیواریں ان پر چند تصاویر کچھ طغرے اور بیرونی مناظر کی کچھ خوشنما پینٹنگز۔ کہیں کوئی کپڑا یا کوئی ایسی شے بے ترتیب نہیں جو مکین کی بد سلیقگی کا اظہار بن سکے ! اس نے ایک ہی نظر میں بھرپور جائزہ لے لیا۔ یہاں آکر اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن اور خود اعتماد ہو گیا !

"بس جناب یہی بے خانماں لوگوں کی بساط بھر رہائش ہے"۔

"تو کیا"۔۔ حسو کے سوال کا جواب معشوق صاحب کے پاس تھا۔ غالباً وہ ہونٹوں کے لرزنے سے یا لہجہ کی جھجک سے سمجھ لیتے تھے کہ سوال کیا کیا جاتا ہے۔

"جی حضور۔۔ خادم یہاں تنہا رہتا ہے۔ نہ کوئی پیچھے ہے۔ ہاں آگے بہت کچھ ہے۔ یہ وسیع دنیا ہے۔ اس میں جنم لیتے نت نئے حالات اور تجربات ہیں۔ اسی دنیا میں میاں حسن زمان خان جیسے میرا مطلب آپ جیسے مخلص اور بے ریا لوگ بھی رہتے ہیں"۔ انہوں نے بالکل صحیح نام لیا تھا۔ حسن زمان خان !

"یہ سب۔۔ اتنا کچھ آپ کیسے جانتے ہیں معشوق صاحب؟"۔

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔ "آپ کے والد رسول زمان خان اسی دنیا کے باشندے تھے جس دنیا کے باشندے ہمارے والد تھے"۔

"تو کیا۔ آپ کے خاندان سے۔۔"

"رشتہ تو نہیں رہا ایک دیرینہ قرب ضرور رہا تھا۔ آپ کو تو یاد کیا معلوم بھی نہ ہوگا مگر میں نے اپنی والدہ کی زبانی سنا تھا۔ دلی کہ ایک شہر تھا، وہ شہر آرزو۔ کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا اور اسی اجڑنے اور بسنے کے درمیانی وقفے میں کئی خاندان خانماں برباد ہو گئے۔ چھتہ نواب کی گلی اور کوچہ پنڈت میں یوں لاتعداد مکانوں کا فاصلہ تھا لیکن دلوں میں رتی بھر بھی دوریاں نہ تھیں۔ ہم خاندانی رئیس تھے تو تم بھی میاں کسی سے کم نہیں تھے۔ اشراف کے دو گھرانے ہم نوالہ ہم پیالہ تھے مگر افتاد کو کیا کہیے؟ قیامت آتی ہے تو زلزلے کی طرح ہر شے تہس نہس کر جاتی ہے۔ ہم اور تم کب اُس شہر سے اس شہر کے کمتر علاقے میں آبسے، کچھ نہ پوچھنا ہی بہتر ہے"۔ معشوق صاحب کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "پھر۔۔ آپ کے گھر کے لوگ؟"۔

"ایک ایک کر کے ملکِ عدم میں جا بسے۔ اسی طرح جس طرح تمہارے گھر کے لوگ"۔ معشوق صاحب ہولے سے مسکرائے۔

"سمجھدار اور نیک لوگ جہاندیدہ ہوتے ہیں۔ کمتر اور کم ظرفی انہیں راس نہیں آتی۔ اسی لئے انہوں نے جلد ہی اپنا ٹھکانہ وہاں۔۔ بہت اوپر بنا لیا۔ ارے لو۔۔ حسن صاحب، آپ پہلی بار میرے گھر آئے ہیں اور میں نے پانی تک کو نہیں پوچھا"۔

"نہیں جناب۔۔ ان سب تکلفات کی حاجت نہیں"۔ وہ خود ہی اپنے لہجے پر چونک اُٹھا۔ یہ نیا پن؟ نہیں نیا پن کچھ بھی نہیں۔ بس تھوڑی سی برف جم گئی تھی۔ تپش پا کر پگھل گئی !

"آپ رکیے۔ میں ابھی آیا"۔ وہ جھپاک سے دوسرے پورشن میں چلے گئے اور جب وہ آئے تو ٹرے میں دو کپ

چائے سے لبریز اور سبک سی طشتری میں چند بسکٹ لئے آئے۔ قریب کی تپائی پر ٹرے رکھکر پیالی اُٹھا کر حسو کے ہاتھ میں تھمادی ! چائے کا ذائقہ بھی بدلا ہوا تھا۔ زمانہ گزرا، اسے تو یاد بھی نہیں کہ اس ذائقے کی چائے اُس نے کبھی پی ہو۔ دم کی ہوئی اعلیٰ قلیور کی چائے اچھی اور خوشنما کراکری میں کچھ اور ہی جہان کی سیر کرا گئی اسے !

وہ چھوٹے چھوٹے سپ لیتا رہا۔ معشوق صاحب کے اصرار پر اس نے ایک دو بسکٹ کھائے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ معشوق صاحب کی سوالیہ نگاہیں اسکے چہرے پر بار بار آرکتی ہیں۔ وہ جو پوچھنا چاہتے ہیں۔ حسو وہ سب بتانے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا اور آخری گھونٹ حلق سے اتارتے اتارتے اس نے خود کو تیار کرلیا اور معشوق صاحب سے اپنا مدعا بیان کر دیا!

معشوق صاحب کا جواب حوصلہ افزا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسکا انتخاب غلط نہ تھا !

حسو کے گھر میں معشوق صاحب کا وہ پہلا دن تھا۔ گھر میں کہیں بھی کوئی سلیقہ نہ تھا۔ ایک وحشت، ویرانی کی حد تک مکینوں کی چشم پوشی اور بے حسی کا آئینہ دار تھی اور جب نفیس انکے روبرو آئی تو انہوں نے ایک ہی نظر میں اندازہ کرلیا کہ ہیرا تو ضرور ہے مگر ناتراشیدہ۔ اگر مشاق ہاتھ اسے باریکی سے تراش دیں تو اس گھر میں کسی چراغ یا سورج کی روشنی کی حاجت نہیں رہے گی !

اور پھر وہ ہوا جو حسو نے سوچا بھی نہیں تھا۔ معشوق صاحب کی اس گھر میں آمد نیک فعال ثابت ہوئی۔ معشوق صاحب صبح دس بجے آتے اور ۱۲ بجے واپس ہوجاتے۔ ان دو گھنٹوں میں نفیس ان سے ابتدائی تعلیم کے سبق لیتی اور جتنا ہوم ورک وہ دے جاتے اسے فرصت کے اوقات میں مکمل کرتی۔ دوسرے دن معشوق صاحب اسکا ہوم ورک دیکھتے، اسکے پڑھنے اور سیکھنے کی رفتار کا اندازہ لگاتے اور پھر آگے کے سبق اسے پڑھاتے !

ابتدا میں نفیس کو معشوق صاحب کی آمد انتہائی ناگوار گزری۔ اچھے خاصے سنجیدگی کی حد تک نوجوانی کی منزلیں گزار چکے معشوق صاحب کی پزیرائی اسکے اندر کوئی احساس نہیں جگا سکی۔ مرد وہ بھی تھے مگر اسکے ہونٹوں پر تو آج بھی رؤف کا دیا بوسے کا ہلکا سا لمس جاگ اُٹھتا تھا جو شراب کے پہلے خمار کی طرح اُسے مدہوش کر جاتا تھا۔ معشوق صاحب کا اس گھر میں آنا گویا بیرونی ہواؤں، اشاروں، فقروں اور نظر بازیوں پر پابندی لگا جانے کے مترادف ثابت ہوا۔ دن بھر گھر میں اینڈ ے رہنے کی وہ اتنی عادی ہو چکی تھی کہ کتابوں میں سر کھپانا گویا کھر دری اور پتھریلی زمین پر کوئی خوشنما عمارت کھڑی کرنا یا کسی بنجر زمین کو ہموار کر کے لہلہاتی فصل میں تبدیل کر دینا انتہائی کار دارد تھا مگر معشوق صاحب نے بھی ٹھان لیا تھا کہ وہ یہ کارنامہ کر کے دکھائیں گے اور ۳۰ دن کی مسلسل کوشش نے ان کے صبر اور استقلال کو اعتماد سے روشناس کرا دیا !

نفیس نے خود میں ایک تبدیلی محسوس کی۔ یہ تبدیلی یہ بدلاؤ اس میں کب آگیا، اسے سمجھنے کی اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ چونکہ اب زندگی تیز رفتار ہو گئی تھی۔ وہ گھڑیاں جو کاٹے نہیں کٹتی تھیں اب کب شروع ہوتی ہیں اور کب ختم پتہ ہی نہیں چلتا۔ اب دن بھر اینڈتے رہنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ رات کو جب وہ تنہا بستر پر لیٹتی تو ایک چہرہ جوانی سے بھرپور چہرہ اسکے سارے بدن پر جاگ اُٹھتا تھا۔ وہ چہرہ ہوتا تھا رؤف کا جس نے اُسے مرد کے اولین قُرب سے متعارف کرایا تھا۔ اسکے ہونٹ پھر اسی لیکن طویل بوسے کی طلب میں کھلتے اور بند ہوتے رہتے مگر ادھر کچھ دنوں سے وہ چہرہ دھندلا گیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں اب کاپی پر لکھے حروف بصارت بننے لگے تھے۔ ان حروف کی تعبیر اسے اپنی بند پلکوں پر خواب بن کر دستک دینے لگی تھی۔ رفتہ

رفتہ وہ دھندلا چہرہ گہرے گہرے اور پھر طویل تاریکی میں کہیں کھو گیا۔ ایک نکھری تازگی، ایک خوابناک احساس نور کی کرنوں سے مزین سویرا اسکے وجود کی انگنائی میں اُترنے لگا۔ اسکے معمولات پہلے جیسے نہیں رہے۔ وہ اب بجنے سنورنے لگی تھی مگر اس بجنے سنورنے میں بے انتہا سادگی ہوتی تھی۔ رؤف کی دی ہوئی لپ اسٹک کب کی کوڑے دانی میں پہونچ چکی تھی۔ بنا میک اپ کے چہرے پر ایک نور اتر آیا تھا جو عورت کے حسن کی قدرتی آرائش ہوا کرتا ہے۔ کپڑوں میں اور خود اسمیں سلیقہ آیا تو گھر میں بھی سلیقہ دکھائی دینے لگا۔ حسو کا وہ بستر جو ہفتوں اپنی جگہ نہ چھوڑتا تھا اب ہر دوسرے دن دھلی چادر اور دھلے تکیوں کے غلافوں سے مزین نظر آنے لگا۔ دالان میں اماں کے زمانے کی نماز کی چوکی آ بچھی۔ اسپر صاف دری اور دری پر جانماز بچھی رہتی اور ایک جانب اونچے طاق پر رحل پر قرآن پاک جیسے سارے گھر میں ایمانی کرامات سے روشن ہوا ٹھا۔۔۔!

حسو کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی گھر ہے جس میں آکر اُسے وحشت ہوتی تھی۔ اب یہ عالم ہے کہ گھر سے جانے کو طبیعت نہیں کرتی تھی۔ دیوار سے ملحق کیاریوں کو اینٹ اور گارے سے پھر سے بنا دیا گیا تھا اور کھریا لال مٹی سے ان اینٹوں کو رنگ دیا گیا تھا۔ کیاریوں میں گلاب، موگرے اور رات رانی کے پودے دھیرے دھیرے سر اُٹھانے لگے تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ اور جب اسکے سامنے کھانا آتا تو سینی میں نفاست سے پلیٹ میں سالن، کوئی دال یا سبزی ہوتی اور ساتھ میں گرم گرم پھولی پھولی روٹیوں کا تولہ۔ پھر پانی کا گلاس چم چم کرتا کہ پانی کی تہہ میں نظر آجائے۔ سچ ہے پاکیزگی نصف ایمان ہوتی ہے۔ یہ سب تو شریفن کے زمانے میں بھی نہ تھا۔ حسو کا انتخاب آخر کار رنگ لے آیا اور معشوق صاحب نے اس ناتراشیدہ پتھر کو ہیرے کی چمک دے ہی دی۔۔!

نفیسن کہاں تو ابتدا میں معشوق صاحب کے وجود سے بیزار ہو جایا کرتی تھی اب کہاں یہ عالم کہ ان کی آمد کی منتظر رہتی تھی۔ اتنے عرصہ میں انہوں نے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ دس بجے کہ ان کی دستک دروازے پر اُبھری۔ وہ جب آتے دستک دے کر آتے۔ نہ معلوم کیوں نفیسن کو یہ آرزو رہتی کہ وہ کبھی بنا دستک دیئے گھر میں آجائیں۔۔ ان کے آنے سے قبل، بہت پہلے وہ تیار ہو جاتی، دروازے کی سانکل گرا کر اُسے نیم وا کر دیتی۔ سفید لٹھے کو گہرے کتھی رنگ میں رنگ کر لیبھریوں میں جھولتے پردے کی جگہ ڈال دیا گیا تھا۔ اس پردے کو تھوڑا سا سرکا بھی دیا جاتا تا کہ معشوق صاحب کا آنا اسکی آنکھ سے پوشیدہ نہ رہے۔ نظر کبھی گھڑی پر اور کبھی دروازے پر جا ٹکتی اور پھر دس کا پہلا گھنٹہ بجتے ہی دروازے پر مخصوص دستک اُبھرتی اور نفیسن کے "آجائیے" کہتے ہی معشوق صاحب اندر آجاتے۔ ایک نظر نفیسن پر ڈالتے، اسکے سلام کا جواب مسکرا کر دیتے اور تخت پر آبیٹھتے۔ نفیسن کی کتابوں اور کاپیوں پر لکھے اسکے ہوم ورک کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے، ضروری اصلاح دیتے تب تک نفیسن چائے اور لوازمات ٹرے میں سجائے آموجود ہوتی۔ معشوق صاحب چائے کا کپ اُٹھا کر چھوٹے چھوٹے سپ لیتے اور نفیسن کی پڑھائی شروع ہو جاتی۔ اردو ادب، جغرافیہ، تاریخ، انگریزی، ہندی وغیرہ کے منتخب مضامین نفیسن کے ذہن نشین ہوتے جاتے۔

"آج میں تمہیں ہندی کا کاویہ پاٹھ اور اردو شاعری کا فرق سمجھاؤں گا"۔

اور وہ جو کچھ کہتے نفیسن انتہائی محویت سے سنتی رہتی۔ مضمون سے زیادہ اسے مضمون بیان کرنے والے سے دلچسپی رہتی۔ معشوق صاحب نے کتنا وقت گزارا ہوگا یہ سب سیکھنے میں؟ ایک عرصہ؟ ایک زمانہ؟ یا پھر ایک عمر؟۔۔ مگر بہت کم بہت ہی

کم وقت میں اپنی زندگی کا سارا تجربہ، سارا نچوڑ اور سارا اساسہ نفیسن کے نا پختہ شعور اور نا پختہ ذہن میں ڈال دیا تھا کہ وہ دنیا کی لامحدودیت کو اس محدود چار دیواری میں بیٹھی جاننے اور پہچاننے لگی تھی مگر اب اسے دنیا کو جاننے اور پہچاننے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ ہاں اب کوئی خواہش اسکے اندر پیدا ہوتی تو معشوق صاحب بھی نفیسن کے اس بدلتے اور پل پل ایک ہی رنگ میں ڈھلتے رویئے کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکی جب عورت بننے کی آرزو کرتی ہے تو کونسے خواب اسکے وجود میں جاگتے ہیں۔ کونسی تمنا اسے رت جگوں پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ آرزو وہ تمنا ہوتی ہے اپنے پسندیدہ مرد کی قربت۔ اگر عورت بے باک ہے تو اظہار کرنے سے نہیں چوکتی اور اگر اسکے اندر فطری شرم وحیا اور پرورش کرنے والے ہاتھوں کی پاکیزگی شامل ہے تو زمانے گزر جاتے ہیں، مدعا اظہار کا ذریعہ نہیں بنتا۔ کبھی جب وہ نفیسن کی گرم نگاہی اور جوان قرب سے گھبرا جاتے تو خود اپنا جائزہ لے ڈالتے۔ عمر کی منزل تو کب کی طے کر چکے تھے جب آتش لاوا بن کر جوان دھڑکنوں میں کھولتا ہے اور کسی کو پا لینے کی بغاوت پر اُکساتا ہے۔۔ جذبات کی تلاطم خیزی سبک رو دریا میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن سامنے والا تو ابھی اسی منزل پہ رُکا ہوا تھا۔ ابھی اسکے جذبات، احساسات کی نوخیزیت اپنا سفر طے نہیں کر پائی تھی۔ بہت تضاد تھا دونوں میں۔ عمر کا بھی احساسات کا بھی۔۔ نفیسن اور معشوق صاحب کی عمروں میں نصف کا فاصلہ تھا۔ نفیسن نے جوانی کا سفر شروع کیا تھا اور معشوق صاحب، یہ سفر طے کر چکے تھے۔۔ بارہا نفیسن کی انگلیاں ان کے ہاتھوں سے مس ہو جاتی تھیں تو جسم کے وہ مسامات جھنجھنا اُٹھتے جن کی طرف سے انہوں نے ہمیشہ لاپرواہی برتی تھی مگر کب تک؟ دونوں گھر میں تنہا ہوتے، کوئی اور ان کا نگراں نہ ہوتا، بہکنے کو ایک پل ایک لمحہ بہت ہوتا ہے۔ یہاں تو عالم یہ تھا کہ ہر دن چوبیس گھنٹے میں سے دو گھنٹے وہ بالکل آزاد ہوتے۔ کچھ بھی کرنے کو اور کیسے بھی کرنے کو۔ مگر جہاں نفیسن کی شرم مانع رہتی وہیں معشوق صاحب کا صبر دامن گیر رہتا!

حسو بھی آخر باپ تھا۔ جب تک وہ اپنے کام سے باہر رہتا اسے نفیسن کی فکر ستاتی رہتی، اس نے یہ قدم اُٹھا تو لیا تھا مگر معشوق صاحب کیا اسکے اعتماد اسکے بھروسے پر کھرے اُتریں گے؟ اکثر جب وہ بہت زیادہ فکر مند ہو جاتا تو بے اختیار گھر کی طرف چل پڑتا۔ کس حالت میں پائے گا وہ دونوں کو؟ تمام راستے وہ سوچتا آتا اور بنا آواز دیئے دروازہ کھول کر جب وہ بے ساختہ اندر قدم رکھتا تو دونوں کو استاد اور شاگرد کے عام میں پاتا۔ وہ پڑھا رہے ہوتے اور نفیسن محویت کے عالم میں پڑھ رہی ہوتی۔ وہ جائزہ لیتا۔ دونوں میں خاصہ فاصلہ رہتا۔ معشوق صاحب کی نظریں جھکی ہوتیں تو نفیسن کا سر ڈوپٹہ سے ڈھکا ہوتا!

حسو خود سے شرمندہ ہو جاتا اور کوئی بہانہ بنا کر وہ جلد ہی پھر باہر نکل جاتا!

سعیدا، حمدو، زاہد کو معشوق صاحب کی مصروفیت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اکثر ان پر چھینٹا کشی کرتے لیکن ان سب کا جواب معشوق صاحب اپنی ایک مسکراہٹ سے دے کر اور نابالغ کپوں میں چائے سے ان کی خاطر کر دیا کرتے تھے۔۔ بس اور کچھ نہیں!

نذیرا کے بیٹے نصیرا کے رشتے کا شگون حسو واپس کر چکا تھا۔ دونوں دیگچیاں بنا دھوئے اور مانجے واپس کی جا چکی تھیں۔ ان دونوں پر توے کی کالونچ لگا کر یہ اشارہ دے دیا گیا تھا کہ رشتہ نہیں ہو سکتا!

گھر کے بدلتے حالات، صحن و در میں اُترتی نیکیاں اور ہر بن مو سے جھانکتی پاکیزگی نے حسو کو بھی بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اب کام سے لوٹتے ہی وہ پہلے غسل کرتا پھر صاف کپڑے پہنتا اور دالان میں اپنی مخصوص جگہ آ بیٹھتا۔ نفیسن اتنی دیر میں چائے لے آتی!

"نفیسن"۔

"ابا۔اب نفیسن نہیں۔ مجھے نفیس کہا کیجئے"۔ اسنے حیرانگی سے نفیسن کو دیکھا اور اسکے لہجے پر غور کیا جسمیں احترام اور نفاست تھی۔!

"وہ کیوں بھئی؟"۔

"معشوق صاحب نے بدل دیا۔ انہوں نے کہا تمہارا نام نفیس ہے۔ نفیسن کے معنی بھی انہوں نے سمجھائے۔ نفیس یعنی نفاست جس میں سلیقہ ہو، خوبصورتی ہو، حسن ہو اور پاکیزگی ہو۔ اور نفیسن ایسا لگتا ہے جیسے شفاف آئینے پر کسی نادان نے کیچ ڈالدی ہو"۔ نفیسہ کی آواز ستھری اور لہجہ صاف تھا اور اس لہجہ میں ایک چاشنی گھلی ہوئی تھی جو معشوق صاحب کے ذکر سے اور مٹھاس دے اُٹھتی تھی۔

"ابا۔۔ معشوق صاحب نے ہمیں گھر بیٹھے دنیا سے روشناس کرادیا۔ تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، شاعری ادب سب سے۔۔ انہوں نے انگریزی لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا بلکہ مجاز، اختر شیرانی کی رومانی شاعری، اقبال کے فلسفے اور غالب کی زبان دانی سے بھی آگاہ کیا۔ میں تو سمجھتی تھی دنیا بس اتنی گھر جتنی ہے مگر دنیا تو بہت وسیع ہے۔ اب جبکہ میں ان رموز سے آگاہ ہو چکی ہوں، یہ اچھی طرح جان گئی ہوں کہ عورت چاردیواری سے بے شک باہر نکلے لیکن حقیقی دنیا اسکی یہی چاردیواری اسکا گھر اسکے بچے۔۔ اسکا۔۔ شو۔۔۔" "وہ شوہر ادا نہیں کرپائی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہنے جارہی تھی۔ اسکا مخاطب تو اسکا باپ تھا، جسکا احترام کیا جاتا ہے، بے تکلفی میں ہر راز نہیں کھولا جاتا۔۔ وہ پیالی اُٹھا کر اندر بھاگ گئی اور حسو کو سوچنے کا بہت کچھ مواد دے گئی۔!

فجر کی پہلی اذان پر وہ جاگ اُٹھا۔ اس نے ضروریات سے فراغت پائی اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ گو پانی ٹھنڈا تھا مگر اسے فرحت بخش لگا۔ اُس نے وضو کیا۔ سر پر رومال لپیٹا اور سائکل کھول کر مسجد روانہ ہوگیا۔ اُف! کتنا زمانہ گزر چکا۔۔ وہ تو یہ سب چھوڑ چکا تھا۔ آج اسکے اندر اچھا بننے اور اچھے سے زیادہ نمازی بننے کی خواہش نے اسے بے چین کردیا! نماز میں جتنا وقت گزرا وہ ساری عمر کا ماحصل تھا۔ اللہ کا قرب پا کر اسکے اندر جیسے نیکیاں اُتر آئیں اور ان نیکیوں نے اُسے پھول کی طرح ہلکا پھلکا کردیا۔

انسان کا ہر سفر جاری رہتا ہے۔ اچھائیوں کی طرف بھی اور برائیوں کی جانب بھی لیکن جو سفر اچھائیوں کی جانب گامزن ہوتا ہے اس سے قلبی سکون دنیاوی ساری لذتوں سے زیادہ معنی رکھتا ہے۔ یہی قلبی سکون برائیوں کی جانب دیکھنا بے معنی کرجاتا ہے اور اسے اعتمادِ خودی حاصل ہوجاتی ہے۔

معشوق صاحب، نفیسہ کی بڑھتی ہوئی محویت سے، اسکے انہماک اور اپنی جانب رواں اسکے جذبوں سے انجان نہیں تھے۔ گو ابھی سب کچھ مخفی تھا، اظہار کا موقع نہیں آیا تھا اور وہ اظہار کا موقع دینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ نفیسن سے ان کا رشتہ صرف استاد اور شاگرد کا رشتہ رہے، اس سے آگے کسی بھی رشتے کی قایمی کے وہ قایل نہیں تھے۔ یا شاید انہوں نے خود کو قایل کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ عمروں کا تضاد بھی اُن کے پیشِ نظر تھا۔ وہ اُس سے بھی دامن بچانا چاہتے تھے جسے محبت کا نام دیا گیا ہے۔ اور محبت جب دیوانی ہوتی ہے تو اپنی راہ کی ہر شئے کو تہہ و بالا کرتی گزر جاتی ہے، پھر وہ چاہے تناور درخت ہوں یا تلاطم خیز

،منہ زور ندیوں کے پانیوں پر بند ھے باندھ ہوں لیکن ساری کوششیں ،ساری کاوشیں ان کی اپنی چشم پوشی نفیسن کے بڑھتے قدموں کو اپنی جانب بڑھنے سے نہ روک سکیں۔ایسا لگتا تھا جیسے ساری ہوائیں نفیسن کے گھر کی منڈیر پر اترتی ہوں اور شہر کے سارے راستے اسکی گلی پر آ کے ختم ہوتے ہوں۔وہ شہر میں کہیں بھی ہوں، مقررشدہ وقت پر کوئی جذبہ انہیں نفیسن کے روبرو لے آتا تھا۔وہ تو نظر بھر بھی نفیسہ کو نہیں دیکھتے تھے کہ نگاہیں کسی اندرونی پیغام کے اظہار کا ذریعہ نہ بن جائیں لیکن اُس دن ان کی ساری کوششیں ساری لاتعلقی رائیگاں ہوگئی جب انہوں نے نفیسہ کی کاپی اُٹھا کر کھولی تو اسکے اندرونی صفحے پر یہ شعر لکھا دیکھا۔

م کے نام

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کفر ہے۔۔لا اپنا ہاتھ دے میرے دستِ سوال میں

ن کی طرف سے

گو خط میں پختگی نہیں تھی لیکن یہ شعر نفیسہ کے جذبات کا اظہار تھا۔ایک عام سا شعر جسے جو کوئی بھی پڑھے اور اچھا شعر کہہ کر بھول جائے لیکن معشوق صاحب،اُن ہر کوئی میں شامل نہیں تھے۔یہاں اس گھر میں صرف دو مرد تھے۔ایک مرد کے لئے یہ شعر ہو ہی نہیں سکتا تھا چونکہ لکھنے والے سے اسکا رشتہ انتہائی تقدیس کا رشتہ تھا۔تو پھر دوسرا مرد؟۔۔اس سے آگے سوچنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا لیکن سوچ تو پھر سوچ ہوتی ہے۔لاکھ پہرے بٹھاؤ پابندیاں عائد کرو سوچ اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔انہوں نے کاپی کے ورق پر لکھے شعر کو کراس کی شکل میں منقطع کر دیا اور کاپی کو اسی طرح بند کر کے رکھ دیا۔

وہ رات کروٹ بدلتے گزری۔زندگی نے کبھی اس کیفیت سے انہیں نہیں نوازا تھا۔کشاکشِ حیات نے ہر جذبے سے انہیں گریزاں رکھا تھا۔انہوں نے عمر کی مسافتیں تنہا طے کی تھیں۔کوئی قریبی رشتہ ان کے نزدیک نہیں رہا تھا۔جو رشتے تھے بھی تو واجبی سے تھے۔ملے تو مل گئے نہ ملے تو شکوہ نہ شکایت لیکن انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایکدن کیف و جذب کی اس منزل پہ آ ٹھہریں گے جسے عرف اور لفظِ خاص میں محبت کا نام دیا گیا ہے! صبح جب انہوں نے بستر چھوڑا تو وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے۔اس فیصلے میں گو ان کے لئے بھی اذیت تھی اور سامنے والے کے لئے بھی اذیت تھی لیکن بہر حال اپنا فیصلہ انہیں سنا دینا تھا۔وہ سارے راستے سمیٹ لینا چاہتے تھے جو اس گلی پر آ کے ختم ہوتے تھے۔۔یہی ایک راہ نفیسہ کے لئے مناسب تھی۔

حسب معمول مقررہ وقت پر وہ نفیسہ کے روبرو تھے۔نفیسہ نے اُسی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا جسطرح سے وہ ابتک کرتی آئی تھی۔ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔اسکا مقصد یہ کہ اُس نے ان کے اس اشارے کو نہیں دیکھا جو انہوں نے شعر کو کاٹ کر واضح طور پر دیا تھا یا دیکھا تو سمجھا نہیں۔وہ الجھ سے گئے۔انہوں نے آج جغرافیہ جیسے خشک مضمون سے پڑھانے کی ابتدا کر دی۔کچھ ہی دیر گزری تھی کہ معشوق صاحب نے محسوس کیا کہ نفیسہ کا انہماک تو اسی طرح قایم ہے لیکن خود ان کا انداز بدلا ہوا ہے۔انہوں نے بھٹکے خیالات کو یکجا کیا اور پھر پڑھانے لگے لیکن نہیں۔آج ان کی نظروں سے الفاظ دھندلا رہے تھے۔زبان صحیح ادائیگی نہیں کر پا رہی تھی۔ایسا کیوں ہے؟۔۔ اس سے قبل تو کچھ نہ تھا؟۔۔پھر آج۔انہوں نے بے ساختہ نظریں اُٹھا کر نفیسہ کو دیکھا،وہ انہیں کو دیکھ رہی تھی۔دونوں کی نظریں ملیں۔نفیسہ مسکرا دی لیکن معشوق صاحب لڑکھڑا گئے۔گڑبڑا کر

انہوں نے ماتھے پر آئے پسینے کو ہاتھ سے پونچھنا چاہا لیکن انہوں نے محسوس کیا کی انگلیوں میں بھی لرزش تھی۔ حلق میں کانٹے سے اُگ آئے تھے۔!

"پا۔۔ پانی۔ ایک گلاس پانی"۔

"جی ابھی لائی"۔ اُن کی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا۔ وہ چھپاک سے اُٹھی اور کچن میں گھس گئی۔۔ اس نے پانی لانے میں خاصی دیر لگادی۔ وہ معشوق صاحب کے ردِّ عمل کو پوری طرح سمجھ لینا چاہتی تھی۔ آج جوان پر کیفیت طاری تھی وہ یقیناً اس شعر میں چھپے اظہارِ الفت کی وجہ سے تھی گو کہ انہوں نے اس شعر کو کاٹ کر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اُس نگر کے باسی نہیں ہیں جس کی زمین سے ایسے انگور پھوٹتے ہیں۔۔ لیکن آج۔۔ آج جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس نے نفیسہ کو جھوم اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس طشتری میں رکھا اور دروازے کی اوٹ سے دیکھنے لگی۔۔ معشوق صاحب وہی کاپی تلاش کر رہے تھے۔ سرخ کور کی کاپی سب سے الگ اور سب میں واضح تھی۔ معشوق صاحب نے بے قراری سے کاپی کھولی۔۔ وہ شعر اسی طرح لکھا تھا اور اسی طرح کاٹا ہوا تھا جسطرح معشوق صاحب نے کاٹا تھا۔ انہوں نے آگے نظر ڈالی۔ کوئی ریمارک نہیں تھا۔ ایک لمحے کو انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ خاصے مطمئن سے ہو گئے۔ اناپاس ہی ان کی انگلیوں نے دوسرا صفحہ الٹ دیا اور دوسرے ہی لمحے ان کا اطمینان غارت ہو گیا۔ یہ تو ان کے ہوش وحواس پر ایک اور تازیانہ تھا۔ بہت سنبھل کر اور بہت ٹھہر کر اُن کے ردِّ عمل کے جواب میں دوسرا شعر لکھا ہوا تھا اور مخاطب بھی وہی تھے۔

م کے نام

تم لاکھ چھپاؤ سینے میں ارمان ہماری چاہت کا

دھڑکا ہے تمہارا دل جو وہاں آواز یہاں تک آئی ہے

اپنی میم کی ہمیشہ۔۔ ن!

اب ان کے برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے قلم اُٹھایا کہ اس شعر کو بھی کاٹ دیں لیکن ادراک نے انہیں روکا۔ عقل نے سمجھایا۔۔ شعر کاٹنا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ یہ سلسلہ اسیطرح چلتا رہے گا۔ وہ لکھے گی۔۔ تم کاٹ دو گے۔۔۔ پھر جو بات حیا کے پردے میں ہے کل الفاظ اور آواز کا جامہ پہن کر عیاں ہو جائے گی۔ انہوں نے قلم میں کیپ چڑھا کر اسے واپس جیب میں لگایا اور کاپی کو بند کر کے اسکی جگہ پر رکھدیا۔ نفیسہ نے یہ سارا جائزہ لیا اب اسکا زیادہ دیر لگانا غیر مناسب تھا۔ وہ گلاس لئے آئی اور معشوق صاحب کے قریب آ ٹھہری۔ معشوق صاحب اتنے خیالات میں مستغرق تھے کہ نفیسہ کی آمد کی انہیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔

"پانی لے لیجئے"۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ نفیسہ لاتعلق سی پانی کا گلاس لئے کھڑی تھی۔ وہ پھر گڑبڑا گئے۔ انہوں نے جھپٹ کے گلاس طشتری سے اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں پی گئے۔!

"اور لیجئے گا؟"۔

"نہیں۔۔ بس"۔

"میں چائے لاتی ہوں"۔

''حاجت نہیں ہے''۔

''کیوں نہیں ہے؟۔۔ ہر روز تو پیتے ہیں''۔

''وہ۔۔ میں۔۔ بس۔۔ یونہی''۔

''بس ابھی لائی''۔ نفیسہ ان کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ جانے کے لئے پلٹی تھی کہ یکا یک انہوں نے اس کی کلائی پکڑ کر روک لیا۔ نفیسہ ٹھہر گئی۔ کلائی اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ معشوق صاحب پھر گھبرا گئے۔ کلائی انہوں نے غیر ارادی طور پر پکڑی تھی۔ اسمیں ان کے کسی عمل کو دخل نہیں تھا۔ پھر ایسا لگا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہو۔ کلائی تو انہوں نے چھوڑ دی اور خود پسینے میں شرابور ہو گئے۔ یہ سوچ کر ہی انہیں شرمندگی نے آگھیرا کہ اگر حسو آجاتا اور اسطرح نفیسہ کی کلائی تھامے انہیں دیکھ لیتا تو شاید پھر وہ شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے مگر شکر ہے، دروازہ اسی طرح بند تھا۔! نفیسہ نے ان کی گھبراہٹ اور بدلتی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کیا اور ایک اندازِ دل رُبانہ سے بولی۔

''چائے تو آپ کو پینا ہی پڑے گی۔ کم سے کم آپ خود پر قابو ہی پالیں گے''۔

''نہیں۔ تم رُکو۔۔ مجھے۔۔ تم سے کچھ کہنا ہے''۔ ان کی نظریں اب ایسی جھکی تھیں کہ اُٹھنے کا ارادہ کھو چکی تھیں!

''جی۔۔ فرمائیے۔۔ میں سن رہی ہوں''۔

''حسن صاحب نے جو خدمت مجھے سونپی تھی، آج وہ پوری ہو گئی۔ تم تعلیم مکمل کر چکی ہو۔ اب۔۔ اب میرا یہاں آنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ لہٰذا۔۔ آج۔۔ آج کے بعد میں پھر یہاں نہیں آؤں گا''۔

وہ تیزی سے اُٹھے اور صحن پار کر کے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ یہ۔ یہ کیا ہوا؟ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اتنے بیدردانہ رویئے کی تو اسے توقع ہی نہیں تھی۔ وہ ہکا بکا جڑسی کھڑی رہ گئی!

شکستگی اگر جذبوں کی ہو تو دلِ زار کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔ معشوق صاحب کا لوٹ کر نہ آنا نفیسن کے لئے اسکے جذبوں کی شکستگی ہی تھا۔ عورت کو قدرت نے صبر اور استقامت کے جذبات سے سرشار کیا ہے لیکن جب محبت عشق اور عشق وارفتگی اور وارفتگی بے خودی کا پیراہن بھی تیاگ دے اور وجود جوگن کا روپ اختیار کر لے تو صبر، استقامت کی حد میں نہیں رہتا۔ چند مہینوں کی رفاقت نے نفیسہ کو اُس حقیقی جذبے سے متعارف کرا دیا تھا جسے محبت کہتے ہیں، ورنہ وہ تو ان سب سے ناآشنا اور ہر شے سے بے بہرہ تھی۔ مست، لاأبالی۔۔ وہ تو جوانی کو بھی نہیں سمجھتی تھی کہ جوانی کیوں آتی ہے؟۔۔ اسکے آنے سے کیا کیا ہنگامے بپا ہوتے ہیں۔ کیا کیا فتنہ جگاتی ہے اور کون کون سے حشر، قامت سے اتر کر قیامت کی شکل اختیار کرتے ہیں لیکن معشوق صاحب نے اپنی لاپرواہی، خشک مزاجی اور بہ ظاہر اسکو مسلسل نظر انداز کئے جانے نے نفیسہ کو معشوق صاحب کا ایسا گرویدہ کیا کہ وہ اُس کگار پر آکھڑی ہوئی جہاں ہوش اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اُس نے تو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اپنی طرف نگاہیں اُٹھتی دیکھی تھیں ان نگاہوں میں اپنے لئے اُمنڈتی چاہت محسوس کی تھی لیکن آج معشوق صاحب کی محبت پا کر اس نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ اُن نگاہوں میں ہوس ہی ہوس تھی جبکہ معشوق صاحب کی نظروں میں اسکا احترام تھا۔ اسکے وجود کا پاس تھا۔۔ وہ بلاوجہ نگاہ بھر کر اُسے دیکھتے بھی نہ

تھے اور جب دیکھتے تھے تو اُن نگاہوں میں اسکے حسن کی تعریف اور اپنے احساس کا خالی پن ہوتا تھا۔ حسن کو جب مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہے تو اسکی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے اور حسن میں اسے پانے یا اسے اپنے سے کم تر ثابت کرنے کی ضد پیدا ہو جاتی ہے مگر نفیسہ نے جب اپنے اندر کا جائزہ لیا تو اسے ضد کا مادہ کہیں بھی نظر نہیں آیا ہاں جو کچھ بھی نظر آیا وہ معشوق صاحب کی محبت اور صرف محبت تھی۔۔!

عموماً بیٹیاں باپ سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ وہ باپ سے والہانہ محبت کرتی ہیں۔ باپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں اور باپ بھی بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں پر اپنی پدرانہ شفقت، محبت اور ہر جذبہ نچھاور کرتا رہتا ہے۔ یہی قربت، یہی والہانہ پن اور یہی باپ سے نزدیکی لڑکی کے دل میں ایک احساس جاگزیں کر دیتا ہے۔ وہ اپنے شوہر میں باپ کی تشبیہ تلاش کرتی ہے۔ اسی شفقت کی متلاشی رہتی ہے۔۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی جب وہ معشوق صاحب کی محبت میں گرفتار ہوگئی گو دونوں احساسات اور دونوں رشتوں میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔ یہ وارفتگی یہ دیوانہ پن باپ کی محبت کے لئے کبھی سرزد نہیں ہوا جبکہ محبوب کے لئے پورے شدومد سے یہاں ہوتا جا رہا تھا۔ باپ کی محبت میں خلوص، احترام اور قدرتی جذبے کی پاکیزگی شامل تھی جبکہ محبوب کے لئے اندازِ الفت یکسر جدا تھا!

معشوق صاحب کئی دن واپس نہیں آئے۔ دن گزر گئے اور پھر دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے۔ گھر ویران ہو گیا۔ ان کے آنے کے بعد اس میں سلیقہ نظر آنے لگا تھا اب پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹنے لگا تھا۔ خود نفیسہ کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی ۔آنکھوں میں رت جگے اترے تو ہونٹوں پر پیاس کے دریا موجزن ہو گئے۔ ایک کرب بلا اسکے سراپے میں سمٹ آیا اور نغمہ بدوش اور چہچہاتی زندگی یکلخت خاموش ہوگئی۔ سارا وجود جیسے ٹھنڈک کا احساس کھو بیٹھا ہو۔ گلی سے کسی راہگیر کے قدموں کی چاپ ابھرتی تو دل سماعت بن جاتا کہ شاید وہ لوٹ آئے لیکن نہیں۔۔ چاپ یہ کہتی معدوم ہو جاتی کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا! اُف! جو آرائش اسکے اندر پناہ لے چکی تھی اسی نے تو نفیسہ کے اعتبار میں ڈھالا تھا۔

اور پھر وہ ہوا جو عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ صبر، برداشت کی انتہا کو پہونچا تو ہر احتیاط ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نے چادر میں اپنے سراپے کو لپیٹا، دروازہ کھولا اور تیزی سے اس سمت روانہ ہوگئی جسطرف غالباً معشوق صاحب کا گھر تھا۔ سعیدا، رؤف، ممدو نے نفیسہ کو اسطرح گھر سے نکلتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب جو دیکھا تو نگاہیں اسکے قدموں سے لپٹی ہوئی دور تک پیچھا کرتی رہیں۔ لب خاموش اور زبان چپ۔ کوئی بولے بھی تو کیا اور تبصرہ کرے بھی تو کیسے؟ جسے دیکھنے کی چاہ میں ایک عمر اس نکڑ پر گزار دی اور جب بے پردہ سی اچانک ان کے سامنے سے ہو کر گزری تو ان کے حواس ایسے ہی متاثر ہوئے جیسے ذرا بھی لاپرواہ ہوتے ہی کوئی غنیم اپنے حریف پر آپڑے۔ ہوش تو تب آیا جب نفیسہ کا وجود ایک گلی میں گم ہو گیا۔ ہونقوں سی شکلیں اُٹھائے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ حسو بھی گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے بھی نفیسہ کو دیکھا۔ نفیسہ اسکے قریب سے اسطرح گزر گئی جیسے اس نے حسو کو دیکھا ہی نہ ہو۔ حسو حیرت زدہ سا قدرے جھنجھلایا سا اسکے تعاقب میں چل پڑا۔ حسو نے محسوس کیا کہ نفیسہ ہوش میں نہیں ہے ہاں اس نے یہ ضرور دیکھا کہ کسی سے اس نے کوئی بات کی یا شاید کسی کا پتہ پوچھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ نفیسہ اسطرح گھر سے کیسے نکل آئی؟ اُسے کس کی تلاش ہے؟ نفیسہ ایک گلی میں مُڑ گئی۔۔ یہ تو۔۔۔ اس گلی میں تو معشوق صاحب کا مکان ہے۔ اب سارا ماجرا اسکی سمجھ

میں آگیا تھا۔ وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔۔ اتنے دن معشوق صاحب کا نہ آنا نفیسہ کو گھر سے نکال لایا تھا۔۔!

نفیسہ ٹھیک اسی دروازے پر جا رکی۔ یہ عشق کی وارفتگی ہی تھی یا شاید معشوق صاحب کی کوئی مہک اسکے حواس تک پہونچ گئی تھی جس نے اسکے قدم دروازے پر روک دیئے۔ حسو نے دیکھا کوئی دستک کوئی آواز نہیں دی گئی۔۔ نفیسہ نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اندر چلی گئی۔۔

شام کا دھندلکا اُتر آیا تھا۔ گو ابھی اتنا اُجالا تھا کہ چراغ روشن کرنے کی حاجت نہیں تھی لیکن دروازہ کھلتا ہے تو روشنی کی کوئی کرن اندر آجاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو دروازہ کھلا مگر اندر روشنی نہیں آئی۔ معشوق صاحب نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کوئی سراپا دروازے کو روکے کھڑا تھا۔

''کون؟''۔

ان کے مخاطب کرنے پر سراپا اندر آگیا۔ معشوق صاحب کی نگاہوں نے پہچان لیا۔ اتنے عرصے کی قربت نے نفیسہ کے ہر خط و خال کو ان کی آنکھوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ وہ لاکھ دامن بچاتے رہے ہوں مگر نفیسہ ان کے رگ و ریشے میں ایک لاوا بن چکی تھی اور یہی لاوا جب باہر نکلنے کو اپنا راستہ نہیں بنا سکا تو اندر ہی اندر اُسنے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا ۔۔ آج پندرہ دن سے وہ بخار میں مبتلا تھے۔ علاج بھی نہیں کیا۔ اچھے ہوں تو کس کے لئے؟۔۔۔ جسکے لئے اچھا ہونا ہوتا تو بیمار ہی کیوں پڑتے؟ نفیسہ اب ان کے بستر کے نزدیک آرہی تھی !

''معشوق صاحب۔۔۔ میں صرف اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ میری کیا خطا ہے جس نے آپ کو اپنے گھر تک محدود کر دیا۔۔؟''

کوئی جواب نہیں !

''کم از کم یہ پوچھنے سے تو مجھے محروم مت کیجئے''۔

''میں۔۔ میں۔۔ کیا کہوں۔۔؟''

''وہ سب کہہ ڈالیئے جو آپ کے دل میں ہے''۔

''نہیں نفیسہ۔۔۔ ہمارا رشتہ وہیں تک تھا۔ اس سے آگے میری بساط مجھے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی''۔ لہجہ سے نقاہت عیاں تھی۔

''لیکن میں نے تو آپ سے اجازت نہیں مانگی''۔ وہ آج بہت بے باک ہو گئی تھی۔

''تم۔۔۔ تم بیٹھو''۔ انہوں نے اُٹھنا چاہا مگر نقاہت نے اُٹھنے نہیں دیا۔

''نفیسہ۔۔ وہ چراغ روشن کر دو''۔ انہوں نے ایک جانب اشارہ کیا۔۔ نفیسہ نے دیکھا میز پر شیڈ لیمپ رکھا تھا اور اسکے قریب ہی ماچس۔ نفیسہ نے شیڈ اتار کر ماچس سے لیمپ روشن کیا اور لیمپ پر شیڈ چڑھا دیا۔ خاصہ اُجالا ہو گیا اور نفیسہ نے پہلی بار معشوق صاحب کے چہرے کو دیکھا۔۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، لاغر کمزور چہرہ۔ بڑھے ہوئے شیو اور الجھے ہوئے سر کے بالوں نے انہیں کچھ زیادہ ہی کمزور کر دیا تھا۔!

''یہ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا آپ کو؟''۔ نفیسہ کی وحشت خیزی نے اسے معشوق صاحب کے اور قریب کر دیا۔ اس

نے بے اختیار پیشانی پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور اسے ایسا ہی لگا جیسے اس نے انگاروں کو چھو لیا ہو لیکن معشوق صاحب کا ردِ عمل اُس سے مختلف تھا۔ اسکی انگلیوں کے لمس نے ان کی بیماری کے احساس کو قدرے کم کر دیا تھا !

''ارے۔۔آپ کو تو تیز بخار ہے''۔

''صرف تمہارا احساس ہے، وقتی تپش ہے، دور ہو جائے گی''۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے دور ایک کونے میں پانی سے بھرا مٹکا نظر آیا۔۔اس نے بڑے سے جست کے کٹورے میں پانی بھرا اور اپنے سر سے ڈوپٹہ اتار کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دھجی اس نے پانی میں تر کی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر سرد پانی کی پٹی ان کی پیشانی پر رکھ دی۔۔دونوں خاموش اپنے اپنے عمل پر کاربند تھے۔ ایک بیمار تھا تو دوسرا تیماردار اور اس تیمارداری میں نہ جانے کونسا جادو چھپا تھا کہ چند لمحوں بعد ہی بخار میں کمی واقع ہو گئی۔ نفیسہ نے ان کے ہاتھ کی ہتھیلیوں اور پیر کے تلووں کو بھی باقی ماندہ ڈوپٹے کی دھجی سے اسفنج کیا۔۔معشوق صاحب نے اُسے روکا نہیں۔ وہ تو اتنی منہمک ہو چکی تھی کہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ بے پردہ ہے۔ سینے پر ڈوپٹہ نہ ہو تو عورت بے پردہ ہی ہوتی ہے ۔جب اُس نے محسوس کیا کہ معشوق صاحب کا بخار کافی کم ہو گیا ہے تو اس نے معشوق صاحب کی صورت پر نظر ڈالی۔ ایک طمانیت کی سُرخی اسے نظر آئی مگر ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ معشوق صاحب اسکی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں اور تب اسے احساس ہوا کہ ڈوپٹہ اسکے سینے پر نہیں ہے۔ وہ حجاب سے دوہری ہو گئی اور اس نے جلدی سے اوپر کی چادر کو ڈوپٹے کی طرح اوڑھ لیا!

''اُدھر کچن ہے''۔

''میں سمجھ گئی۔۔آپ نے اتنے دن سے میرے ہاتھ کی چائے نہیں پی، اس لئے بیمار ہو گئے''۔ وہ لپک کر کچن میں چلی گئی اور چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ادرک بھی تلاش کر لیا تھا۔ کچن دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ معشوق صاحب اپنا کھانا خود بناتے ہیں۔ ہر چیز میں ان کی شخصیت جیسا سلیقہ عیاں تھا۔ ادرک کی چائے پیتے ہی انہوں نے خود میں توانائی محسوس کی۔۔یا شاید اس چائے میں نفیسہ کے ہاتھوں کی مہک شامل ہو گئی تھی! انہوں نے پیالی تپائی پر رکھدی اور تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئے !

''نفیسہ۔۔۔تمہیں اسطرح نہیں آنا چاہئے تھا''۔

''اور آپ کو اسطرح جم کر بیٹھ جانا زیب دیتا ہے؟''۔

''وہ۔۔میں تو۔۔''

''میں جانتی ہوں۔ آپ مجھ سے بچنا چاہتے ہیں۔۔آپ بے شک بچ سکتے ہیں کیونکہ اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جسے مرد کہا جاتا ہے۔ آپ کھلے ماحول، کھلی فضا اور تابناک ہواؤں کے باسی ہیں۔ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ جہاں چاہے جا سکتے ہیں جس سے چاہے مل سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے ایک پل کو بھی میرے بارے میں نہیں سوچا۔ شاید اسلئے کہ میرا تعلق ان گھرانوں سے ہے جو حیا، شرم اور بے زبانی کے محافظ ہوتے ہیں''۔

وہ لمحے بھر کو رُکی۔ شاید اپنے الفاظ کی خراش کا تجزیہ کر رہی تھی۔ اور معشوق صاحب اسے ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ اتنی نفاست، لفظوں کی ترتیب اور صحیح ادائیگی کی امید اس موٹی اور دھان پان سے لڑکی سے انہیں قطعی نہیں تھی۔ ایک طمانیت کا احساس بھی ہوا کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ وہ بھونچکے سے اسکی گفتگو سنتے رہے اور نفیسہ بولتی رہی۔۔ آج اسکے فطری تقاضوں نے اسے سب کچھ کہہ ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔!

''میں بھی اتنی ہی بے زبان تھی۔ اتنی ہی بے خبر تھی اپنے آپ سے۔ آپ آئے اور آپ نے میرے مخفی جذبوں کو بیدار کر دیا۔ آپ نے میرے محسوسات سے خود کو بے اعتنا رکھا اور آپ کی یہ بے اعتنائی ہی مجھے آپکے روبرو لے آئی۔۔ نا نا ابھی کچھ مت کہئے۔۔ آپ کچھ کہہ بھی نہیں سکیں گے۔ آپ کا یہ کچھ نہ کہنا ہی آپ کو اس مقام تک لے آیا۔۔ معشوق صاحب! اللہ اپنے اندر کی گھٹن کو باہر پھینک دیجئے۔۔ آپکی یہ بے التفاتی، آپ کی یہ گھٹن مجھے دے دیجئے۔۔ بخش دیجئے مجھے اپنے سارے غم ساری بے ثباتی''۔ اس نے بے اختیارانہ ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ معشوق صاحب کو لگا، ان کے ہاتھ گیلے ہو گئے ہوں۔ آہستہ سے اپنے ہاتھ نفیسہ کے ہاتھوں سے الگ کر لئے۔ اسمیں بھی ان کی نرم مزاجی کو دخل تھا۔۔!

''میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو''۔

''جب آپ جانتے ہیں تو اظہار سے گریز اں کیوں ہیں''۔

''تم ابھی نا سمجھ ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ تم کس شے کی طلبگار ہو''۔

''میں صرف اس شے کی طلبگار ہوں جو صرف آپ کی ذات سے وابستہ ہے''۔

''میری ذات تو تنہا ہے۔۔ اور تنہا ذات تنہا ہی ہوتی ہے۔۔'' وہ متذبذب تھے۔ نہ صاف انکار کر سکتے تھے اور نہ صاف اقرار۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور حتمی لہجے میں بولے۔

''نفیسہ۔۔ میں تمہاری محبت قبول نہیں کر سکتا''۔

''مگر میں آپ کی محبت قبول کر چکی ہوں''۔

''تم نادان ہو۔۔ نا سمجھ ہو۔۔ کم فہم ہو''۔

''مگر آپ تو نا سمجھ نہیں ہیں؟۔۔ پھر اس نادان، کم فہم کو اپنی ذات میں شامل کیوں نہیں کر لیتے؟''۔

''کیونکہ۔۔ ہمارے درمیان عمروں کی خلیج ہے۔۔ میں اس مقام پر ہوں جس مقام سے انسان اپنے جذبات اور احساسات بہت پیچھے چھوڑ آتا ہے۔ نفیسہ! میری عمر مسافت کی اس منزل کو طے کر چکی ہے، جس منزل پر تم ابھی آٹھہری ہو''۔

نفیسہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ ایک اطمینان کی سانس اسکے ہونٹوں سے خارج ہو گئی۔ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ جب اندر آئی تھی تو جنون کی حد تک وحشت خیز تھی اور کہاں اب مسکرا رہی ہے۔!

''معشوق صاحب! میں نے آپ کی شخصیت سے پیار کیا ہے۔ آپ کے اندر پوشیدہ اس انسان کو دیکھا اور

پر کھا ہے۔ جس سے شاید آپ بھی انجان رہے ہیں۔ یہ عورت کی وہ حس ہے۔ جس سے ایک عورت ہی واقف ہوتی ہے۔۔ مجھے کسی کی جوان بانہیں درکار نہیں ہیں۔ کشادہ سینہ اور سینے میں دھڑکتی غیر متوازن دھڑکن مجھے نہیں چاہئے۔ اس اعتدال کی طلب ہے۔ جس میں توازن ہو۔ محافظت ہو۔ شفقت ہو اور چاہ کر نباہ جانے کی لگن ہو"۔

"مگر۔۔۔ میں۔۔۔"

"ہاں میں آپ کی پناہ میں آنا چاہتی ہوں۔۔ آپ سے وہ رشتہ جوڑنا چاہتی ہوں جو آسمانوں پر وحدتِ حقیقی نے ہمارے مقدر میں تحریر کردیا ہے"۔

معشوق صاحب نے نظر اُٹھا کر نفیسہ کو دیکھا۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ نفیسہ کے لہجے میں وہ عزم ہے جسے متزلزل کرنا اُن کے بس میں نہیں ہے۔۔ یہ وہ عزم ہے جو جب ظاہر ہوتا ہے تو ساری پیش بندیاں، ساری احتیاط اور ساری تدبیریں غیر محفوظ ثابت ہوتی ہیں۔!

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ انہیں ایسا لگا جیسے چاروں موسم ایک ساتھ شروع ہو گئے ہوں اور ان موسموں میں بہار کا موسم سب موسموں پر حاوی ہو گیا ہو!

حسو دروازے سے لگا اندر کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اُس نے اپنے قدموں کو واپس موڑ لیا اور اب وہ مسجد کی دہلیز پر کھڑا تھا جس کی پیشانی پر لکھا تھا۔ اللہ کے اس گھر میں پہلے سیدھا پیر رکھو کہ یہ نیک فال تمہیں ظلمات سے نکال کر عبادت، اطاعت، راہ نجات اور استقامت کی طرف لے جاتا ہے اور اس آیات کا ورد کرو۔

اور اُس نے آیات کا ورد کرتے ہوئے اپنا داہنا پیر مسجد کے فرش پر رکھ دیا۔ یہ فرش تو اسکے قدموں کا جانا پہچانا ہے۔ اسکے در و دیوار، منبر، جائے نمازیں اور ہر شئے متبرک اور جانی پہچانی ہیں۔ بس یہ ہوا کہ ابا اور پھر اماں کے ناگہانی انتقال نے اسے بھٹکا دیا تھا۔ برگشتہ کر دیا تھا۔۔ اس نے وضو کیا اور نماز کا وقت نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ سیال برتی خاموشی اور غم آزار غبار اسکے وجود سے چھٹتا چلا گیا۔ اس نے محسوس کیا، ایک سبک سر روشنی اسکے منجمد عضو اور مجبور دماغ کو معراجی کیفیت سے ہم آہنگ کرتی، سیال تلخیاں سمیٹتی، لذت بشریت اور حیات کی سربلندی عطا کرتی چلی گئی ہو۔ شاید یہی وہ ابدی بصیرت ہے جو انسان کو سرفرازی اور خیر البشر کی حرارت و حرکت اور نغماتی لذتوں سے نوازتی ہے۔

☆☆☆

آدمی نامہ

پھر یوں ہوا۔ حیا و شرم کا حساس ترین جذبہ آدمی کے کردار سے حرص و طمع نے چھین لیا۔ رشتوں کی طہارت جاتی رہی۔ فتنہ گر شگوفے آدمی کے خمیر میں رچ بس گئے۔ ہر شے عریاں بسر ہو گئی۔ نور برساتی پیشانیوں سے شبنمی حرارت مفقود ہوئی تو روشنیوں میں بھی تعفن کی نمی سے خورشید بدنی سلگ سلگ اُٹھی۔ جنسی اختلاط پس منظر سے پیش منظر میں آ گیا۔ آدمی نفس کا اس حد تک اسیر ہوا کہ تکبیر کی صداقت نے اسکی سماعت پر دستک دینا چھوڑ دی۔ غذا کی زیادتی نے بدنوں کو صحرا نورد کر دیا۔ آسمان سے پانی مانگتے مانگتے آدمی زمین کا پانی بھی اپنے معدوں میں اتارتا گیا۔ زمین کی تہوں نے سبزہ اگلنا بند کیا تو سب کچھ بے آب و گیاہ ہو گیا۔ جابہ جا حیات کا مہیب سراپا اُگ آیا اور پھر قدرت کی کرشمہ سازی کہ اس مہیب سراپے کی شاخوں پر دو جسم کھل اُٹھے۔ اِس موہوم کائنات کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دور تک لنڈ منڈ درختوں کا سلسلہ تھا۔ کسی بھی درخت پر ایک بھی پتہ پھل یا اسکی کوئی شاخ سبز نہیں تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں اس کائنات کے لئے واقف سی شناسائی تھی۔

پہلے جسم نے اپنے ساتھی جسم سے پوچھا۔ ''تم جانتے ہو ماڈرن آرٹ کیا ہوتا ہے؟''۔

''ہاں بیمار ذہن کی نا سمجھ اُپج''۔

''تم نے دیکھا ہے اُسے؟''۔

''اُسے سمجھنے کے لئے ہی ہمیں یہاں اتارا گیا ہے۔'' دوسرے جسم کی سرگوشی میں اپنے وجود کی معنویت تھی۔

''یہ درخت دیکھ رہے ہو؟''۔ پہلے جسم نے درختوں کی جانب توجہ مبذول کی۔

''ہاں۔۔شاید یہی ماڈرن آرٹ ہے۔ قدرت کا نادر نمونہ''۔

''جانتے ہو؟۔۔یہ اتنے سکون سے کیوں جی رہے ہیں؟''۔

''کیونکہ اُن کی ول پاور مر چکی ہے''۔ دوسرے جسم نے سکون سے جواب دیا۔

''نہیں۔۔زمین نے ان کی غذا بند کر دی ہے''۔ پہلے جسم نے معنی خیز لہجے میں بتایا۔

''تو غذا بند ہونے سے ماڈرن آرٹ کا جنم ہوتا ہے''۔ دوسرا جسم سراپا اشتیاق بن گیا۔

''ہاں غذا کا ماڈرن آرٹ سے گہرا تعلق ہے''۔ اسکا لہجہ بدستور فلسفیانہ تھا۔

''واقعی؟''۔ پھر وہی اشتیاق۔

''تم نے انسان کو ماڈرن آرٹ بنتے دیکھا ہے کبھی؟''۔

''نہیں۔۔مگر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آدمی آڑا ترچھا ہو کر کتنا آرٹسٹک لگتا ہے''۔

''تو پھر آؤ۔ اس کی سرشت کو اسٹڈی کریں۔۔تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے گا کہ غذا کی زیادتی انسان کو کتنا ماڈریٹ

کر دیتی ہے"۔

اور پہلے جسم نے اپنے وجود کا وہ ورق کھول دیا جس پر زندہ تہذیب کا المناک سچ لکھا ہوا تھا۔

بھانجی رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی گئی اور تین بیڈروم اور ایک کافی لاؤنج پر مشتمل یہ چھوٹا سا اپارٹمینٹ جسکی دیواریں اسکی مخروطی انگلیوں کے لمس سے پھول بن جایا کرتی تھیں، وہ جب چلتی تو فرش پر اسکے پیروں کی نرم ملایم چاپ کے کنول کھل کھلا اُٹھتے تھے اور ورانڈے کی الگنی پر شباب میں بسے سوکھتے کپڑوں کو جب ہوا کے جھونکے چھو لیتے تو دور بسے جوان دل قرب کی لذتوں کی طلب سے دھڑک اُٹھتے تھے، اچانک سناٹوں میں اُتر گیا۔

اپارٹمنٹ کا یہ سناٹا تب ٹوٹا جب رانا ویر سنگھ نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر نوجوان پولس انسپکٹر انشومن کو اندر آنے کی دعوت دی۔ انشومن نے اندر داخل ہو کر کمرے کو توصیفی نظروں سے دیکھا۔ شیلف میں کتابیں، ریک پر ٹرافیاں اور مینومینٹس۔ دیوار پر ایس پی کی بارعب وردی میں رانا ویر سنگھ کی تصاویر مختلف تقریبات میں کھینچی گئی فریموں میں جڑی ٹنگی ہوئی۔ ایک بڑے سے فریم میں نوعمر کی پرشباب لڑکی کی بے حد خوبصورت تصویر دیوار پر لگائی گئی ہے۔ انشومن کی نگاہیں اس تصویر پر ٹھہری گئیں۔

"یہی آپ کی بھانجی ہے؟"۔ انشومن سے رہا نہیں گیا۔

"ہاں۔۔ یہی میری بھانجی ہے"۔ رانا ویر سنگھ کی آنکھوں میں اُجالے کھل اُٹھے۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔ اتنے میڈل اور ڈھیر ساری توصیف پا کر بھی اپنی پوری سروس لائف میں وہ خوشی مجھے نہیں ملی جو آج میں نے پالی ہے"۔

"آپ کو خوش ہونا بھی چاہیے سر۔ آج ایک بڑی ذمہ داری سے آپ سبکدوش ہو گئے"۔

"تم کھڑے کیوں ہو؟۔۔ بیٹھو"۔ اور انشومن ایک صوفے میں دھنس گیا۔ سامنے کا صوفہ رانا نے سنجال لیا اور اپنا مخصوص سگار سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

"روپالی کی شادی میرا اہم فرض ہی نہیں بڑا تجربہ بھی تھا۔ تلخ بھی اور شیریں بھی۔ وہ میری چہیتی بہن کی نشانی جو تھی۔ میں تب حولدار تھا۔ میرا کا شوہر ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ اس وقت میرا ماں بننے والی تھی۔ میں اسے اپنے پاس لے آیا۔ میرا ماں تو بنی لیکن جانبر نہ ہو سکی اسکی بیٹی کو ہم نے روپالی کا نام دیا۔ میں نے اور کنتی نے اسے پھولوں کے درمیان پرورش کیا۔ آج وہ عزت دار گھرانے کی بہو اور شوہر کی چہیتی بیوی بن کر رخصت ہو گئی"۔ رانا نے ڈھیر سارا دھواں حلق سے خارج کیا۔ اس دھوئیں کے غبار نے رانا کی غم آمیز طمانیت کو روپوش کر لیا۔

"آپ کا ایک بیٹا بھی تو ہے جناب؟"۔

"وہ۔۔ کنتی کا بیٹا ہے"۔ وہ کہتے کہتے سنبھل گئے۔ "میرا مطلب ہم دونوں یعنی میرا اور کنتی کا بیٹا ہے"۔

"لیکن اس کا نام آپ نے جم کیوں رکھا ہے؟۔ آپ رانا ویر سنگھ اور آپ کا بیٹا جم"۔

رانا نے پھر دھواں اگلا اور اپنے تاثرات کو اسکے غبار میں چھپا کر بولا۔ "ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی کوکھ سے کسی اولاد کو جنم دے۔ ہماری شادی کو کئی سال بیت گئے۔ مندر، گردوارے مزار ہر جگہ گئے۔ مرادیں مانگیں مگر شاید

۔۔شاید یسوع مسیح نے ہماری مراد پوری کر دی۔۔اسی لئے ہم نے۔۔میرا مطلب، بیٹے کی ماں کنتی نے اس کا نام جم رکھ دیا لیکن روپالی کے لئے جو پیار میرے دل میں تھا اسے جم کے ساتھ نہیں بانٹ سکا۔ بہر حال کبھی کبھی حقیقت کو چھپا لینا ممکن نہیں ہوتا"۔

انشومن نے حیرت سے پوچھا "کیسی حقیقت؟"۔

رانا نے خلا میں گھورتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جشنِ آزادی کے موقع پر ٹینکوں کی نمائش کے دوران ایک غریب آدیباسی نہ جانے کیسے ایک ٹینک کے نیچے کچل کر ہلاک ہو گیا۔ ٹیلی ویژن سرکٹ کے توسط سے ملک کے کونے کونے میں یہ منظر کروڑوں آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اگر میڈیا کے بس میں ہوتا تو تصویر پردے پر آنے سے پہلے ہی ایڈیٹ کر دی جاتی اور اس حادثے کو چھپا لیا جاتا کہ ٹیکنیکل خرابی یا سگنل نہیں ملنے سے یہ منظر آپ نہیں دیکھ سکے یا رکاوٹ کے لئے افسوس ہے۔ محض ایک لیور دبانے سے منظر اسکرین سے غائب ہو جاتا مگر لائیو ٹیلی کاسٹ تھا۔۔منظر۔۔موت کا منظر۔۔سب نے دیکھ لیا"۔

"لیکن وقت کی نزاکت کے تحت اس حادثے کو چھپانا بھی تو ممکن نہیں تھا"۔

"یہ حالات کا ساتھ دینے پر منحصر ہے۔ بعد میں اسے کوئی سازش کہہ دیا جائے۔ یہ بھی کہہ کر عوام کی توجہ بانٹی جا سکتی تھی کہ سرکار کو بدنام کرنے کے لئے پڑوسی ملک کا ہاتھ ہے۔ عوام تو عوام ہے۔ ہاں میں بھی راضی۔ نا میں بھی خوش"۔

رانا نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ ایش ٹرے میں سگار کی راکھ جھاڑی اور صوفے سے اُٹھ گیا۔

"جانے دو یار۔۔یہ سب بہکے ذہن کی قلابازیاں ہیں۔ آج میں بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں"۔ رانا نے کباڈ کھول کر شراب کی بوتل اور دو نفیس گلاس نکالتے ہوئے انشومن کی طرف مڑ کر کہا۔

"Have you adrink with me "

"وہ جناب۔۔آپ کے ساتھ میرا مطلب۔۔"

"یہ تکلفات چھوڑو۔ نہ میں افسر نہ تم ماتحت۔ ایس پی کی شاندار ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد میرا پولس سے کوئی واسطہ نہیں رہا"۔

ٹیبل پر بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے آواز لگائی۔ "کنتی۔۔ارے بھئی کچھ کھانے کو بھیجو۔ آج ہم نے بوتل کھولی ہے ۔انشومن۔ آئس باکس اُٹھا لاؤ۔ وہ سامنے۔ اور اسٹائفن بھی"۔

انشومن نے دونوں چیزیں لا کر میز پر رکھ دیں۔ اس اثنا میں رانا دو پیگ بنا چکا تھا۔ اس نے آئس باکس کا ڈھکن کھول کر آئس کیوب دونوں گلاسوں میں چھوڑے اور اسٹائفن کی ہلکی سی دھار مار کر ایک گلاس انشومن کو تھما دیا۔

"لو۔۔۔یہ والگا ہے۔ پرتگیز کی بہترین شراب۔۔بے حد قیمتی۔ جانتے ہو یہ کتنی پرانی ہے؟"۔

دونوں نے چیرز کہتے ہوئے گلاس ٹکرائے اور پہلا سپ لیا۔ "مجھے یہ شراب ایک دوست نے تحفتاً دی تھی۔ اس وقت جب میں نے کنتی سے شادی کی تھی اور ہم نے اسکا پہلا جام پیا تھا۔ پھر روپالی کی پہلی سالگرہ پر دوسرا جام پیا۔ خوشی

اور پیار کا جام۔ زندگی میں پھر کوئی بھی خوشی نہیں آئی۔ آہ۔ پورے ۲۵ سال بعد آج پھر یہ موقع آیا ہے۔۔ میں اسے اس خوشبو کے نام کرتا ہوں جو یہاں سے رخصت ہو گئی"۔ رانا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیر گئی جسے اس نے شراب میں چھپا لیا۔ کنتی ٹرے میں کچھ پلیٹس لے کر اندر داخل ہوئی۔

رانا کی آواز کی لرزش نے انشومن کو چونکا دیا۔ "رانا صاحب۔۔ یہ کیا ہو گیا آپ کو"۔

رانا نے جلدی سے خود پر قابو پایا اور آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا "اوہ۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں"۔

"انہیں کچھ کبھی نہیں ہوتا۔ یہ روحوں سے اسی طرح اپنے جذبوں کے رشتے جوڑتے رہتے ہیں"۔ کنتی نے پلیٹوں کو میز پر سلیقے سے رکھتے ہوئے کہا جن میں فنگر چپس، نمک پارے اور مچھلی کے تلے ہوئے قتلے تھے۔ کنتی عمر کی ڈھلان پر آ چکی تھی۔ اسکے لباس سراپے اور آنکھوں میں ٹھہری اداسی اس بات کی غماز تھی کہ وہ ہر لذت کو خود سے جھٹک چکی ہے۔

انشومن نے پلیٹ سے فنگر چپس اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا "میم۔ لگتا ہے رانا صاحب نے روپالی کی جدائی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیا ہے۔ اکیلے ہو گئے ہیں نا؟"۔

"میرے ہوتے ہوئے بھی"۔ کنتی کا جملہ بہت نوکیلا تھا۔

"وہ۔۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ میں تو کہنا چاہ رہا تھا کہ کیا میں فرصت کے لمحے یہاں گزار سکتا ہوں؟"۔

"شکریہ انشومن۔۔ تم نے میرے اکیلے پن کا احساس کیا لیکن تم ایک ذمہ دار پولس آفیسر ہو۔۔ یہ مت بھولو"۔

"اور جوان بھی"۔ کنتی کا یہ جملہ بھی چبھتا ہوا تھا۔ وہ اب تک کھڑی ہوئی تھی۔ "شام کا وقت تو امنگوں میں گزارنے کا ہوتا ہے آفیسر۔ یہاں تمہیں کیا ملے گا؟۔۔ چند خشک لمحے۔۔ کچھ بے رس گفتگو"۔

"کنتی تم اندر جاؤ"۔ رانا کے لہجے میں سختی عود کر آئی۔

"اندر بھی وہی ہے میرے لئے جو باہر ہے"۔ کنتی جانے کے لئے مڑی اور پھر پلٹ کر اس نے رانا سے کہا۔

"جم اب تک نہیں آیا"۔

"جب اس کا دل باہر سے اکتا جائے گا تو چلا آئے گا"۔

"تم سمجھے نہیں۔۔ وہ تین راتوں سے گھر نہیں لوٹا"۔ اس بار اسکی آواز میں ممتا کا درد اور تڑپ تھی۔ رانا نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ وہ بے پرواہی سے والگا کے سپ لیتا رہا۔ کنتی نے اس پر تیز نگاہ ڈالی۔ رانا سگار سلگانے لگا۔ کنتی کی نگاہ میں ایک سفاک سی نفرت تھی۔ وہ پلٹی اور اندر چلی گئی۔

"انشومن۔ تم نے کبھی چھپکلی کو اپنی پشت پر رینگتے محسوس کیا ہے؟"۔ اس عجیب سوال پر انشومن کا بوکھلا جانا لازم تھا

-

"نہیں سر۔۔ کبھی تجربہ نہیں ہوا"۔

"یہ تجربہ بھی ہو جائے گا۔ جب اس شراب کا دوسرا پیگ تم اندر اتار لو گے۔۔" رانا کی ہنسی اور سگار کا کسیلا دھواں ایک ساتھ خارج ہو کر مرغولوں کی شکل میں کمرے کی بوجھل فضا میں چکرانے لگے۔

''کوئی کیس بھی ہے ہاتھ میں؟''۔

''ریپ کیس ہے جناب۔۔پیچیدہ اور الجھا ہوا''۔

''کیس کبھی پیچیدہ نہیں ہوتے۔پیچیدہ ہوتی ہے ہماری صلاحیت۔ویسے کیس کیا ہے؟''۔

''شوہر کا الزام ہے کہ اسکی بیوی نے اسکے ساتھ بیوفائی کی ہے۔ایک غیر شخص سے آشنائی کی اور ہم بستر ہو کر شوہر کے اعتماد، محبت اور مردانگی کو ٹھیس پہنچائی ہے''۔

''لیکن یہ تو ریپ کیس نہیں ہوا۔۔بیوی کیا کہتی ہے؟''۔

''وہ اس الزام سے منکر ہے۔اسکا بیان ہے کہ وہ شوہر سے بے حد محبت کرتی ہے۔پندرہ سال کی رفاقت میں اس نے کبھی اس میں کمی نہیں آنے دی۔وہ بے وفا نہیں ہے بلکہ ایک نازک اور حساس مرحلے میں اس نے شوہر کی مدد کی ہے''۔

''گویا شوہر کا الزام غلط ہے کہ اسکی بیوی نے کسی غیر مرد کو اپنا بیڈ روم پارٹنر بنایا؟''۔

رانا نے مچھلی کا پیس منہ میں رکھ کر چباتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

''جی نہیں۔الزام اپنی جگہ بالکل درست ہے۔میں نے اس شخص کا بھی بیان لیا ہے۔اس نے کہا کہ اس نے مجھ سے ہم بستر ہونے کی خواہش کی تھی اور جوانی سے بھرپور عورت کی خواہش کو ٹھکرا دینا میرے بس میں نہ تھا''۔

''شوہر کو اس واقعہ کا علم کب ہوا؟''۔

''چار ماہ بعد جب بیوی ماں بننے کے مرحلے سے گزرنے لگی''۔

''لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کے شکم میں کسی اور کا نطفہ پرورش پا رہا ہے؟''۔

''یہی وہ حساس جذبہ ہے جسے بیوی شوہر پرستی کی مثال بتاتی ہے''۔انشومن نے ایک بڑا سا سپ لیا۔

''انشومن۔۔سگریٹ سلگا لو۔۔وہ ادھر ہے۔ایک میرے لئے بھی''۔رانا نے سگار کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔انشومن نے ریک سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر لائٹر سے دو سگریٹ سلگا لئے۔ایک سگریٹ رانا دے کر دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''شادی کے پندرہ سال بعد بھی ان کے یہاں اولاد کے آثار نہیں پیدا ہو سکے۔آپ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوا؟''۔

وہ رانا کی طرف جھک کر قدرے رازداری سے بولا۔''کیونکہ شوہر مردانہ خصوصیات سے یکسر محروم ہے''۔

رانا کا ہاتھ زور سے کانپا اور گلاس فرش پر گر کر چور چور ہو گیا۔گلاس گرنے کی آواز نے ہی کنتی کو اندر آنے پر مجبور کر دیا۔اس نے دیکھا رانا کے وجود پر ویران سے سناٹے اُتر آئے تھے۔چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔اس نے کوئی ردِعمل ظاہر کئے بنا کانچ کے ٹکڑے اپنی ساڑی کے پلو میں جمع کئے اور واپس چلی گئی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا رانا صاحب؟''۔

''آں۔۔ہاں ٹھیک ہوں''۔

''رانا صاحب، یہی وہ پیچیدگی ہے جس نے ایک تکون کی شکل اختیار کر لی ہے۔اصل الزام کسے دیا جائے؟ بیوی کو جس نے شوہر کے سماجک رتبے کی خاطر غیر شخص سے جسمانی رشتہ بنایا۔ وہ شخص جس نے ایک شادی شدہ عورت کو حاملہ کیا یا وہ شوہر ملزم ہے جو پندرہ سال میں ایکبار بھی اپنی بیوی کے جسم کو حاصل کرنے سے قاصر رہا یا وہ بچہ جو میاں بیوی کے درمیان ایک انجان سی خلش کا باعث بن گیا؟''۔

رانا نے کوئی جواب نہیں دیا۔انگلی میں دبی سگریٹ سلگ سلگ کر دھواں چھوڑتی رہی اور رانا اپنے خیالات میں الجھا خاموشی کی چپ سادھے بیٹھا رہا۔

''اچھا رانا صاحب میں چلتا ہوں''۔اس نے رسماً اجازت لی اور چلا گیا۔اسکے جانے کا احساس بھی رانا کو نہیں ہوا۔۔باہر کا موسم اچانک ہی بدل گیا تھا۔ہوا کے خنک جھونکے کھڑکی سے اندر آ کر سردی کا احساس دلا رہے تھے۔برفباری کی سردسی پھوار ہوا اندر لا رہی تھی۔کنتی نے کمرے میں آکر دیکھا۔رانا اسی طرح بیٹھا تھا۔اس نے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور دبیز پردے سے انہیں ڈھک دیا۔

یہ ایک ہل اسٹیشن تھا۔نچلی آبادی سے نکل کر ایک سڑک بل کھاتی پہاڑی تک چلی گئی تھی۔اس پہاڑی پر سرکاری ریسٹ ہاؤس، اس سے ملحق دو بنگلے جو غالباً نجی تھے اور ان بنگلوں سے دور الگ تھلگ ایک چھوٹا سا خوبصورت کاٹیج جو کرنل نوروز جی شاہ پور جی کی ملکیت تھا۔نوروز جی کرنل کی شاندار ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اب وہ یہاں ایک وسیع آراضی خرید کر اس پر سیب آلوچے اور اخروٹ کی کاشت کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔یہ پارسی نژاد خاندان جدید ہندوستان کا پروردہ تھا۔دورانِ ملازمت دنیا جہاں کی سیر کر چکا ہر تہذیب ہر معاشرے سے واقف، تمام فرسودہ روایات سے کنارہ کش اس خاندان میں عبادت اور سیکس ایک ہی سکے کے دو پہلو تھے۔جس کی جب ضرورت ہوئی سکے کا رُخ بدل لیا۔

نوروز جی اپنے خاندان کے ساتھ چند روز سے یہاں آئے ہوئے تھے۔اس وقت وہ اپنے بزنس پارٹنر اور اخروٹ کی کاشت کے ماہر بومن جی کے ساتھ میز پر بڑا سا سائٹ پلان پھیلائے تبادلۂ خیال میں مصروف تھے۔ان کے ساتھ ان کی دو جوان اور شباب کے سارے اسلحہ سے لیس بیٹیاں نرسی اور رابی بھی تھیں۔کرنل نوروز جی عمر کے اس دور میں تھے جب اعصاب ہواؤں سے بھی متاثر ہونے لگتے ہیں لیکن فوج کی ملازمت اور مغرب کی طریقۂ زندگی نے انہیں خوش سلیقگی کے ساتھ جینے کے آداب تو دیئے ہی تھے۔نظر کو بھی آزادانہ وسعت دیدی تھی۔گویا کہیں کہیں سے وہ تھوڑا خیدہ ہوئے تھے لیکن برسوں کی فوجی ریاضت نے انہیں جھکنے سے باز رکھا تھا۔ان کی بیوی تکوتما آج بھی اتنی ہی چارمنگ تھیں اتنی ہی پرکشش۔۔نوروز جی نے سائٹ پلان سے نظر ہٹا کر اس طرف دیکھا جہاں ان کی دونوں بیٹیاں اپنے مشترکہ بوائے فرینڈ شوکی کے دونوں طرف بیٹھی اسکے جاگنے کی منتظر تھیں جو صوفے کی پشت سے ٹکا آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا اور تکوتما کسی انگریزی میگزین کی ورق گردانی کے ساتھ سگریٹ کے کش بھی لیتی جا رہی تھیں۔نوروز جی نے

وہیں سے پکارا۔

''رابی ڈارلنگ۔ پلیز ہمارے لئے ڈرنک لادو''۔

رابی نے اپنے بوائے فرینڈ پر نظر ڈالی اور بادل نخواستہ اُٹھ کر دو ڈرنک بنائے اور نوروز جی اور بومن کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

نوروز جی نے جام لیتے ہوئے کہا۔ ''تھینک یو مائی ڈیر۔ ?You do make drink with me''۔

رابی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''نو تھینک یو ڈیڈ۔ مجھے وائن سے الرجی ہے۔ میں صرف مارٹینی لیتی ہوں''۔

بومن نے ایک نگاہ سوئے ہوئے شوکی پر ڈالی اور رابی سے مخاطب ہوا۔

''کیا بات ہے؟۔۔ پرندے نے پر نہیں کھولے؟''۔

''رات ہی کو اسکے پر کھلتے ہیں''۔ رابی کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ ''اب کتنا رومانس ہے یہاں اور وہ بے ہودہ نیند کے مزے لوٹ رہا ہے''۔

''یہ لو۔۔ مارٹینی ہے۔۔ تم بھی پیو اور پرندے کو بھی پلاؤ۔ اہورمزدا نے چاہا تو وہ ضرور پر کھولے گا''۔ بومن کے ہاتھ سے مارٹینی کا ٹن لے کر رابی کے چہرے سے بوریت کے آثار معدوم ہو گئے۔

''اوہ۔۔ سو سویٹ انکل۔ میں بڑی دیر سے اسکی طلب محسوس کر رہی تھی''۔ رابی نے بومن کے گال پر کس کیا اور ٹن لئے پھر اپنی مہم سر کرنے شوکی کے پہلو میں آ بیٹھی۔

''اب تم ادھر پوری توجہ دو۔ یہ آج ہی فائنل کرنا ہے''۔ نوروز جی نے بومن کو پھر پروجیکٹ کی طرف متوجہ کر لیا۔'' مگر ٹھہرو۔'' تلوتما سے مخاطب ہو کر نوروز جی نے پکارا۔ ''تلوتما ڈارلنگ کھانے میں کیا دیر ہے؟''۔

تلوتما نے میگزین سے نظر ہٹائے بغیر آواز دی۔ ''شیف ! ڈنر میں کیا دیر ہے؟''۔ پھر اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے رابی اور شوکی پر فضول سی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''بے بی۔ تمہارا نیا دوست کچھ کام کا بھی ہے یا یونہی فضول سی چیز ہے''۔

''پتہ نہیں۔ بہت دیر سے میرا اور اس کا ذہنی رابطہ ٹوٹا ہوا ہے''۔

''یہ کیا چیز ہے؟۔۔ میرا مطلب یہ کرتا کیا ہے؟''۔

''اسٹوری رائٹر ہے۔ خوفناک کہانیاں ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہوتی ہیں''۔

''اوہ۔ تو سیکس اور خوف۔۔۔ ساتھ ساتھ''۔ تلوتما کے لہجے میں حقارت بھی تھی اور ایک انجان سی طلب بھی۔

''وہ ایسا ہی ہے''۔ رابی نے مارٹینی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔

''ایسے فنکار جو سیکس اور ہارر کو اپنا سبجیکٹ بناتے ہیں۔ آزمائشی لمحوں میں نیوٹل ہی ثابت ہوتے ہیں''۔

''میں نے ابھی اسکو آزمایا نہیں ہے''۔

''تو کیا حرج ہے آزما ڈالو۔ ویسے نرسی۔۔ تم کیا کہتی ہو؟''۔

''دو جوان خوبصورت لڑکیوں کے بیچ بیٹھا مرد کب تک خود پر قابو پا سکتا ہے؟''۔ نرسی نے بھوکی نظر شوکی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایسی صورت میں آپ کا نظریہ ہی ٹھیک ہوگا''۔

''اُف فوہ۔۔ سردی بڑھ گئی ہے۔ نرسی ! بیٹا فائر پلیس میں اور لکڑیاں ڈال دو۔ دیکھو باہر برف بھی تیز ہونے لگی ہے''۔

"I shall gate pleasure in kissing with him" کہتے ہوئے نرسی نے شوکی کے ادھ کھلے سرخ اور بھیگے ہونٹوں کا بوسہ لیا اور فائر پلیس میں لکڑیاں ڈالنے اُٹھ گئی۔

''شیف ! بھئی۔۔ کیا دیر ہے ڈنر میں؟''۔

''مادام۔ ڈنر ڈائننگ ٹیبل پر نہیں لگایا جا سکتا؟''۔

''تم ہوش میں تو ہو شیف ! ڈائننگ ٹیبل کے علاوہ کھانا اور کہاں کھایا جائے گا۔ ڈائننگ ٹیبل کو کیا ہوا؟''۔

شیف نے آ کر ایپرن سے ہاتھ ملتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''کیونکہ ڈائننگ ٹیبل پر مس بابا کے سابق شوہر لیٹے ہوئے ہیں''۔

''میرا شوہر؟۔۔ یعنی سالومن۔ وہ یہاں کیسے آیا؟''۔

''وہ تو مجھے پتہ نہیں''۔ ''مگر وہ اتنا بدذوق تو نہیں ہے کہ بیڈروم کے بجائے ڈائننگ ٹیبل پر سو جائے؟''۔

''بھئی اسے اُٹھاؤ۔ ڈائننگ ٹیبل سونے کی جگہ تو نہیں ہے''۔

''وہ اُٹھ نہیں سکتے۔ ان کے سینے میں چاقو پیوست ہے۔ دستے تک اور وہ مر چکے ہیں''۔ شیف نے تاسف سے کہا۔ ''اور جب تک مسٹر سالومن ٹیبل خالی نہیں کر دیتے اسوقت تک وہ کھانے کے لئے استعمال نہیں کی جا سکتی''۔

نوروز جی نے شراب کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور ورانڈے کے اس بڑے سے شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر برف کے ذرات جم گئے تھے اور جسکی وجہ سے باہر کا منظر اور بھی دھندلا گیا تھا۔

''ویری سیڈ۔ شیف تم نے کچھ کیا؟۔ میرا مطلب یہ تو پولس کیس ہے''۔

''خادم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ پولس کچھ دیر میں یہاں پہونچ جائے گی''۔ شیف نے مؤدبانہ انداز میں سر کو خم دے کر کہا۔

''تو پھر تم بوفے کا انتظام کرلو۔ کھانا یہیں لے آؤ۔۔ ہم سب چلتے پھرتے کھا لیں گے''۔ تلوتمانے میگزین کو سینٹر ٹیبل پر پھینکا اور شال کو درست کرتے ہوئے شیف کو ہدایت کی اور شیف تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گیا۔

صبح گزرے دیر ہو چکی تھی۔ برف باری رُکتے ہی سردی بڑھ گئی تھی۔ رانا ویر سنگھ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ٹیلی فون بات کر رہا تھا۔ ''اوہ۔ آئی ایم رانا ویر سنگھ۔ انشومن سے کہیئے وہ فوراً مجھ سے ملے۔ شکریہ''۔ رانا نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پلٹ کر دیکھا تو کنتی چاروں طرف سے خود کو شال میں لپیٹے کھڑی تھی۔ اسکے ہاتھ میں صبح کا اخبار تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ پر زردی تھی۔

''رانا۔کیا یہ ایک ہی آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''۔

''کونسا کام؟''۔

''پرسوں رات کا واقعہ۔ایک ہی رات میں دو خون''۔

''ہو سکتا ہے۔اخبار تمہارے پاس ہے۔پڑھ لو تفصیل معلوم ہو جائے گی''۔

''میری عینک ٹوٹ گئی ہے۔سرخیاں پڑھ چکی ہوں۔اُف ایک ہی رات میں دو خون۔اور اور۔۔۔'' وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور رانا کے روبرو کھڑی ہو کر اسکی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔''اور جم تین راتوں سے غائب ہے''۔

''تو''۔

''مرد کا قتل تو سمجھ میں آتا ہے لیکن عورت کا قتل؟۔رانا جنسی جرائم بہت بڑھ گئے ہیں''۔وہ دھم سے کرسی پر گر گئی۔'' مجھے اس کا یوں راتوں میں غائب ہونا اچھا نہیں لگتا۔یہ بھی نہیں پتہ وہ کیا کام کرتا ہے''۔رانا نے اسکی کسی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔کباڑ سے شراب کی بوتل نکال کر اسے غور سے دیکھا۔

''یہ شراب؟۔۔اتنی کم کیسے ہو گئی؟''۔

''شراب تم پیتے ہو۔مقدار کا اندازہ بھی تم ہی کو ہونا چاہئے''۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔جواب دو۔آدھی شراب کہاں گئی؟''۔رانا کی گرفت اسکے بازوؤں پر سخت ہو گئی۔

''تم اپنے معدے کا ایکسرے کرا کے دیکھ لو۔آدھی بوتل شراب اسی میں ہو گی''۔کنتی نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

''میں اس آدھی بوتل شراب کی بات کر رہا ہوں جو تیرا بیٹا پی گیا''۔

''کیوں؟۔۔کیا وہ تمہارا کچھ نہیں ہے۔تم اسکے باپ نہیں ہو؟''۔

''باپ؟۔۔ہونہہ۔باپ تو بے شک میں ہی ہوں۔۔ہر کوئی جانتا ہے''۔اس نے بوتل کا کاگ کھولا اور ایک بڑا گھونٹ نیٹ ہی بھر لیا۔تیزاب کی ایک سلاخ حلق سے معدے تک اترتی چلی گئی۔

''ہمارا بیٹا گمراہ ہو چکا ہے۔۔وہ ہم سے ہر بات پوشیدہ رکھنے لگا ہے۔پہلے تو ایسا نہیں تھا۔سب کچھ کہہ دیتا تھا''۔

''اب وہ جوان ہے۔اور جوان خون بہت کچھ مانگتا ہے''۔

''رانا۔مجھے بتاؤ۔وہ اگر سروس نہیں کرتا تو اسکے پاس پیسے کہاں سے آتے ہوں گے؟''۔

''پیسہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔تمہارا پرس۔۔میری جیب۔۔مگر نہیں۔۔میری جیب سے کبھی کچھ نہیں گیا''۔

''تو پھر''۔

''ہو گا دس بیس روپے جیب میں آ جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔لیکن اتنے کم پیسوں میں تو معمولی قسم کی بازاری ۔۔۔''

''رانا''۔وہ چیخ پڑی۔''خبردار ایک بھی گندہ لفظ میرے بیٹے کے خلاف مت کہنا۔سمجھے تم''۔اور وہ اندر ہی اندر غصے سے کھولتی ہوئی بیڈ روم میں بند ہو گئی۔کال بیل پر رانا نے دروازہ کھولا۔انشومن تھا۔پوری پولس وردی میں ملبوس۔

''گڈ مارننگ سر''۔

''آؤ۔۔ میں تمہارا ہی منتظر تھا''۔انشومن رانا کے تعاقب میں کمرے میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''انشومن۔جم تین دن سے گھر نہیں آیا۔اسکی ماں بہت پریشان ہے''۔

''کہیں چلا گیا ہوگا۔آجائے گا''۔

''تم ان دو مرڈر کیس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''۔

''یہاں صرف ایک ہی پولس اسٹیشن ہے۔اسلئے ان دونوں کیسیز کو میں ہی Investigate کر رہا ہوں''۔

''پھر کوئی نتیجہ نکلا''۔

''صرف اسقدر کہ جس سلاخ سے مس سمریجا کو قتل کیا گیا اس پر اس مقتول کی انگلیوں کے نشان ملے ہیں جسکی لاش کالیج کی ڈائننگ ٹیبل پر پائی گئی تھی''۔انشومن نے اپنی کیپ سر سے اتار کر رکھتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا''۔لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی رانا صاحب۔مس سمریجا کو کیوں قتل کیا گیا؟کوئی چوری نہیں ہوئی۔نہ اس کی لاش پر دست درازی کے نشان پائے گئے''۔

''تمہارا وہ کیس حل ہوا یا نہیں؟''۔

''نہیں۔۔۔''

''انشومن۔۔میں بھی آجکل ایسی ہی صورتِ حال سے دو چار ہوں۔مجھ سے اب یہ بوجھ برداشت نہیں ہوتا اگر اور چپ رہا تو۔۔تو میں اندر ہی اندر پھٹ جاؤں گا''۔

''کیسی صورتِ حال رانا صاحب؟۔میں کچھ بھی نہیں سمجھا''۔

''ٹھہرو۔میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں تمہیں۔ایک اگریمینٹ جو میں نے پچیس ہزار کے عوض خریدا تھا''۔رانا نے تیزی سے اُٹھ کر الماری کھولی اور اسکے لاکر میں کچھ تلاش کرنے۔فائلیں کاغذات کا ایک انبار فرش پر لگتا گیا اور اسی کے ساتھ رانا کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔

''شاید آپ کو اس کی تلاش ہے''۔رانا نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔جم بیرونی دروازے میں کھڑا تھا۔اسکے ہاتھ میں کچھ پیپر تھے۔انشومن نے بھی پلٹ کر اسے دیکھا اور کنتی نے بھی اسکی آواز سن لی تھی۔وہ دوڑتی ہوئی آئی اور جم کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ دیا۔

''اب آرہا ہے کمینے۔کہاں تھا تین دنوں سے''۔

''گھٹن سے دور۔کھلی ہوا میں''۔

''جانتا ہے تو۔۔؟تیرے نہ ہونے سے ہمارا چین ہمارا سکون سب چھن گیا تھا''۔

''میرا بھی بہت کچھ ضائع ہوگیا ہے ماما''۔جم نے اسکے ہاتھ اپنے بازو سے ہٹادیئے۔''ناکامی کے امتحان۔عمر کی راحتیں۔بچپن کی شرارتیں۔جوانی کے شور میں رشتوں کی پاکیزگی۔تم کس کس کا حساب لوگی ماما؟''۔اس کا لہجہ بہت سرد

تھا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہا ہے تو۔۔ اُف کتنی خوفناک باتیں۔ چل پہلے کھانا کھالے''۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی بولی۔ جم کی چال میں لنگراہٹ محسوس کر کے وہ سہم گئی۔

''یہ تیرے پیر کو کیا ہوا؟''۔

''معمولی چوٹ ہے۔۔ ٹھیک ہو جائے گی''۔ اچھا تو یہیں رُک۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں''۔ اور وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ رانا نے جم کے ہاتھ سے کاغذات چھین لئے۔ ''یہ پیپرس تمہیں کہاں سے ملے؟''۔

''جہاں آپ نے سنبھال کر رکھے تھے''۔ جم لنگڑا کر چلتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور زخمی پیر کو اوپر اُٹھا کر اسے سہلانے لگا۔

''یہ۔ یہ اسکارف۔ تمہیں کہاں سے ملا؟''۔ زخم پر بندھے اسکارف کو دیکھ کر رانا سہم گیا۔

''کونسا اسکارف؟''۔

''یہی جس سے تم نے بینڈیج کر رکھی ہے۔ کہاں سے ملا؟''۔

''وہیں سے جہاں سے مجھے یہ زخم ملا ہے''۔

جم اُٹھ کر اندر جانے کے لئے اُٹھا کہ رانا نے سختی سے اسے پھر کرسی میں ڈھکیل دیا۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں جم''۔

''آپ پہلے بھی پوچھ سکتے تھے''۔

''تب تمہاری ماں تھی یہاں۔ شک کو یقین میں بدلتا دیکھ کر وہ مر ہی جاتی''۔

انشومن نے اُٹھتے ہوئے رانا سے اجازت طلب کی۔ ''رانا صاحب۔ آپ کی گفتگو پرسنل ہوتی جا رہی ہے مجھے اجازت دیجئے''۔

''نہیں انشومن تم یہاں موجود رہو گے۔ جب تک ہماری گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا''۔ وہ پھر جم سے مخاطب ہو گئے

''بستی میں دو خون ہو چکے ہیں اور تم تین دن سے لاپتہ تھے۔ مجھے بتاؤ یہ اسکارف تمہیں کہاں سے ملا؟''۔

''اوہ۔۔ یہ اسکارف۔ یہ تو ایک عام سا اسکارف ہے۔ کسی کا بھی ہو سکتا ہے''۔ جم کا لہجہ معنیٰ خیز ہو گیا

''نہ تو یہ عام اسکارف ہے اور نہ یہ ہر کسی کا ہو سکتا ہے''۔ رانا کا لہجہ جذبات سے مرتعش ہو گیا۔

''یہ اس عورت کا اسکارف ہے جسے کمپنی باغ کے مکان میں قتل کیا گیا ہے''۔

''اتنا یقین؟''۔

میرے یقین کی ٹھوس وجہ ہے۔ دیکھو اسکے ایک کونے پر آر وی کڑھا ہوگا''۔

انشومن نے جم کے ہاتھ سے اسکارف جھپٹ لیا جو وہ زخم سے کھول چکا تھا۔

''ہاں بے شک۔انگریزی کے دوحروف آراوروی کڑھے ہوئے ہیں اس پر۔سرخ دھاگے سے''۔

جم نے بہت اطمینان سے ہیروں کا نیکلس جیب سے نکال کر رانا کو دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

''تو آپ اس نیکلس کو بھی پہچانتے ہوں گے؟''۔

رانا نے اسکے ہاتھ سے نیکلس لے لیا۔''یہ۔۔یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''۔انشومن نے رانا کے ہاتھ سے نیکلس تقریباً چھین لیا اور اسے غور سے دیکھتا ہوا حیرت سے بولا۔

''ڈائمنڈ۔ایک نہیں پورے ستائیس اور سونا بھی ۲۳ رکیرٹ سے کم نہیں ہوگا۔جم! تمہیں اتنا قیمتی نیکلس کہاں سے ملا؟

''ملا نہیں۔۔حاصل کیا ہے''۔

رانا وحشت سے چیخ پڑا۔تو کیا۔تم نے؟۔اوہ خدایا''۔انہوں نے ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔''بیڈ روم کی تنہائی میں وہ اکثر یہ ہار پہن کر خود سے باتیں کرتی تھی۔اسکارف اسکی آنکھوں کے سامنے ہوتا وہ کبھی اسے چومتی، کبھی دیکھتی اور پھر رو دیتی تھی''۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''۔

''میں ہر رات اسکے کمرے میں موجود رہتا تھا''۔

''کیوں۔۔کیوں جاتے تھے اسکی خوابگاہ میں؟''۔رانا نے اسے طمانچہ مار دیا۔شاید پہلی بار لیکن جم کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''عورت اگر جوانی میں ہی بیوہ ہو جائے تو اسے مرد کی ضرورت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے''۔

''تو کیا۔۔کیا تم۔۔۔''

''یہ اتنی اہم بات نہیں جس پر جذباتی تبصرہ کیا جائے''۔جم نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

''یہ جسموں کا ملاپ۔چوری، خون۔زنا آج ہماری مہذب دنیا کے دلچسپ کھیل ہیں بلکہ چند بڑے اور ترقی یافتہ ملکوں میں تو یہ قومی کھیل بنتے جا رہے ہیں۔مگر میں۔۔کبھی بھی اس مہذب کھیل میں مقتولہ کا بیڈ روم پاٹنر نہیں بنا۔نہ اس نے کبھی مجھے آمادہ کیا۔ایک احترام ہمارے درمیان حائل رہا۔نہ جانے کیوں اس عورت سے ایسا لگاؤ محسوس کرتا تھا جس میں Respact ہوتی ہے''۔

''اوہ خدا۔۔تیرا شکر ہے''۔رانا کو یکا یک ایک طمانیت نے آگھیرا۔انشومن باپ بیٹے کی گفتگو میں حائل نہیں ہوا۔وہ ان کی گفتگو سے کسی نتیجہ کا منتظر تھا۔

''میں اس نیکلس کو پانا چاہتا تھا۔لیکن چرا کے نہیں، خود اسکے ہاتھوں سے۔یہ نیکلس۔اس سے مقتولہ کا کونسا جذباتی رشتہ تھا۔جتنا سوچتا اتنا الجھتا جاتا۔پرسوں رات بھی جب میں اسکے مکان میں داخل ہوا تو وہ کسی مرد کے ساتھ الجھ رہی تھی۔لان میں اندھیرا تھا مگر کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور کسی کے تکرار کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ابھی میں

معاملے کو سمجھنے پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک مس سمر یجا کی چیخ میں نے سنی۔اس کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز ہوئی۔میں سہم گیا۔میں نے دیکھا ایک مردانہ سایہ کھڑکی سے اُتر کر تیزی سے اندھیرے میں گم ہو رہا تھا۔میں نے کھڑکی سے دیکھا۔سمر یجا کی خون سے لت پت لاش فرش پر پڑی تھی۔میں نے اندھیرے کا حصہ بنتے اجنبی کا پیچھا کیا۔وہ اس شاندار پہاڑی کاٹیج میں داخل ہو گیا۔اس نے عقب کا راستہ استعمال کیا تھا۔میں نے کاٹیج کی اسی کھڑکی سے دیکھا جس سے وہ اندر گیا تھا۔اجنبی کمرے میں نہیں تھا۔پھر میں نے اسے باتھ روم سے باہر آتے دیکھا۔وہ کھانے کی میز کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔میری جانب اسکی پشت تھی۔میں دبے قدموں اسکے پیچھے پہونچ گیا۔میں اسکا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس نیکلس کو ضرور دیکھ رہا تھا جو اس نے اسکارف سے نکال کر کھانے کی میز پر پھیلا دیا تھا۔سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ہر طرف خاموشی تھی۔دور کہیں سے ہلکی اور مدھم آوازیں اُبھر رہی تھیں۔میں نے ایک ریک پر رکھے پھلوں کی باسکٹ کو دیکھا اسپر پھل کاٹنے کا چاقو بھی تھا۔میں نے چاقو اُٹھا لیا اور کسی ماہر چاقو باز کی طرح اسکے بالکل پیچھے کھڑا ہو گیا۔شاید میری سانسوں نے اسے میری موجودگی کا احساس دلا دیا تھا۔وہ ایکدم پلٹا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔میں نے چاقو سے وار کیا۔وہ خود کو بچانے کی فکر میں میز پر گر گیا۔میں نے دوسرا وار کیا جو سیدھا اسکے دل پر لگا اور چاقو دستے تک اسکے دل میں اُتر گیا۔میں نے اپنی مہربان خاتون کے خون کا بدلہ لے لیا۔نیکلس کو اسکارف میں لپیٹا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔باہر کودتے وقت کانچ کا کوئی ٹکڑا جوتے میں چھید کرتا ہوا پیر کو زخمی کر گیا''۔

''یہاں تمہارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔تفتیش میں کچھ ثبوت پولس کو ملے ہیں جن سے کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا امکان پایا گیا ہے۔تو وہ دوسرے شخص تم تھے؟ اصل قاتل؟''۔

رانا کو یہ امید نہیں تھی کہ اسکا بیٹا ہی قاتل ہونے کی تصدیق کرے گا۔''تم نے دوہرا جرم کیا ہے جم۔چوری بھی اور قتل بھی''۔

''جرم سے زیادہ میں نے اس مہربان خاتون کے خون کا بدلہ لیا ہے''۔

''آخر تم نے یہ جرم کیا ہی کیوں جم؟''۔

''کونسا جرم ڈیڈ۔اخلاقی یا غیر اخلاقی؟''۔جم نے رانا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہر خند سے کہا۔

''میرے اصرار پر مس سمر یجا نے اپنے پیار کی کہانی سنائی تھی۔اس کی نجی زندگی میں صرف دو ہستیاں آئی تھیں۔ان میں سے ایک ہستی کی تصویر مس سمر یجا نے مجھے دکھائی تھی''۔جم نے رانا کو گھور کر دیکھا۔رانا نے گھبرا کر نظریں چرالیں۔''یہ تصویر مسٹر جیکال کی تھی۔میں نے جیکال کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر نہ جانے کیوں اس تصویر کے خدوخال مجھے اجنبی نہیں لگے۔اور میں الجھن کا شکار ہو گیا۔یہ الجھن تب دور ہوئی جب یہ ایگریمنٹ لے کر مسٹر جیکال یہاں آئے اور آپ نے ۲۵ ہزار کے عوض اس ایگریمنٹ کو خرید لیا''۔

''جم۔۔۔یہ کیا کہہ رہا ہے تو''۔اچانک کنتی کی آواز اُبھری۔کنتی نے جم کو بے تحاشہ جھنجھوڑ ڈالا۔وہ نہ جانے کب

اندر آ گئی تھی۔

"وہی کہہ رہا ہوں ماما جو اس ایگریمنٹ میں لکھا ہے"۔ جم نے رانا کے ہاتھ سے کاغذات جھپٹ لئے۔

"کیا تم نے مجھے پانے کے لئے جیکال کے ہمراہ راتیں نہیں گزاری تھیں؟ شادی کے بعد بھی جب تم ماں نہیں بن سکیں تو تم نے اپنے اس شوہر کی مردانگی کا بھرم رکھنے اور سماج میں اسے ایک باپ کا رتبہ دلانے کے لئے جیکال کی مردانگی کا سہارا لیا۔ کیونکہ۔۔ مسٹر رانا ویر سنگھ۔ تمہارے شوہر۔ شہر کے عزت دار پولس آفیسر اور میرے نام نہاد باپ مردانہ جوہر سے محروم تھے۔ کیوں ڈیڈ۔۔۔" وہ رانا کے بازو پکڑ کر بولا۔ اُف کتنی سختی تھی اس گرفت میں، رانا ویر سنگھ کا سارا جسم سہر اُٹھا۔ "میں آپ کو ڈیڈ ہی کہوں گا۔ اسلئے کہ اپنی ماما کا بھرم مجھے بھی عزیز ہے۔ ڈیڈ! یہ نیکلس اسی رات کی نشانی ہے نا جب آپ نے مس سمریجا کے پیار کو قبول کیا تھا اور اسے رات کی کربناک تاریکی میں بستر میں چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس رات آپ کو بھی پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ آپ۔۔ آپ ایک کھوکھلا ستون ہیں۔ ایسا ستون۔ جس پر وقت کے صناع نے خوبصورت بیل بوٹے تو بنا دیئے مگر ان میں خوشبو ڈالنا بھول گیا۔ وہ رات اور پرسوں کی رات مس سمریجا کی زندگی میں کوئی خوشی نہ لا سکی۔ اور آپ نے ماما سے شادی کر لی۔۔ اس ماما سے جو میری ماں ہے مگر آپ ۔۔۔ مکمل ہو کر بھی نامکمل رہے اور میری ماما کی تکمیل نہیں بن سکے"۔

اور ماحول یکا یک بے حد بوجھل ہو گیا۔۔ کمرہ جیسے انسانی وجود سے خالی ہو گیا۔ چہرے اپنی روشنی کھو بیٹھے۔ صرف انشومن تھا جو کلائمکس کا تجزیہ کر رہا تھا۔ جم اپنی جگہ سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا کنتی، رانا اور انشومن کے پاس رکتا، ان کے چہروں پر نظر ڈالتا اس ریک کے پاس ٹھہر گیا جس پر کنتی، رانا اور جم کی تصویر فریم کی ہوئی رکھی تھیں۔

"آج مجھے رشتوں کی صحیح پہچان ملی ہے۔ کتنے عجیب ہیں یہ رشتے جن کی تخلیق خون کی بنیادوں سے کی جاتی ہے۔ یہ رانا ویر سنگھ ہیں۔ زمانے کے لئے یہ میرے باپ ہیں ان سے میرا صرف اتنا رشتہ ہے کہ یہ میری ماں کے قانونی شوہر ہیں۔ مسٹر جیکال او بران۔ سزا یافتہ غنڈہ۔ رشتے میں میرا غیر قانونی مگر حقیقی باپ۔۔ مس سمریجا میرے قانونی باپ کی محبوبہ جس نے ساری زندگی اس پیار کی نذر کر دی جسے وہ کبھی نہ پا سکی۔ یہ ایگریمنٹ جس نے میرے ادھورے پن کو رسوم کی قید سے رہائی دلا دی۔ آج رشتوں میں بندھے کرداروں کے خاموش اعتراف نے مجھے مکمل کر دیا۔ کتنے عجیب ہیں ٹوٹے ہوئے وجود کے ملبے پر کھڑے رشتے۔ اور یہ مسٹر انشومن ہیں۔ ان سے بھی میرا رشتہ قایم ہو چکا ہے۔ مجرم اور قانون کا رشتہ۔ ان نامکمل رشتوں کو کون مکمل کرے گا؟ شاید میں۔ ہاں صرف میں۔ مسٹر انشومن"۔ جم نے انشومن کو مخاطب کیا۔ "کنتی اسکا مطلب سمجھ کر چیخی۔

"نہیں جم نہیں"۔ کنتی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اسکا سارا وجود آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

"نہیں تو کہیں نہیں جائے گا۔۔ سنا تو نے"۔ کنتی سارے جسم سے کانپ اُٹھی۔ فرط جذبات سے وہ مغلوب ہو گئی۔

"اگر میں نہیں گیا تو ہمارے رشتے اِس بانجھ سوسائٹی کی آرٹ گیلری میں اسی طرح اکاڈمک بنے رہیں گے"۔ جم کی آواز میں عزم کی کراہیں تھیں۔

''یہ کیسی جانوروں جیسی باتیں کر رہا ہے؟''۔ کنتی وحشت سے چیخ پڑی۔

''جانور انسان سے بہتر ہیں ماما۔ ان میں رشتوں کے ٹوٹنے کا کرب نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک سی زندگی جیتے ہیں۔ یہ ہم انسان ہی ہیں جو اپنا وجود بچانے کے لئے دوسروں کے وجود کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔۔'' جم کی آواز میں فرانھانہ ٹھہراؤ تھا۔ اس نے انشومن کی طرف دیکھا کہ انشومن بھی اپنے فرض کا پابند اسکے اگلے اقدام کا منتظر تھا۔

''مسٹر انشومن۔۔ آیئے۔۔ مجھے لے چلئے''۔

منظر غبار آلود ہو گیا۔ اس غبار میں دو ٹوٹے وجود اپنے بدن پر حسرتوں کا بار اُٹھائے مقدرات کی سخت چٹان پر انسان کی مکار بشریت پر نوحہ خواں رہ گئے۔

اس غبار سے دونوں جسم پیش منظر میں آ گئے۔ پہلے جسم نے دوسرے جسم کی طرف دیکھا۔

''تم نے دیکھا۔ زندہ تہذیب کا المناک سچ؟''۔

''ہاں۔۔ یہ غذا کی ہی زیادتی ہے جو آدمی کو اکاڈمک بنا کر خود غلاظت میں بدل جاتی ہے''۔

''اور اس کی پاداش میں یہ دنیا آباد ہو گئی''۔

''تو کیا یہ دنیا جنت نہیں بنے گی کبھی؟''۔

''انسان جنت کی آرزو میں اپنی نفسانی خواہشات پر لبیک کہنے پر مجبور ہے''۔

''تو چلو ہم اپنی آنکھیں موند لیں اور اپنے جسموں پر بے حسی کا عطر مل کر آدمی کے کھوکھلے پن کا نوحہ گائیں''۔

☆☆☆

ستم ظریف

اُس نے اپنے پیچھے اردگرد نظر ڈالی۔ بہت سے جسم تھے اسی کی طرح وقت کی بھیک اپنے ناتواں ہاتھوں میں سمیٹنے کے لئے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے سب کے چہروں کو دیکھا لیکن کسی بھی چہرہ کو اپنے سے الگ نہیں پایا۔ ہر چہرے پر اُمید، فاقہ، درد اور زخموں کی تڑپ تھی۔ سب کے ہاتھ آرزوؤں کی راکھ اور بیکاری کی دھول میں سنے ہوئے تھے اور پیشانی کی سلوٹوں سے سپنوں کا لہو پسینہ بن کر بہہ رہا تھا۔ اتنے بڑے ملک کے اتنے بڑے شہر میں اور اتنے بڑے شہر کے اتنے بڑے سیٹھ کے عالیشان ایرکنڈیشنڈ آفس کے لان میں جگہ جگہ دھوپ کی تمازت سے جھلستے یہ جسم اب اتنے ٹھوس ہو چکے تھے کہ اُن پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا تھا۔

اُس نے سر اُٹھا کر سورج کو دیکھا لمحہ بھر کو اس کی آنکھیں اندھکار میں ڈوب گئیں لیکن پانی کا کوئی قطرہ آنکھوں کی کوروں سے نہیں بہا۔ وقت کی تپش نے کب سے ہی آنکھوں کے کنارے جھلسا دیئے تھے۔ سورج کی نوکیلی کرنیں اس کی آنکھوں کی کھڑکیوں سے کسی شوریدہ سر غنڈے کی طرح اندر تک گھستی چلی گئیں اُس نے گھبرا کر سورج سے اپنی آنکھیں چرالیں۔

صبح آٹھ بجے سے بارہ بج گیا تھا لیکن ابھی تک کوئی سنوائی نہیں ہوئی تھی۔ گیارہ بجے ضرور اِس بے جان سی بھیڑ میں زندگی کے آثار جاگے تھے جب آفس کا چپراسی آیا تھا۔ اُس نے تالا کھول کر اندر صفائی کی تھی۔ باہر جھاڑو لگائی تھی اور اُن کی سوالیہ اُٹھی ہوئی نگاہوں کا جواب صبر کی تلقین سے دیا تھا اور اب بارہ بھی بج چکا تھا۔ سیٹھ ہلکو رام اب تک نہیں آئے تھے۔ دراصل آج ایکسٹراؤں کی بھرتی ہونے جا رہی تھی اور ایکسٹرا سپلائر نے اس بھیڑ کو سیٹھ ہلکو رام کے آفس میں ہانک دیا تھا۔ سیٹھ ہلکو رام ایک بڑی دھانسو فلم بنانے جا رہے تھے جس کا مہورت پچھلے دنوں فلم سٹی میں بڑے زور شور کے ساتھ ہوا تھا۔ اس مہورت پر انسدادِ جرائم اور وزارت نشہ بندی کے وزیر دہلی سے بہ نفسِ نفیس تشریف لائے تھے اور مہورت کے شاٹ کے بعد وزیر صاحب کے اعزاز میں کھل کر ''نشہ بندی'' کا اظہار امپورٹیڈ شراب کی بوتلیں کھول کر کیا گیا جو سیٹھ ہلکو رام کے دیرینہ دوست فارین سے اسمگل کر کے خاص اس مہورت کے لئے لائے تھے۔ ''نشہ بندی'' کا نشہ قابضِ سلطنتِ دل وجاں ہوا اور جنسی جرائم نہ ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔ وزیر صاحب نے اِسے ضرورت کا نام دیا کیونکہ جنسی جرائم میں فریقین نے عدم تشدد کا فراخ دلانہ مظاہرہ کیا تھا۔

اور اب ہلکو رام کا پبلسٹی ڈپارٹمنٹ اُن کی فلم کی پبلسٹی پوری شدومد کے ساتھ کر رہا تھا۔ اسٹار کاسٹنگ بھی بہت غضب کی تھی۔ فلم اناؤنس ہوتے ہی تمام ٹریٹریز کلوز ہو چکی تھیں۔ سیٹھ ہلکو رام ہلکی فلم تو نہیں بنا رہے تھے۔ اونچی فلم تھی، اس لئے اُن کا خیال تھا کہ فلم میں وہ سب کچھ ہو جو فلم میں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے اسٹوری رائٹر سے بہت سے کیرکٹر فلم میں ڈلوائے تھے جو زیادہ تر ضرورت کے مطابق پردے پر آتے ہیں۔ یہ سارے رول بڑے بڑے

فلم اسٹاروں کو دیے گئے تھے لیکن کچھ ایسے بھی رول تھے جو اہم تو تھے لیکن کسی بڑے اسٹار کی قدِ آور شخصیت سے مطابقت نہ رکھتے ہوئے کسی قدر ''ہلکے'' تھے۔ایسے ہی کرداروں کے لئے سیٹھ ہلکورام کو نئے چہروں کی ضرورت درپیش تھی۔آج اسی ضرورت کی خانہ پُری کے لئے یہ لان انسان کی مجبوری کا بوجھ اُٹھائے مئی کی تیز اور حبس آمیز دھوپ میں جھلس رہا تھا۔

یکا یک شور ہوا۔سیٹھ جی آگئے۔سب کی نگاہیں بے اختیار داخلے کے گیٹ کی طرف اُٹھ گئیں۔سیٹھ جی کی شاندار ٹویوٹا اندر داخل ہو رہی تھی۔کار پوٹیکو میں رُکی۔ڈرائیور سے پہلے کچھ چمچوں نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور سیٹھ ہلکورام اپنی توند کو سنبھالتے ایک شانِ بے نیازی سے اپنے آفس میں چلے گئے۔

امیدواروں کے چہروں پر انتظار کی جگہ اضطراب جاگ اُٹھا۔دل دھڑ کنے لگے لیکن اُس کے چہرے پر نہ اضطراب تھا نہ آنکھوں میں کوئی تاثر چہرے پر بے حسی منجمد تھی۔جیسے وہ آسمان کا وہ کنارہ ہو زمین سے ہم آغوش ہوتا ہوا تو لگتا ہے مگر دراصل ہوتا نہیں۔اُس نے پھر اپنے اردگرد دیکھا۔آفس کی شاندار بلڈنگ سے اُن جسموں کا موازنہ کیا۔اور دور اِس بڑے شہر کی خلاؤں میں کچھ تلاش ہونے لگا۔شاید کوئی خواب......کوئی اُجالا......یا ماضی میں کھویا ہوا کوئی لمحہ......نہ جانے اور کتنی دیر خیالوں کے ریگ زار میں صداکاری کرتا کہ اسکے نام کی پکار سے پورا لان گونج اُٹھا۔اُس نے چونک کر دیکھا۔لان امیدواروں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا اور چپراسی اس کا نام پکار رہا تھا لیکن اس کا کوئی نام نہیں ہے؟ شاید نمبر پکارا ہے چپراسی نے۔۲۵ نمبر...ہاں یہی نمبر ایکسٹرا سپلائر نے اُسے الاٹ کیا تھا۔۲۵ نمبر.....اور عمر ۴۵ سال........ اُف کتنی مطابقت ہے وقت کے کرم اور وقت کے ستم زدہ فاصلے میں....!

جب وہ ایر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوا تھا تو سیٹھ ہلکورام ریوالونگ چیر پر بیٹھے موٹی موٹی آنکھوں اور کالے بھدے ہونٹوں کو آگے نکالے اُسے ہی گھور رہے تھے۔باہر کی دنیا اور اس اندر کی دنیا میں ذرا بھی مطابقت نہ تھی کتنا گرم اور کتنا سرد تضاد تھا دونوں میں۔ہلکورام کو اس کے خیالات سے کیا سروکار ہو سکتا تھا.....وہ لاپرواہ سا دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے چپ کھڑا تھا۔سیٹھ ہلکورام کی شکل کی طرح ان کی آواز بھی اتنی ہی کراہیت آمیز تھی۔

''کبھی اور فلموں میں کام کیا ہے......؟''

''جی......''

''کون سی فلم میں....؟''۔

''یاد نہیں........''۔

''فلم دیکھتے ہو''۔

''شاید......''۔

''کونسا ایکٹر پسند ہے سالا تیرے کو؟''۔

''خاموشی.........''

''کون سی ایکٹرنی لایک کرتا ہے تم''۔

پھر خاموشی.........!

''سالا تم کچھ بولے گا یا اُلو کی ما فک کھڑا اچ رہے گا؟''۔

''میں نے.....کوئی فلم نہیں دیکھی......عرصہ ہو گیا''۔

''پھر تم اِدھر کس واسطے آیا ہے؟......سالا......مگج پھریلا ہے کیا تیرا؟''۔ ہلکورام ایکدم بھڑک اُٹھے۔

پھر اس کے چہرے پر نظر ڈالی جہاں لاتعلقی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہلکورام کو جیسے اُس کے چہرے میں کچھ نظر آیا۔ ایک دھندلی سی شباہت وہ اپنے لہجے کو نرم بنا کر بولے۔

''پر ہم بھی پاگل اچ ہے۔ سالا.....تم کاہے کو یہ سب ہوئیں گا........سالا وہ ایک ایکٹر ہوا کرتا تھا۔ پرشانت رائے ....سالا کیا دھانسو ایکٹر تھا۔ اپنے کو تو اس کے آگے کوئی جمتا اچ نہیں۔ اگر سالا وہ ہوتا تو اسکو اپن فلم میں ہیرو بناتا ہیرو ...... پتہ ہے تم کو؟.....اسکرین پر آتے ہی سنیما ہال کی ایسی تیسی ہو جاتی تھی۔ سالا ہیرو تھا ہیرو..........گولڈن جوبلی اور پلاٹینم جبلی سے نیچے کوئی فلم ہی نہیں دی اُس نے۔ پر سالا تم کاہے کو جانے گا اسکو؟....اُسکی ما پھک تو کوئی ہنس اچ نہیں سکتا.....رواج نہیں سکتا.....''۔

اُس نے بے جان نظروں سے سیٹھ کے موٹے بھدے ہونٹوں کو پرشانت رائے کی تعریف کے کلمات نکل رہے تھے۔ پہلی بار اُسے ہلکورام کے ہونٹ کسی نازنین کے ہونٹوں سے کہیں زیادہ پُرکشش اور سیاہ فام کراہیت آمیز چہرہ پہاڑ کی چوٹی پر جمی برف کی طرح شفاف محسوس ہوا۔

''اچھا پرشانت رائے کا کوئی ڈائلاگ بول کے سناؤ؟''۔ سیٹھ کی آواز اُبھری۔ مگر اسے تو کوئی ڈائلاگ یاد ہی نہ تھا۔ وقت نے اس کے جسم پر اتنے تھپیڑ مارے تھے کہ وہ اپنی زبان بھی بھول چکا تھا۔ اب تو صرف ایک احساس زندہ رہ گیا تھا۔ بھوک....بھوک اور اسی بھوک کی خلش اور تپش کو بجھانے کے لئے وہ ایکسٹرا میں بھرتی ہونے آیا تھا۔

''تم بولتا کیوں نہیں ہے.....سالا''.....سیٹھ جھنجھلا کر بولے۔

''مجھے.....یاد نہیں''۔

''کیا یاد نہیں ہے.....جب تم پرشانت رائے کا کوئی ڈائلاگ اچ یاد نہیں تو فلم میں کام کیسے کریں گا؟.....سالا..... ڈائلاگ اچ بولنا نئیں آتا۔ تو ہنس کے دکھاؤ....رو کے دکھاؤ....گا کے ناچ کے دکھاؤ۔ سالا ہم تم کو اپنی سپرہٹ فلم میں چانس دینا لگتا اور تم سالا.......''۔

''سیٹھ جی.....ایک بار.....بس ایک بار کیمرے کے سامنے آنے دیجئے.....پھر.....پھر میں خود بولنے لگوں گا''۔

اُس نے اپنی پوری ہمت جمع کر کے کہہ ہی دیا۔

''کیا سالا کیمرے کے سامنے بولے گا؟''۔ وہ حقارت سے اپنی سکریٹری کی اسکرٹ سے جھانکتی ''اشتہا انگیز''

پنڈلیوں کو دیکھ کر ہونٹوں پر آتی ہوئی رال کو زبان سے چاٹتے ہوئے بولے۔

''لیکن سیٹھ جی.....''

''اپن کی فلم میں ایسا ویسا رول اچ نہیں ہے۔ جو تم جیسا لوگ کو دیا جائے..... سمجھا سالا تم.....بس انٹرویو کھلاس..... دوسرا بولاؤ......'' سیٹھ جی نے اُسے ایسے نظر انداز کر دیا جیسے وہ انسان نہ ہو، سڑک پر پڑا ہوا کیلے کا حقیر چھلکا ہو جس سے قدم بچا کر سیٹھ جی آگے بڑھ گئے۔ اُس نے سیٹھ ہلکورام، اُن کی سکریٹری، ایر کنڈیشنڈ آفس کی بے حسی کو نگاہوں کے پیمانوں سے ناپا اور اپنے قدموں کو باہر جانے کے لئے موڑ لیا۔ دروازے سے باہر آتے ہی اُسی انگارے برساتی دنیا نے اس کا استقبال کیا.... کتنا فرق آگیا ہے اِس استقبال میں..... کاش..... کاش......!

وہ گیٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ ٹریفک کا ہنگامہ، بھاگتے دوڑتے انسانوں کا اژدہام .....اونچی آسمان کی بلندیوں کو چھوتی بلڈنگوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا سا آدمی اپنی بے بس زندگی کے ماضی کی لاش اُٹھائے وجود کو گھسیٹ رہا تھا۔ اِس اتنے بڑے شہر کی ہر آنکھ بے گانہ ہو چکی تھی۔ کوئی نگاہ لمحہ بھر کو بھی اسکے چہرے میں کسی گمنام شباہت کو تلاش کرنے کے لئے نہیں رُکتی تھی۔ کس سے کہتا وہ کہ کبھی اسکے فلیٹ پر بھی پروڈیوسروں کی قطار لگا کرتی تھی۔ جب کبھی اس کی فلم ریلیز ہوتی تو اس کے پرستار دھوپ، بارش اور سردی کی پرواہ کئے بغیر ایک ٹکٹ حاصل کرنے گھنٹوں سنیما کے باہر کھڑے رہتے تھے۔ ہر بڑی ہیروئن اس کے ساتھ اسکرین پر آ کے ہی اسٹار بنتی تھی۔ کتنی تجوریاں اس کے نصیب سے جاگی تھیں....کاش.....وہ سیٹھ ہلکورام سے چیخ چیخ کر کہہ سکتا.....سیٹھ ہلکورام .... پرشانت رائے مرا نہیں، اب بھی زندہ ہے.....مگر.....اُس کی ہنسی، اُس کی خوش نصیبی کو وقت کی ستم ظریفی دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے.....!

☆☆☆
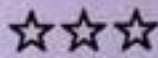
کھڑکی

لاشعور سے ذہن کے پردے پر جو یاد ابھرتی ہے، وہ ایک چہرہ ہے۔اماں کا چہرہ ۔مصلے میں لپٹا پاکیزگی کی علامت۔آنکھوں میں نور کی نرمی اور ہونٹ کسی آیت کا ورد کرتے ہوئے ۔ہاتھ کبھی آٹا گوندھتے ہوئے، روٹی سالن پکا تے ہوئے ، کپڑے برتن اور صفائی کرتے ہوئے اور فرصت کے اوقات میں قرآن مجید کے ورق الٹتے ہوئے۔میں تب چھوٹا تھا ۔میں روتا تو وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر دلار کرتیں۔دودھ پلاتیں رات کو سونے سے پہلے دعائیں یاد کر اتیں اور میری ہی زبان میں مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔

پھر جو یاد کرتا ہوں تو ایک اور سراپا ابھرتا ہے۔ابا کا سراپا۔اونچے پورے، سرخ وسفید رنگت۔سیاہ لمبی ڈاڑھی، بھو ری بھوری آنکھیں۔کشادہ پیشانی پر سجدے کا سیاہی مائل نشان۔ہونٹوں پر ہمیشہ استقبالیہ مسکراہٹ۔سر پر سفید عمامہ با ندھے رہتے تھے۔ہاتھ کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے۔کبھی پودوں میں پانی دیتے ہوئے۔کبھی مکتب میں بچوں کو درس دیتے وقت چھڑی استعمال کرتے ہوئے۔کبھی سادے کاغذ پر اپنے مخصوص قلم سے کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے۔آواز میں رعب، چہرے پر جلال اور لہجے میں نرمی۔ایک عجیب سی شفقت ان کے پورے سراپے میں پوشیدہ سی۔میرے ابا مسجد میں امام تھے۔طبیب بھی تھے۔لوگ اُن سے دینی مسائل پوچھنے آتے۔مذہبی امور پر مشورے کرتے اور اپنی مشکلات کا حل تلا ش کرنے میں ابا کی رائے لیتے۔مسجد میں ایک مدرسہ بھی تھا جہاں ابا دینی تعلیم کے ساتھ نصابی تعلیم بھی بچوں کو دیتے تھے۔انگریزی، سائنس، اردو اور حساب بھی پڑھاتے تھے۔مجھے یاد ہے، وہ مجھے سویرے جگا دیتے۔ابھی رات باقی ہو تی، وہ مجھے ضروریات سے فراغت کراتے ، وضو کراتے اور پھر اپنے ساتھ مسجد لے جاتے تھے۔سب سے آگے ابا کھڑے ہو جاتے۔ایک شخص ٹھیک ان کے پیچھے تکبیر کہتا اور ابا کے اللہ اکبر کہتے ہی ہم سب نیت باندھ لیتے۔۔مجھے ابا کے پیچھے نماز پڑھنا اچھا لگتا تھا، اُن کی قرأت سے مانو دل میں ایک نور سا بھرتا چلا جاتا تھا۔جب ہم نماز پڑھ کر لوٹتے تو سورج نکلنے کو ہوتا۔ہلکے اجالے میں سڑکیں اور مکان وجود کا احساس کراتے نظر آنے لگتے۔۔لوگوں کی چہل پہل بڑھ جاتی۔ابا کلو حلوائی کی دوکان پر ٹھہر جاتے۔کلو حلوائی تہمند باندھے بڑے سے کڑھاؤ میں جلیبیاں تلتا ہوتا۔بہت ادب سے ابا کو سلام کرتا اور ایک ڈونے میں جلیبیاں باندھ کر ابا کو دیدیتا۔ساتھ ہی مجھ سے پوچھتا۔ شتو میاں جلیبیاں کھا تے رہا کرو دودھ میں بھگو کر۔دماغ روشن اور دل فراخ رہتا ہے۔ابا مسکراتے اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر کلو حلوائی کو تھمادیتے۔۔ابا کبھی کسی کا ادھار نہیں کرتے تھے۔۔ہم گھر آتے تو اماں ناشتہ تیار کر چکی ہوتیں۔جلیبیوں کا ڈونا لے کر ایک پیالے میں دودھ ڈال کر بھگوتیں اور پھر دستر خوان بچھا کر ناشتہ چن دیتیں۔اماں کے ہاتھ اور کوئی خاص بات تھی ،ناشتہ ہو یا کھانا، آج بھی اُن کے ہاتھ کا ذائقہ میرے ہونٹوں اور زبان پر جاگ اٹھتا ہے۔۔

پھر جو یاد کے نقوش اُبھرتے ہیں وہ ہمارے مکان کے ہیں۔کویلو پوش، اینٹ گارے سے بنا کچا مکان۔بارش میں

جس کی دیواریں سیڑھ سے بھیگ جاتی تھیں اور کویلوؤں سے بوندیں ٹپ ٹپ کے فرش کو گیلا کرتیں تو اماں کوئی بالٹی یا بھگونہ اسکے نیچے رکھ دیتیں اور جب بوندوں سے وہ برتن لبریز ہو جاتا تو نالی میں پانی خالی کر کے پھر رکھ دیتیں۔۔مکان ہمیشہ صاف رہتا۔۔بارش کا موسم ختم ہوتے ہی اماں بازار سے قلعی منگوا لیتیں، پرانے مٹکے میں رات کو پانی ڈال کر اسمیں قلعی بھگو دیتیں۔۔ مٹکے میں پانی کھد کتا اور اسمیں سے ہلکی اور کبھی تیز آنچ جیسی بھاپ نکلتی۔۔ مجھے وہ بھاپ بہت اچھی لگتی تھی۔۔جب پانی اور قلعی زیادہ کھد کتا تو میں سہم جاتا تھا۔۔سوچتا اس بے جان سی سفید مٹی میں اتنے عفریت کہا ں سے جمع ہو گئے جو آپس میں لڑتے جھگڑتے اور باہر نکلنے کو بے تاب ہوتے ہیں مگر نکل نہیں پاتے۔۔شاید کسی جادوگر نے اپنی جادوئی چھڑی سے انہیں اس میں قید کر دیا ہے۔صبح جب میں نماز پڑھ کر لوٹتا تو دل میں ایک جستجو ہوتی۔سب سے پہلے اس مٹکے کے پاس جاتا۔ڈرتے ڈرتے اس میں جھانک کر دیکھتا کہ مبادا کوئی عفریتی ہاتھ اچک کر مجھے پکڑ نہ لے۔۔میں اس میں دیکھتا اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ اب وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔ایک سفید نرم سی پرت مٹکے کے اوپر تک آجاتی۔۔شاید حالات سے ہار مان کر عفریت نے اپنی ساری درندگی کو اس جادوگر کے تابع کر دیا ہوگا اور یہ جا دوگر کوئی اور نہیں اماں ہوتیں۔وہ اس مٹکے میں سے قلعی کو ڈولچی میں نکالتیں اور کوچی سے دیواروں پر پھیرتی چلی جا تیں۔کچھ ہی دیر بعد میلی کچیلی دیواریں سفیدی سے چمکنے لگتی تھیں۔

وہ رات میرے اندر رہ رہ کر کروٹیں بدلتی ہے۔۔کبھی کوئی پل ہوتا ہے، کوئی لمحہ، کوئی گھڑی جو آپ کی زندگی کا رُخ بدل دیتا ہے۔آپ کی پوری شخصیت پر خصوصی شخصیت کا خول چڑھا دیتا ہے، آپ سے آپ کی شناخت چھین لیتا ہے اور آپ کسی آوارہ بگولے کی مانند کائنات کی اسمت فضاؤں میں اپنے آپکو کھوجتے رہتے ہیں مگر آپ کی آپ سے پہچان نہیں ہو پاتی۔

وہ رات بھی ایسی ہی رات تھی۔برسات شام سے ہی ہو رہی تھی۔رات کے کسی پہر میں پانی تھم گیا تھا۔۔میں اماں کے ساتھ اُن کے بستر سے ملحق دوسرے بستر پر سویا ہوا تھا۔۔اوپر کچھ کویلو ٹوٹ گئے تھے جہاں ابا نے ٹین کی چادر پھنسا کر لگا دی تھی۔اُس ٹین کی چادر پر پانی کی بوندیں جب گرتیں تو رات کی خاموشیاں اور سناٹے اپنی چیخ دبا نہیں پاتے ۔۔گلی میں ایک نیم کا درخت لگا تھا جسکی ٹہنیاں ہماری چھت کو چھوتی تھیں۔۔ہوا کے جھکڑ سے درخت کی ٹہنیاں ٹین کی چادر سے ٹکراتیں تو لگتا کوئی بھوت اپنے پنجے سے چادر کو کھرچ رہا ہے۔۔میں ڈر کر رضائی میں دبکا ہوا تھا کمرے میں لالٹین کی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔۔اس کمرے میں بھی کھڑکی تھی۔جو گلی کی طرف کھلتی تھی۔بوندوں کی ٹپ ٹپ اور درخت کی ٹہنیوں کی رگڑ سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔پھر مجھے لگا، کھڑکی کے دوسری جانب کوئی ہے۔میں نے خوف سے کھڑکی کو دیکھا مگر کھڑکی تو بند تھی۔۔میں منتظر رہا کہ شاید پھر کوئی آواز آئے مگر نہیں۔۔میں نے رضائی اوپر تک سرکالی ۔۔لمحہ بعد ہی پھر ایسا لگا، کوئی کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔میں نے رضائی ہٹا کر دیکھا۔کھڑکی کے پٹ ہلنے سے لگے۔۔میں نے بے خبر سوئی ہوئی اماں کو جھنجھوڑ دیا۔۔اماں اس افتاد سے ہڑبڑا کر جاگ اُٹھیں۔مجھے اپنے پلنگ کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا۔۔؟"

"وہ۔۔وہاں۔۔کھڑکی۔۔"

"کھڑکی؟۔۔کیا ہوا کھڑکی کو۔۔؟"

"کوئی ہے"۔

"نہیں بٹیا۔۔وہاں کون ہوگا؟۔۔ہوا چل رہی ہے نا۔۔اسی سے ہل گئی ہوگی"۔انہوں نے شفقت سے مجھے تسلی سی۔"سو جاؤ۔۔آؤ میں سلا دوں" وہ اپنے بستر سے نکلیں اور مجھے اپنے بستر پر لٹا کر رضائی اوڑھا دی اور تھپک تھپک کر سلا نے لگیں۔۔میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اماں مطمئن ہو کر اپنے بستر پر جا کے سو گئیں۔۔شاید کچھ ہی دیر گذری ہوگی کہ کھڑکی پر پھر کوئی آواز ہوئی۔۔میں نے چونک کر دیکھا۔۔یہ میرا وہم نہیں تھا۔کوئی تھا وہاں اور اُس نے کھڑکی کھول لی تھی۔۔میں نے لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا اسکے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا اور آنکھیں بہت خوفناک خون اگلتی ہوئی سی میں سارے جسم سے لرز اٹھا۔جلدی سے رضائی میں دبک گیا مگر تبھی کچھ ہوا۔اس کے ہاتھوں نے رضائی کھینچ کر دور پھینک دی تھی اور پھر۔۔وہ چیخ جو میرے حلق سے خارج ہوئی آج بھی میرے لاشعور میں اسی طرح زندہ ہے۔ایسی چیخ جیسے کسی بطخ کو کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو اور اسکے نرخرے سے قیں قیں کی آوازیں خارج ہو رہی ہوں۔۔میری چیخ سے اماں ہڑ بڑا کر اٹھی ہی تھیں کہ اس درندے کے ہاتھ نے اپنے چوڑے اور سخت پنجے سے میرا منہ دبا لیا۔۔چیخ اند رہی گھٹ کر رہ گئی آواز بند ہوگئی اور آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔۔میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا مگر اُس بے ہوشی کی حالت میں بھی جو آخری آواز میری سماعت نے قبول کی وہ اماں کی دلدوز چیخ تھی۔۔وہ چیختی ہوئی میری طرف دوڑی تھیں مگر اتنی دیر میں وہ مجھے اٹھائے ہوئے کھڑکی سے کود چکا تھا۔

آج دنیا کی گہما گہمی دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرا بچپن بہت محدود تھا گلی میں یا گھر سے باہر مجھے کھیلنے کی اجا زت نہیں تھی، مسجد، مکتب، اور پھر گھر ابا اپنے اصولوں کے بہت سخت اور ان پر کاربند رہنے والے انسان تھے۔جتنا پیار دیتے تھے، اتنی ہی کڑی نگاہ بھی رکھتے تھے۔مکتب کے علاوہ وہ مجھے گھر پر بھی سائنس، انگریزی اور دیگر ضروری اور نصابی مضامین پڑھاتے تھے۔ایک بار کسی دوست کو ابا سے کہتے سنا تھا کہ ابا بہت تعلیم یافتہ تھے۔یہ دوست کسی اور شہر میں رہتا تھا اور بہت اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ابا سے ملنے آیا تھا اور ان کا ہم مکتب رہا تھا۔تعلیم کے بعد وہ اعلیٰ سرکاری منصب تک پہونچ گیا تھا اور ابا صرف پیش امام بن کر رہ گئے تھے۔۔لمبی سی چم چماتی کار جب ہمارے دروازے پر ٹھہری اور اس میں سے ایک شاندار شخصیت سوٹ، پہنے برآمد ہوئی تو محلّے کے لوگوں کے ساتھ میں بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔میں تو اتنا مرعوب ہوا کہ سامنے آنے میں بھی جھجک ہوتی تھی مجھے۔۔ابا سے بہت محبت سے ملے تھے وہ اور ابا اماں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی تھی۔۔دستر خوان پر گفتگو کے دوران ہی یہ بات مجھے معلوم ہوئی تھی۔۔ان کو یہ کہتے بھی سنا تھا میں نے کہ ابا اگر چاہتے تو اسی کی طرح کوئی اچھی سی سرکاری نوکری پا سکتے تھے۔۔پھر ابا نے کیوں نہیں چاہا اُسی کی طرح بن جانا؟۔پھر ہمارے پاس بھی اس جیسی گاڑی ہوتی۔شاندار مکان ہوتا اور جب سوٹ پہن کر کار میں اسکول جاتا تو وہا

ں سب مجھ سے مرعوب رہتے لیکن نہیں۔۔آج جب مجھے یاد آتا ہے تو ابا کا وہ جملہ بھی یاد آتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست کی بات کے جواب میں کہا تھا''۔۔نہیں میاں مجھے مرعوب کرنے کے گُر نہیں آتے۔ہاں مرعوب ہونے کا فن ضرور سیکھ لیا ہے اپنے اعمال سے۔۔اپنے کردار سے اور اپنے اللہ سے۔''

یہ جملے آج بھی اُسی طرح میری سماعت میں جاگ اٹھتے ہیں جس طرح بہت پہلے ادا کئے گئے تھے جاتے وقت اس دوست نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مسکرا کے مجھ سے پوچھا تھا''کیوں صاحبزادے۔آپ بھی اپنے ابا کی طرح مولوی بنو گے؟''۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔دراصل میں سمجھا ہی نہیں تھا کہ مولوی ہونا کیوں کمتر ہوتا ہے کسی کے نزدیک؟میں بس انہیں دیکھ کر چپ ہو گیا تھا۔چلتے چلتے انہوں نے اپنا بٹوا جیب سے نکالا تھا۔۔اس بٹوے میں بہت سے نوٹ تھے۔اتنے سارے نوٹوں کا وہ کیا کرتا ہوگا؟ابا کے پاس تو کبھی دس روپیہ سے زیادہ میں نے دیکھے نہیں تھے۔۔اس دوست نے ایک نوٹ اس میں سے کھینچا اور میرے ہاتھ میں دینا چاہا۔۔میں نے ابا کی جانب دیکھا۔انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ لے لوں۔میں نے نوٹ لے لیا۔۔میرے پورے ہاتھ میں اس نوٹ نے سما جانے سے انکار کر دیا۔۔اتنا ہی بڑا نوٹ تھا۔۔پھر وہ دوست اپنی بڑی سی کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔میں نے نوٹ کی کئی تہیں کر کے ہتھیلی میں دبا لیا مگر تب بھی مجھے محسوس ہوتا رہا کہ وہ میری مٹھی سے نکل جانے کو بے تاب ہے۔۔اندر آ کر میں نے اپنی مٹھی اماں کی گود میں خالی کر دی اور ایک اطمینان کی سانس جیسے میرے اندر سے نکل کر میرے جسم کو سہلاتی گزر گئی ہو۔

''یہ۔۔یہ کیا ہے؟اماں کو بھی اتنی حیرت ہوئی جتنی مجھے ہوئی تھی۔۔

''جاتے جاتے شبو کو دے گیا ہے۔۔اب میں منع کرتا تو وہ مجھے۔خیر تم اسے خیرات کر دینا۔''ابا نے کہا اور اندر چلے گئے۔اماں ان کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتی تھیں۔پھر اس بڑے سے نوٹ کا کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔۔آج جب اپنے اوپر لٹتے ہوئے اس سے بھی بڑے نوٹ دیکھتا ہوں تو بھی مجھے ان کی اہمیت کا نہ تو اندازہ ہوتا ہے اور نہ کوئی احساس نہ قدر نہ قیمت۔

جس بے جا میں رکھے خواب جب آوازوں کی وحشت سے جاگے تو میں نے خود کو نوگرفت پرندے کی طرح سخت ہاتھ میں پھڑ پھڑاتا محسوس کیا۔اپنی ناسمجھ آنکھوں سے دیکھا۔وہ ایک مکان ہی تھا۔ہاں مکان،اسے گھر نہیں کہا جا سکتا تھا۔گھر جیسی کوئی خوبی ہی نہیں تھی اُس میں۔محض چار دیواروں اور پر چھت،اور دروازوں کو گھر تو نہیں کہہ سکتے۔میرے ناپختہ ذہن نے اسے گھر ماننے سے انکار کر دیا۔اس بڑے بے کمرے نما ہال میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جسے ضبط تحریر میں لایا جا سکے۔ہاں اگر کچھ تھا تو بے منظری کے عکس تھے۔شمشان جیسی بدحواس اداسی،چھت،دروازوں اور دیواروں سے لگی ہوئی تھی۔فرش پر رینگ رہی تھی۔ہوا اوپر کے بے رونق روشندان سے اندر گھس کر اپنا نوحہ گا رہی تھی۔

میں اُس بالوں بھرے کھردرے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔اس طرح کہ کبھی فرش کو اور آس پاس نگاہ گھما کر دیکھ سکتا تھا۔آنکھوں میں آنسوؤں کی کیچڑ تھی۔حواس خوف سے بے بس تڑپتے ہوئے۔برے جیسی انگلیاں میری کلائی کی نازک

جلد میں اندر تک گھسی جارہی تھیں۔ ایک ردی کاغذ کی طرح مروڑ کردہ سخت ہاتھ مجھے لٹکائے اپنے قوی الجثہ جسم کو فرش پر ٹکائے کھڑا تھا۔ درد چیخ بن کر ہونٹوں تک آتا مگر کوئی بھی آواز ڈر اور خوف سے سمٹ کر حلق ہی میں رک جاتی تھی۔

وہ سخت ہاتھ مجھے لٹکائے اس جگہ پہونچا جہاں فرش پر رکھی چوکی پر ایک موٹی عورت بیٹھی ہوئی شاید اپنی اوڑھنی کی پھٹی ہوئی جگہ میں سوئی سے ٹانکے لگا رہی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی اور سر کے بال برف جیسے سفید تھے۔ اُس ہاتھ نے مجھے چوکی کے نزدیک کھڑا کر دیا مگر اب بھی اس ہاتھ کی گرفت مجھ پر سے ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ بس فرق اتنا ہوا تھا کہ میری کلائی سے ہٹ کر وہ ہاتھ پیچھے سے میری گدی پکڑے ہوئے تھا۔ میرے اندر سے سکون کی متلاشی حرارت میرے دکھتے ہاتھ کی رگوں پر آ ٹھہری میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس ہاتھ کی کلائی کو سہلایا۔ سخت ہاتھ کی انگلیاں میری کلائی میں گہرائی تک اُتری صاف دکھائی دے رہی تھیں۔۔ میرے حلق سے سسکاری نکل گئی۔۔ ''اشرفی بائی۔'' پہلی بار مجھے اُسکی آواز سنائی دی۔ کرخت جیسے پتھر پر کند چھری کو تیز کیا جا رہا ہوتا کہ ذبح کیے جاتے وقت تکلیف نہ ہو۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھنا چاہا لیکن گرفت اتنی سخت تھی کہ میں صرف سامنے ہی دیکھ سکتا تھا۔ سیتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور آنکھیں عینک سے مخاطب کو دیکھنے لگیں۔ پہلے ناشناس سی پھر ان میں شناسائی کا احساس جاگا۔ بوڑھی عورت نے کہا۔ ''کون؟ ۔ گلاب خان؟ کدھر نکل آئے آج؟۔''

وہ اگر عورت تھی تو اس کی آواز میں لوچ نہیں تھا۔

گلاب خان۔ یہ نام بھی پہلی بار معلوم ہوا اور مجھے لگا یہ نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔

''تمہارے لئے نگینہ لایا ہوں۔''

''اے تو انگوٹھی میں جڑ کے پہن لو۔ یہاں کیوں لے آئے؟

''وہ نگینہ نہیں اشرفی بائی۔ زندہ، کمسن۔ دھلوٹ۔ تمہاری چمک بڑھا دے گا۔''

''اے پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ صاف صاف کہو۔''

''اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

ہاتھ نے مجھے آگے دھکا دے دیا۔ میں چوکی سے ٹکرایا اور رک گیا۔

''اے گلاب خان۔ یہ لونڈا کون ہے؟''

''یہی وہ نگینہ ہے اشرفی بائی''۔ میں نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ سیاہی مائل چہرہ۔ سر پر ٹوپی اور بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ ارے یہ تو ہمارے محلے کا ہی ہے۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ اور یہ آنکھیں؟ یہ تو وہی آنکھیں ہیں جو اس رات کھڑکی سے برآمد ہوئی تھیں۔ ڈھاٹے کے اوپر یہی آنکھیں تو کھڑکی سے کودی تھیں اور مجھے اٹھا کر کھڑکی سے فرار ہو گئی تھیں۔ میرے ننھے سے ذہن نے اس سے نفرت کا اظہار کر دیا۔

''اِسے کہاں سے اٹھا لائے گلاب خان؟۔''

''جتنا ہے تو سودا کر لو۔''

''لیکن ہے کس کا؟'' کون ذات کون برادری۔؟ اچھی نسل ہے کہ یونہی چالو۔؟'' ''اشرف کا نطفہ ہے۔۔یو ں بھی تمہاری برادری میں ذات پات کا کیا کام۔''؟

''ذات برادری نہ سہی نطفہ تو صحیح ہو۔ پر اِسے یہاں کیوں لے آئے؟'اسکے ماں باپ گھر یار کچھ ہے کہ نہیں۔'' بڑی بی نے ناک پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ میں یک ٹک کبھی اس بوڑھی کو اور کبھی گلاب خان کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔

''سب کچھ ہے۔ بھرا پورا گھر ہے۔''

''پھر؟۔''

''انتقام۔ بدلہ۔ اس بیٹے کے باپ سے بدلہ لینا ہے مجھے۔ اُسے جتا دینا چاہتا ہوں کہ گلاب خان سے بیر کرنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔۔ تم بولو کیا کہتی ہو۔''

''پہلے سچی بات بتاؤ گلاب خان۔ ہم ہجڑوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ساری بات جانے بنا۔۔''

''تم جاننا چاہتی ہو تو سنو۔'' وہ چوکی کی پٹی پر ٹک گیا۔ اب میں اُن دونوں کو بہت قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں بھوک سے اندھیرا چھاتا سا لگ رہا تھا۔ پر نہ جانے کونسا ضبط تھا جو مجھے سہارا دیئے ہوئے تھا۔۔''میں نے اپنی جورو کو چھوڑ دیا تھا۔ داری کو رہنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ مجھ سے بھی بہت زبان لڑاتی تھی۔ ڈانٹ کا مار کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جب ایک دن یار خاں کو غصہ آیا تو حرام زادی کو طلاق دے کے گھر سے نکال دیا۔ کچھ دن غصے میں نکل گئے پر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو مجھے اپنی غلطی کا پتہ چلا۔ اس کے بنا گھر سونا، بستر سونا ،چولہا سونا اور خود میں بھی سونا ہو گیا تھا۔ میں نے پھر سے اُسے گھر میں ڈالنا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ کہا پہلے مولوی سے پوچھ لے۔ شریعت کیا کہتی ہے۔ میں نے اس سالی کے باپ سے بات کی وہ مجھے مولوی کے پاس لے گیا۔ میں نے اس سے کہا میں اپنی جورو کو طلاق کے بعد پھر سے رکھ لوں تو کچھ ہرج ہے۔ اس حرام کے جنے مولوی نے ایک دُم چھلا لگا دیا۔ کہا جورو کا پہلے کسی سے اسکا نکاح پڑھواؤں وہ بھی اس کی مرضی سے۔ وہ ایک رات اس کا ہم بستر رہے۔ پھر وہ طلاق دے۔ عدت پوری کرلے تب وہ مجھ پر حلال ہو گی۔ میں جھلا گیا۔ اپنی عورت کو پہلے کسی کے آگے ڈالوں اور پھر اس کا جھوٹا چاٹوں قسم قرآن کی یہ پٹھان سے نہ ہو سکے گا۔ میں نے مولوی سے آسان راستہ پوچھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اس سے فتویٰ مانگا۔ کہا دنیا کو دکھانے کے ئے جھوٹا فتویٰ دیدے۔ اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ بھلا تم ہی بتاؤ۔ ہم اتنے گناہ کرتے ہیں تو کیا فتویٰ لگا کے کرتے ہیں؟ گناہ تو گناہ ہے چاہے پوچھ کے کرو چاہے بنا پوچھے۔''

''بس اتنی سی بات پر تم نے اس مولوی کے بیٹے کو چرا لیا''۔؟

''اتنی سی بات ہوتی تو ٹال دیتا گلاب خان۔'' اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر نفرت سے کہا۔''اس نے پورے علاقے میں اعلان کرا دیا کہ شریعت کیا کہتی ہے۔ مجھے بدنام کر دیا اس نے۔ میں نہ اپنی جورو کو پا سکا اور نہ آبرو بچا سکا۔ وہ حرامی ملا سمجھتا کیا ہے اپنے کو۔ خنزیر کا نطفہ۔۔ اب دیکھوں اپنے بیٹے کے لئے وہ کونسا فتویٰ لگاتا ہے۔ کونسی شرع کی گردان

کرتا ہے۔"

"تم چاہتے ہو، اسے ہم اپنی برادری میں شامل کرلیں؟۔"

"صرف شامل نہیں، اِسے پکا خسرا بنا ڈالو۔"

"اے تم پگلا گئے ہو گلاب خان؟۔ اللہ رسول کو بیچ میں رکھو۔ تمہیں ان کا بھی خوف نہیں ہے کیا"

"میرے دل سے سارے ڈر نکل گئے۔۔ تم رکھتی ہو اِسے یا کسی اور کو سونپ دوں؟۔"

"بات چھپی نہیں رہے گی۔"

"میں چاہتا بھی یہی ہوں، بات چھپی نہ رہے۔ جگ اجاگر ہو۔ پتہ تو چلے، مولوی کا نطفہ مولوی ہی نہیں بنتا، ہیجڑا بھی بن سکتا ہے۔"

"مجھے تو خوف آتا ہے، اللہ جانے، کتنا معصوم سا ہے"

"ہمدردی نہ جتاؤ۔ جلدی کہو، نہیں تو دوسری ٹولی میں دے آؤں۔"

"تم اِسے کچھ اور بھی تو بنا سکتے ہو گلاب خان۔"؟

"کچھ اور کیا۔"؟

"چور، ڈاکو۔ قاتل رہزن۔ آوارہ بدمعاش۔ کچھ بھی۔ ہیجڑا ہی کیوں بنانا چاہتے ہو۔"؟

"ہاہاہاہا۔" بہت بھیانک ہنسی تھی اس کی۔ میں ڈر سے اور بھی سہم گیا۔" بنا تو سب کچھ سکتا ہوں وہ سب بننے سے سماج، دنیا اور لوگ اس سے نفرت کر سکتے ہیں۔ شرم نہیں۔ یہ ہیجڑا بنے گا گھاگھرا چولی پہن کے جب سڑکوں پر نکلے گا تو اس کا خاندان ہی نہیں، پاس پڑوس بھی شرم کے احساس سے گڑ جائیں گے۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔"

"نہیں گلاب خان۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"ڈرتی ہو اشرفی بائی۔ کہیں ہتھکڑی نہ لگ جائے۔"

"عزت کسے پیاری نہیں ہوتی۔ رپٹ ہوئی اور یہاں سے برآمد ہوا تو تھانہ کچہری تو ہوگا ہی۔۔ کیا پتہ جیل بھی ہو جائے۔"

"اب تک تو ایسا ہوا نہیں ہے۔"

"اے کیا مطلب ہے تمہارا؟۔"

"رقیہ، کملا، روزی، کلثوم کی اصلیت میں کیا جانتا نہیں۔۔ وہ بھی تو کسی کے گھر سے ہی آئے تھے۔ اسی کی طرح معصوم، بھولے بھالے اور اب دیکھو۔ انہیں خصی بھی تو تم ہی نے کیا تھا۔ انہیں حرفوں کا بنانے میں تمہاری ہی تو چتورائی تھی۔ بھلا کوئی آیا تھا پوچھ گچھ کرنے؟۔"

"وہ بات اور تھی۔ تب ٹھسہ تھا۔ اُٹھتے جوبن کی بہار تھی۔"

"اور اب؟۔"

"ڈھلتی دوپہر یا ہے۔"

"تب تجربہ کم تھا۔اب تو تجربہ بھی ہے اور بچاؤ کے طریقے بھی بہت ہیں"۔

"پھر بھی۔"

"نہیں اشرفی بائی۔گلاب خان ایک بات کہتا ہے تو نانہیں سنتا۔تم انکار کردگی تو یہ چھوکرا تو بنے گا ہی ہیجڑا مگر تمہارے کرتوت بھی سب پر ظاہر ہو جائیں گے۔" اشرفی بائی ایک دم بھڑک اٹھی وہ اتنی پھرتی سے چوکی سے اُتری کہ میں حیران رہ گیا۔تالی بجا کر گلاب خان کے چہرے کے آگے انگلی نچا کر بولا۔

"اے ہمیں اپنی پہ مجبور مت کرو گلاب خان۔ہم پٹھانی پہ آگئے تو تمہاری ساری پٹھانی پچھواڑے سے ہوا ہو جائے گی۔یہ دھمکی اُسے دینا جو تمہارا دبیل ہو۔واہ رے واہ۔ہم پر رعب ڈالنے آیا ہے۔موا بساندہ کبوتر۔تجھ جیسے چھتیسوں کو نو رنگ میں رنگ کے چھوڑ دیا۔اب گھر گھر تالی پھٹکارتے اور لہنگا ہلاتے پھرتے ہیں۔تو ہے کس گنتی شمار میں؟۔"

"ارے سنو تو اشرفی بائی۔میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ خوشامد کرنے لگا۔میں اس عجیب وغریب صورت حال کو مُسمسی شکل لئے دیکھ رہا تھا۔کون لوگ تھے یہ؟ کس دنیا کے باشندے تھے؟۔میرے گھر میں تو کبھی ایسا کوئی ہوا نہیں۔ہائے میرے ابا۔میری اماں۔میری آنکھیں فرطِ غم سے چھلک اٹھیں۔مگر رونے کا بھی یارا نہ تھا۔چاہا چپ کے سے بھاگ جاؤں مگر کہاں؟۔یہ تو ایک چھلانگ میں مجھے دبوچ لے گا۔ڈرا سہا ان کی مہابھارت دیکھتا رہا۔

"کبھی کبھی تم سے دل لگی اچھی لگتی ہے۔تم تو ناراض ہو جاتی ہو"۔

"مذاق۔دل لگی۔اے ہم نے دل لگی کی نہیں ہے ابھی۔جب کرلی تو گھاگھرے چولی میں دُم ڈھونڈتے پھرو گے۔گلاب خان سے گلاب جان بن کر کولہے مٹکاتے پھرو گے۔"

"بس بس۔میں چلتا ہوں۔تمہیں یہ لڑکا نہیں جچتا تو کوئی بات نہیں۔رادھا،نصیب یا ثریا کوئی بھی سودا کرلے گی۔میں نے جو دل میں ٹھانی ہے اُسے پورا کر کے رہوں گا۔اس شہر میں نہ ہوگا تو اور بہتیرے شہر ہیں۔کوئی بھی لے لیگا۔"

گلاب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔اشرفی بائی کو مڑ کر میں نے دیکھا۔وہ ہمیں ہی دیکھ رہی تھی۔پھر وہ آگے بڑھی اور میرا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔

"ٹھہرو گلاب خان اسے چھوڑ جاؤ۔"

"تو تم تیار ہو؟۔"

"ہاں۔کیا قیمت مانگتے ہو؟۔"

"اتنی کہ جب میں دوبارہ آؤں تو اسکے چہرے سے مرد کا یہ خول اُتر جائے اور یہ تمہارے ہی جیسا مجھے ملے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔اب تم جاؤ۔اور سنو گلاب خان۔اب کبھی پلٹ کر نہ آنا اِدھر۔"

"ایک بار ضرور آؤں گا۔اپنے بدلے کی آنچ کو ٹھنڈا کرنے۔"

اُس نے قہقہہ لگایا۔میرے گال کو چٹکی سے مسلا اور چلا گیا۔

اشرفی بائی میرے پاس آئی۔ مسکرا کے مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کے چوکی پر بٹھالیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ میں نے سہم کر اسے دیکھا۔ ایک عجیب سا تحیّر آمیز خوف میری آنکھوں میں شاید اس نے دیکھ لیا۔

''ڈرو نہیں بیٹا۔ یہاں تم محفوظ ہو۔'' اس نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟۔''

''شبو۔''

''شبو۔ پڑھتے ہو؟

''ہاں۔ الف، ب، ت، ث، اور اے، بی، سی، ڈی۔''

''اور۔۔''

''نماز۔ قرآن شریف۔ ابا کہتے ہیں نماز پڑھنے سے شیطان پاس نہیں آتا۔''

''اور کون ہے تمہارے گھر میں؟۔''

''ابا اور اماں۔ ایک بکری اور اسکا بچہ ہے۔ ابھی چار دن کا ہوا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟۔''

''مسجد کے پاس۔ بڑی سی گلی میں۔''

''کونسا شہر ہے؟۔''

''شہر؟۔۔''

''ہاں۔ جہاں تم رہتے ہو۔''

''بہت بڑا ہے۔ مسجد ہے۔ بازار ہے۔ کلو حلوائی کی دوکان ہے۔ اور ہاں تانگے بھی چلتے ہیں وہاں۔''

''تمہارے ابا کا نام کیا ہے۔''

''امام صاحب۔''

''اور کچھ نہیں؟۔''

''اور ابا۔ میں تو ابا بلاتا ہوں۔ سب امام صاحب کہتے ہیں۔ اماں شبو کے ابا کہتی ہیں۔''

''اُف رے نصیب۔ بیٹے۔ تم میرے پاس رہو گے؟۔''

''کیوں؟۔ تم کون ہو؟۔ میں تو اماں کے پاس سوتا ہوں۔''

''میں۔ میں تمہاری اماں کی بھی اماں ہوں۔ انہوں نے ہی تو تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔''

''تم۔ تم ہماری نانی ہو؟۔''

''ہاں ہاں۔ نانی۔ نانی ہوں تمہاری۔''

''مگر اماں نے تو کبھی بتایا نہیں۔ان کی بھی اماں ہیں۔''

''ہاں۔وہ بیٹے۔میں بہت دور رہتی ہوں نا۔اسلئے۔اسی لئے نہیں بتایا ہوگا۔''

''مگر انہوں نے تمہارے پاس کیوں بھیج دیا؟''

''وہ۔وہاں پولس کا ڈر تھا۔پولس تمہیں نہ لے جائے اس لئے میرے پاس بھجدیا۔''

''پولس؟'' مجھے پولس کے نام سے خوف آتا تھا۔جب اور چھوٹا تھا اور کوئی شرارت کرتا تھا تو اماں مجھے پولس سے ڈراتی تھیں۔

''مگر۔وہ تو مجھے بستر سے اٹھالایا۔وہ برا آدمی ہے۔دیکھو اس نے کتنی زور سے میرا ہاتھ پکڑا تھا'' میں نے ہاتھ کی کلائی اس کے آگے کر دی۔سفید جلد پر سرخ لکیریں اب بھی اُبھری ہوئی تھیں۔میری آنکھیں پھر بھر آئیں۔اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، روئی جیسا ملایم ہاتھ۔مجھے بہت راحت ملی۔

''شبو بیٹا۔آج سے تم میرے پاس رہو گے۔''

''مگر اماں۔اماں کے بنا مجھے نیند نہیں آئے گی۔''

میں تمہیں بہت سی کہانیاں سناؤں گی۔اچھی اچھی۔''

''میری اماں تو مُصلّی باندھتی ہیں نانی۔'' میرے ذہن نے نہ جانے کیوں اسے نانی مان لیا

''نماز بھی پڑھتی ہیں۔مگر تم۔تم نماز پڑھتی ہو؟۔''

''ہاں۔۔''

''اچھا تو مصلی باندھ کے دکھاؤ۔''

''یہ لو'' اُس نے اوڑھنی سے سر پر آڑا ترچھا مصلّی لپیٹ لیا۔''

''ایسے نہیں۔'' میں نے اس کا مصلّی درست کیا شاید۔کسی حد تک اور کھل کھلا کر ہنس پڑا وہ مجھے ہنستا دیکھ کر خوش ہو گئی۔فرط جذبات سے میرا سر اس نے اپنے سینے سے لگالیا ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی

میں آج بھی اس بو کو کوئی نام نہیں دے سکا۔وہ بو میرے نتھنوں میں بار بار زندہ ہو اٹھتی ہے۔۔اسکے جسم کی بو میری اماں کے بدن کی خوشبو سے جدا تھی۔ایک دم الگ۔میں نے گھبرا کے سر اٹھالیا۔اس کی چھاتی سے میرا چہرہ الگ ہوگیا۔

''نانی۔مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اوہ۔۔میرے بچے۔میں تو بھول ہی گئی تھی۔اس جنم جلے نے تجھے کچھ کھلایا بھی نہ ہوگا۔'' وہ بے حد اپنائیت سے بولی۔یہاں وہ میری ماں لگی۔اس نے آواز دے کر بلایا کسی کو۔''اری اٹھنی۔او اٹھنی۔ذرا ادھر آئیو۔''

اور پل بھر میں ہی تین چار ''جسم'' اندر سے نکل کر آگئے۔میں انہیں ''جسم'' ہی کہوں گا۔کیونکہ تب میں کچھ جانتا ہی نہ تھا ایسے ''جسموں'' کو کیا بلاتے ہیں۔

''ارے۔یہ چوزا کہاں سے آگیا؟'' سب سے آگے جو نوجوان جسم تھا، اس نے ہنس کر پوچھا'' لگتا ہے، زیادہ گر

می سے کوئی انڈا اچٹک گیا ہے۔'' دوسرے نے فقرا کسا۔

''کیوں موسی۔ کہاں سے آگیا یہ؟''

''تازہ تازہ۔''

''چپ رہو۔ ہر وقت کی لتریا چلتی اچھی نہیں لگتی۔ اب یہ یہیں رہے گا۔''

''یہیں رہے گا؟۔''

''تو کیا یہ بھی؟۔''

''نہیں۔ میں اِسے اپنے رنگ میں نہ ڈھالوں گی۔ پڑھاؤں گی۔ اچھی تعلیم دوں گی آدمی کا بچہ ہے، آدمی ہی رہے گا۔''

''تم کون ہو؟۔'' میں نے اچانک پوچھا۔

''ارے ہمیں نہیں جانتے؟۔ یہ ایشوریہ اور میں کاجول اور وہ مادھوری۔'' تینوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ مجھے ان کی ہنس اچھی لگی۔

''ایشوریہ کاجول اور مادھوری کو جانتے ہو؟۔''

''تم جو ہو۔'' میں نے تپاک سے کہا۔

''ارے واہ۔ دیکھا۔ پہچان لیا نا۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟۔''

''شبو نام ہے اس کا۔''

''شبو۔ میں تو اِسے۔۔۔''

''رے بس کرو۔ اپنی لتریا کو قابو میں رکھو۔'' اشرفی بائی جھڑک کر بولی۔

''یہ شریف ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ موا گلاب خان نہ جانے کہاں سے اڑالایا ہے کہتا تھا۔ بدلہ لینے کے لئے اِسے ہیجڑا بنانا ہے۔

''ہائے۔ موسی، یہ بے چارہ بھی۔''

''چلو۔ اپنے بڑھاپے کا سہارا تو بنے گا۔''

''اے بس رہنے دو۔ ابھی تو بھرا جو بن ہے، ابھی سے بڑھاپا تو یاد نہ دلاؤ۔'' دوسرا جسم چمک کر بولا

''کسی گھر کا ہے موسی۔ کچھ پتا کیا۔''

''جس گھر کا بھی ہے، وہاں صرف نماز روزہ اور دین کا چلن ہے۔ دنیا کہاں تک ہے اسے کچھ نہیں معلوم۔ باپ امام ہے۔ ماں گرہستن۔ پڑھائی لکھائی مسجد کے مکتب تک اب ایسے نیک بخت انسان کی اولاد کو میں ہیجڑا بناؤں؟۔ نا بابا۔ مجھے تو خوف آتا ہے۔ اپنی عاقبت تو کچھ ہے ہی نہیں۔ جو خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ پر دل، ضمیر کیسے گوارا کرے؟۔''

''موسی۔ تو تم نے کیوں لے لیا؟۔''

"نہ لیتی تو کسی اور کو دے آتا۔ پھر کون جانے یہ کیا بنتا کیا نہیں۔ میں نے اسی ڈر سے اپنے پاس رکھ لیا۔ کوشش کرنا اپنا کام ہے۔ آگے جو اس کے نصیب ہوں۔"

"تو تم کیا کرو گی موسی؟" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ شاید ایسا میں نے سمجھا۔

"ماسٹر لگا دوں گی۔ پڑھے گا تو اچھے بھلے کی تمیز آئے گی۔ اپنا بھلا برا خود سمجھ لے گا ہماری دنیا۔ ہماری برادری کچھ بھی سہی پر اچھے گھر کے چراغ کو بجھانا ہم تو کفر سمجھتے ہیں۔ اچھا سنو اٹھنی۔ اسے لے جاؤ۔ حلوائی کی دوکان سے دودھ جلیبی منگا کے اسے کھلا دو۔"

"دودھ جلیبی کا سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری نانی ہی تھی۔ وہ تینوں مجھے اندر لے گئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا ان کے نام اٹھنی، اکنی، اور چونی تھے۔ میرے معصوم ذہن نے سوچا۔ یہ تو روپے کے حصے ہوتے تھے۔ پھر یہ نام کیسے ہو گئے کسی کے؟

اور پھر میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک عجیب وغریب دور۔ ایسا دور جس میں کوئی روشن امکان نہیں تھا۔ ترقی نہیں تھی۔ مستقبل نہیں تھا۔ صرف تنزل تھا۔ جسم کا تنزل۔ جسم کے تقاضوں کا تنزل۔ سوچ وفکر اور خواہشات کا تنزل۔ ایک گھٹن بھرا ماحول تھا جو ایک بڑے سے مکان میں بھر دیا گیا تھا۔ اس ماحول میں بہت سے چہرے تھے جو لگتے تو مردانہ تھے مگر انہیں نسوانی جسم دیدیا گیا تھا۔ گویا اندر کی پرت مردانہ اور بیرونی پرت نسوانی۔ آوازوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ نسوانی نازکی کے استعمال کے انداز نے ان آوازوں کی نرمیاں چھین کر کرخت بنا دیا تھا۔ اب نہ وہ سننے میں بھلی لگتی تھی اور نہ دلکش۔ پکی عمروں کے جسم بے ڈول اور بھدے تھے جن پر گھا گھرا چولی، ساڑی شلوار ایسے ہی لگتے تھے جیسے کن ہی اُن گھڑ مٹکوں کو رنگین کپڑوں سے ڈھک دیا گیا ہوتا کہ وہ گرمی کی تپش سے اور موسم کے اثر سے محفوظ رہیں۔ ہاں کبھی جب اس مکان میں باہر سے مہمان آتے ان میں بہت سے نوخیز چہرے بھی ہوتے۔ دیدہ زیب اور پر کشش۔

اشرفی بائی میرے لئے بہت مہربان تھی۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی تھی، پر اتجربہ بھی بڑھ رہا تھا اب میں سمجھنے لگا تھا کہ جس باڑے میں مجھے چھوڑ دیا گیا تھا اس میں سارے جسم میری طرح نہیں تھے۔ جسموں کی پہچان مجھے ہوتی جارہی تھی۔ یہ جسم تھے تو مرد مگر خود کو عورت میں شمار کرتے تھے۔

اشرفی بائی نے میرے لئے ایک ماسٹر لگا دیا تھا۔ صبح وہ آتا۔ انگریزی، اردو۔ تاریخ اور دوسری تعلیم دیتا اور گھنٹہ بھر بعد چلا جاتا۔ مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ بہت سی آنکھیں میری نگرانی کرتی تھیں۔ بس اگر بیرونی دروازے کی طرف قدم بھی بڑھاتا تو ان دیکھے ہاتھ نہ جانے کن دیواروں سے نکل کر مجھے روک لیتے۔ یوں بھی میں گھر میں رہنے کا عادی تھا۔ اس لئے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا یہاں سارا دن میں گھر میں رہتا۔ اٹھنی دوانی اکنی اور چونی سب گاتے بجاتے۔ ہنسی مذاق کھانے پکاتے اور نہ جانے کیا کیا کرتے۔ مجھے اُن کا ناچنا گانا اچھا لگتا۔ یہ میرے لئے ایک الگ اور انوکھا تجربہ تھا۔ بے حد دل چسپ۔ بے حد تحیر خیز۔

اٹھنی اور چونی کو رقص سکھانے ایک استاد آتا تھا۔ کچھ عجیب سا۔ بڑے بڑے بال تیل سے چمکتے اور کنگھی کیے ہوئے ململ کا کُرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنتا تھا۔ چال میں زنانہ پن مگر ایک مسکراہٹ ہمیشہ اسکے ہونٹوں پر رہتی تھی۔ جب وہ لہرا کر چلتا اور رقص کے بھاؤ بتاتا تو مجھے بہت دل چسپ لگتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں جلد ہی اس ماحول سے اوب گیا۔ اماں بہت یاد آتیں۔ ابا یاد آتے۔ بکری اور اس کا بچہ یاد آتا تو میں دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس گھٹن بھرے موحول میں جینے پر مجبور تھا۔ وہ استاد جب نانی سوئی ہوئی ہوتیں یا گھر میں نہ ہوتیں تو مجھے پکڑ کر میرے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیتا اور اٹھنی چونی تالی بجا کر مجھے ناچنے پر مجبور کرتی رہتیں۔ میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ اور مجھے ناچ پر مجبور کرتے۔

میں تو کسی اور ہی ماحول کا پرندہ تھا جسے اُس گھناؤنی، کریہہ آمیز اور نفرت انگیز دنیا میں قید کر دیا گیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔

دو سال میری تعلیم کا سلسلہ چلا۔ مجھے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ اس طرح اندر رہتے ہوئے بھی مجھے بیرونی دنیا کو جاننے کا موقع ملتا تھا۔ جب میں پڑھتا تو ایک عجیب طمانیت کا احساس اپنے اندر محسوس کرتا۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا مگر یہ سلسلہ اچانک اس وقت موقوف ہو گیا جب اشرفی بائی ایک رات گذر گئی۔ وہ رات میری زندگی کی بہت کربناک رات تھی۔ ایک مہربان نگاہ قدرت نے مجھ پر سے ہٹالی تھی۔۔ دو مہربان ہاتھ میرے شانوں سے پھسل گئے تھے محبت اور شفقت سے لبریز لہجہ ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ رات اور اس کے بعد کی رات اور اسکے بھی بعد کی رات۔ سب خاموش۔ لب سلے ہوئے نہ گریہ وزاری۔ نہ رسمِ ماتم۔ باہر کا موسم سنا یہ گیا کہ اسی طرح خوشگوار تھا لیکن اندر کے ماحول میں بھی ایک چپ عود کر آئی تھی۔ دھیرے دھیرے آس پاس کے ساتھی آنا شروع ہو گئے۔ پتہ نہیں ان کی مواصلات کا ذریعہ کیا تھا؟۔ دو دو چار چار کی ٹولی میں آتے۔ اشرفی بائی کے مردے کا دیدار کرتے اور سب کے پاس بیٹھ جاتے۔ تین دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ جو بھی آتا کھانا لے کر آتا اور پھر سب کے ساتھ کھایا جاتا۔ گھر میں چولہا نہیں جلایا گیا۔ باہر کے چائے والے کو دروازے سے ہی ٹال دیا جاتا۔ اور پھر وہ تیسری رات تھی۔ میری زندگی کے معصوم تجربے کی بے خوفناک رات۔ وہ رات میرے سینے میں اس طرح بیٹھ گئی کہ آج بھی جب اسکا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ رسوئی سے ملحق کوٹھری میں بہت بڑا گڑھا کھودا گیا۔ اس طرح کہ کوئی آواز نہیں کوئی حرکت نہیں کہ پڑوسی کی دیوار بھی انجان رہی۔ جب گڑھا تیار ہو گیا تو اشرفی بائی کے مردے کو نئی ساڑی پہنائی گئی۔ بالوں میں تیل ڈال کر سنوارا گیا۔ چہرے پر غازہ، آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر لالی لگائی گئی۔ گلاب کے کچھ پھول (جو نہ جانے کہاں سے آگئے تھے) گڑھے میں بچھادئے گئے اور مردے کو اس میں لٹا دیا گیا۔ پھر اسے مٹی سے بھر کر اس طرح برابر کر دیا گیا کہ لگے یہاں کوئی واردات نہیں ہوئی یہ کیسا جنازہ تھا جسے نہ غسل دیا گیا۔ نہ نماز پڑھی گئی اور نہ چار کاندھے نصیب ہوئے۔

مجھے یاد ہے جب میرے چچا کا انتقال ہوا تھا تو میں ابا اور اماں کے ساتھ گیا تھا۔ سارا گھر، کیسا نورانی ہو گیا تھا۔ تلاوت کی گئی تھی۔ سب باوضو تھے۔ سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ عورتیں جمع ہو کر پڑھ رہی تھیں۔ مرد باہری حصے میں چچا کو غسل دے رہے تھے۔ غسل کے بعد انہیں کورا سفید کفن پہنایا گیا۔ تابوت میں لٹا دیا گیا ایسے کہ ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ پھر کلمے

کا ورد کرتے ہوئے لوگ کاندھا بدل کر قبرستان لے گئے پھر ایک مسجد لے سامنے جنازہ رکھا گیا۔ ابا نے نماز جنازہ پڑھی اور قبرستان لے جا کر انہیں دفن کر دیا گیا۔ قبر پر باری باری تین تین مٹھی مٹی ڈالی گئی۔ دعا پڑھتے ہوئے پھر فاتحہ ہوئی اور سب لوٹ آئے وہ ساری رسمیں مجھے یاد تھیں مگر یہ کیسا ماحول تھا جہاں نہ کوئی مذہب تھا نہ دھرم۔ کون کس مذہب کا تھا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا صرف نام سے ہی اس کے مذہب کی شناخت ہو سکتی تھی۔ رادھا، کملا ہوں تو ہندو، روزی ،لینا ہوں تو عیسائی اور رقیہ، کلثوم ہوں تو مسلمان۔ ہولی، عید، دیوالی، دسہرہ، اور محرم سب مل جل کر مناتے۔ ان تہواروں پر خوب دھوم ہوتی تھی۔ خاص طور سے محرم بہت ہی اہتمام سے منایا جاتا تھا۔

اشرفی بائی کے بعد برادری کا ہی کوئی اور کھیا بنا دیا گیا مگر وہ کہیں اور رہتا تھا۔ یہاں تو سب اپنی اپنی پر تھے۔ ماسٹر کا پڑھانا بند ہوا اور مجھے برادری کی رسموں سے رہن سہن سے آگاہ کیا جانے لگا۔ طور طریقے سکھائے جانے لگے۔

وقت کا کیا ہے، پروں میں ہوا بھر کر اڑتا رہا اور میں اپنی صلیب اٹھائے اپنے مقتل کی جانب بڑھتا رہا۔ عمر کی پکڑ کب ڈھیلی ہوئی پتہ ہی نہیں چلا۔ بچپن کے نقوش ذہن سے مٹتے چلے گئے۔۔ نئے ماحول کے رنگریز نے مجھے اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔

جب ہم کسی کو قاتل مان لیتے ہیں تو اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ وہ ہمیں کس طریقے سے قتل کرے گا۔ وقت بھی ایسا ہی قاتل ہے۔ اسکے آگے ہاتھ باندھ کر ڈال دیا اور وہ مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرتا رہا مگر میری آنکھوں سے وہ کھڑکی اوجھل نہیں ہو پائی جس نے مجھے اس قتل گاہ تک پہونچا دیا تھا۔

میرا نام رکھنے کی بھی ایک رسم ادا کی گئی۔ سب جمع ہوئے برادری کی نئی کھیا بھی آئی۔ کھانے پکائے گئے اور اشرفی بائی کی قایم مقام نے میرے جسم سے قمیض پاجامہ اتار کر مجھے گھاگھرا چولی پہنا دیا سر پر زری کا ڈوپٹہ ڈال دیا گیا۔ ناک اور کانوں کی لوئیں چھید کر ان میں نازک سی چاندی کی بالیاں پہنا دی گئیں اور اسکے بعد میرے بال کبھی تراشے نہیں گئے ۔عمر کے ساتھ جسم کے اعضا بھی تبدیلی قبول کرتے گئے۔ بال بڑھ کر شانوں سے نیچے اور پھر کمر تک پہونچ گئے۔ اب میں ایک انتہائی نازک اندام اور انتہائی نوخیز جسم تھا جو زنانہ اور مردانہ سرحد پر ہی ٹھہرا دیا گیا تھا۔ ایک جسم تھا محض جس میں گوشت، دل، سینہ جگر دماغ آنکھیں ہاتھ پاؤں کان خون اور ان سب کو آپس میں جوڑتی رگیں۔ میں ایک اکائی تھا اور اُس اکائی کا نام رکھ دیا گیا تھا شبو کی مناسبت سے شبنم مگر شبو جیسا وقار اس نام میں نہیں تھا۔ شبنم اس شبو کی ساری نمی پی گئی تھی۔ اس رات خوب جشن بپا رہا۔ ڈھولک بجتی رہی۔ گھنگھرو باندھ کر پیر تھرکتے رہے۔ اور میرے جیون کی وناش لیلا وقت کے خنجر تلے خونی منظر اگلتی رہی اور پھر اچانک رات کے اس پہر میں وہ کھڑکی اچانک پھر کھل گئی۔ وہی آنکھیں پھر روشن ہو گئیں اور وہ مکروہ اور کراہیت آمیز چہرہ اس جشن میں اُگ آیا۔ میں پورے بدن سے کانپ اٹھا

"واہ۔ تو شبو میاں شبنم بن ہی گئے۔ کیوں رے پٹھے۔ کیسا لگا یہ روپ۔ یہ رنگ۔ آہاہا۔ بہت مزہ آیا تجھے دیکھ کر۔"

اُس نے میرے سجے سنورے وجود کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس کی وہ ہنسی میرے چہرے پر سلگ اٹھی۔

"آؤ گلاب خان۔ ادھر آ جاؤ۔" کھیا نے اپنے قریب جگہ دے دی۔

''میں نے سنا آج اسکی چولی ڈھیلی ہورہی ہے، سوچا ر اس سے اچھا موقع اور کون ہوگا؟۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ۔مزہ ہی مزہ۔ واہ رے مولا تو بھی بدلے کے کیسے کیسے طریقے سوجھاتا ہے۔ ارے ہاں۔ رادھا بائی۔ آج اسکا کوئی ٹھمکا ،کوئی چھنک مٹک تو دکھادو۔ پتہ تو چلے اس میں ہیجڑاپن کتنا سمایا۔''

رادھا بائی۔ تو اس مکھیا کا نام رادھائی بائی ہے۔ اس کے اشارہ کرتے ہی سب مؤدب ہو گئے اور رادھا نے مجھے کہا ۔''چل موڑی۔ ذرا دکھا دے اپنی کلا۔ یہ پرکھی ہیں کلا کے۔ نچھاور کر دینگے تجھ پر۔۔ آجا بیٹی۔''

میں نے منہ کھول کر اس سیلن زدہ محفل میں سانس لی جیسے کوئی مچھلی پانی سے جدا ہو کر اپنے پھیپھڑوں میں سانس بھرتی ہے۔ پھر میں نے پیروں میں گھنگرو باندھ لئے اس عرصہ میں استاد نے بہت کچھ سکھادیا تھا۔ رقص کے لئے کھڑا ہو گیا اور کب تک میں نے رقص کیا اور کیا کیا نخروں کے غمزے دکھائے، اُف یاد نہ آئے تو اچھا ہے۔

گلاب خان مبہوت ہو گیا۔ اس نے جیب سے بڑی سی نوٹوں کی گڈی نکالی اور سارے نوٹ مجھ پر نچھاور کر دئے۔

''آج مجھے تسکین ملی۔ بن گیا سالا مولوی کا نطفہ ہیجڑا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ دروازے کے نزدیک پہونچا تو میں بھی تیزی سے اس کے قریب پہونچ گیا۔ سب نوٹ چننے اور شمار کرنے میں مصروف تھے۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

''گلاب خان۔'' اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

''تم نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اور خوب لیا۔ بس مجھے اتنا بتا دو میرے ابا۔ میری اماں۔'' میری آواز حلق میں ہی گھٹ گئی فرط جذبات سے حلق میں پھندا پڑ گیا تھا۔ وہ ہنسا وہی مکروہ ہنسی

''تیری اماں تو گذر گئی۔ رہا تیرا مولوی باپ تو مسجد میں پڑا رہتا ہے۔ اللہ اللہ کرتا ہے اور اپنی موت کی طلب کرتا ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا۔ بتا دیا تھا کہ تیرا بیٹا ہیجڑا بن چکا ہے۔ مگر اس نے یقین نہیں کیا۔''

میں کچھ بول نہیں سکا۔ کیسا وار کیا تھا ظالم وقت کے اس ظالم ہاتھ نے۔ کاش میں نے کچھ نہ پوچھا ہوتا۔ ایک امید تو تھی۔ ایک آس تو تھی۔ اب وہ آس بھی دم توڑ گئی۔ میں بے جان سا اپنے وجود کو نہ سنبھال پایا۔ پیروں نے جواب دیدیا اور میں وہیں دھم سے گر گیا۔

''اور سن۔ تیرا باپ ابھی زندہ ہے۔ اُسی شہر میں۔ جانتا ہے نا کونسا شہر؟۔ تو سن۔ مہران پور۔ سمجھ گیا نا؟۔ میں نے تیرے باپ کو یقین نہیں دلایا اس لئے کہ ایک دن وہ خود دیکھ لے کہ تو کیا تھا اور کیا بن گیا۔''

گلاب خان نے آخری چرکہ لگایا اور چلا گیا۔ مگر اس آخری چرکے میں بھی میری حیات پوشیدہ تھی۔ یہ آس تھی کہ میرے ابا زندہ ہیں اور اس شہر کا نام مہران پور ہے۔ مہران پور۔ میری اماں کی آخری آرامگاہ۔

میرے ابا کا دیار !

پھر یہ ہوا کہ شبنم ساری برادری کی جان بن گئی۔ آواز میں لوچ، انداز میں غمزے رقص میں بے ساختگی۔ ہر محفل کو دیوانہ بناتی چلی گئی۔ یہ ابتداء تھی اس انتہا کی جس سے میرا وجود فی الحال انجانا تھا۔ میں بھول چکا تھا اپنی اس ہستی کو جس

نے ایک دین دار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ میں بھول چکا تھا اس آغوش کو جسکی مہربان گرمی نے میرے ننھے سے وجود کو زندگی کی حرارت دی تھی۔ میں فراموش کر چکا تھا ان ہاتھوں کو جن کی انگلی تھام کر میرے بچپن نے پہلا قدم زمین پر رکھا تھا مگر سچ تو یہ تھا کہ میں کچھ بھی نہیں بھول سکا تھا۔

کیوں ہوتا ہے ایسا کہ ہم پیدا ہوتے ہیں کہیں، پرورش کہیں پاتے ہیں اور ہماری تربیت کن ہی اور ہاتھوں میں کسی اور ہی ماحول میں ہوتی ہے۔ دن ہفتے مہینے اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ نہ جانے کتنے موسم گذر گئے ۔میرے چہرے کی نوخیزی نے بدائی لی لیکن اس سے پہلے کہ میرے چہرے کے مسام مردانگی کا نقوش ابھارتے، رات کو میرے چہرے پر خاص قسم کا لیپ کردیا جاتا۔ شاید کوئی بلیچ کریم آنکھیں اور پیشانی کو چھوڑ کر۔ یہ عمل کئی دنوں تک ہوتا اور جب یہ موقوف ہوتا تو میرے چہرے کی نوخیزیت پھر عود کر آتی اور اس دفعہ کچھ زیادہ ہی شباب کے ساتھ۔ انتہائی نسوانی چہرہ جس کے نقوش ایسے کہ چٹکی بھر دو تو چٹکی میں آبلہ پڑ جائے۔ لیکن شاید یہی میرا ٹھہراؤ تھا۔ عروج اور زوال کا درمیانی ٹھہراؤ میں اپنے اندر کے احساس کو کبھی قتل نہیں کرسکا آنکھ چرانا ایک الگ عمل ہے اور آنکھ موند کر حالات سے سمجھوتہ کرلینا۔ ایک الگ عمل۔

رادھا بائی بھی چل بسی اور پھر آ گیا ایک نئے مکھیا کے انتخاب کا موقع۔ اور یہ موقع قدرت نے مجھے دیدیا۔ اس بار یہ تقریب مہران پور ہی ہونا طے کیا گیا مہران پور۔ ایک شہر ہوتا ہے۔ گاؤں دیہات قصبہ۔ جو بھی ہو جہاں آپ پیدا ہوتے ہیں۔ عمر کے موسم گذارتے ہیں۔ چاہے طویل عرصہ اُس میں بسر نہ کیا ہو مگر کبھی آپ واپس آتے ہیں تو وہ شہر آپ کو مانوس لگتا ہے، وہ آپ کو بھولتا نہیں ہے۔ اس کی ہواؤں میں آپ کی سانسوں کی ریشمی سرسراہٹ گھلی ہوتی ہے۔ اس کی فضاؤں میں آپ کے بدن کی مہک رچی بسی ہوتی ہے، اس کی مٹی آپ کے پیروں کے لمس کو پہچانتی ہے۔ مگر شاید آپ پرائے ہو چکے ہوتے ہیں۔

اُن چہروں کی بھیڑ میں آپ کا چہرہ انجان ہو چکا ہوتا ہے، جن چہروں سے آپ نے اپنے وجود کے رشتے قایم کئے ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کل تک جو آپ کا سب کچھ تھا بدلتے ادوار نے آپ سے دور کر دیا ہوتا ہے۔ غیر کر دیا ہوتا ہے شناخت کھودی ہوتی ہے آپ کی اپنی۔

منظر وہی تھے لیکن شاید میری بے چہرگی نے ان مناظر کو زمردی شعاعوں سے محروم کر دیا تھا۔ عمر کے رت جگوں نے سارے موسموں کی تعبیریں بدل دی تھیں۔ سڑکیں گلیاں مکان بازار مسجدیں منادر سب ویسے ہی تھے تو ان سب شناساؤں کے درمیان میں کہاں تھا؟۔ شاید کہیں نہیں تھا۔ یہ شہر تو ایک سراب کی مانند لگ رہا ہے مجھے۔ جتنا اس کے قریب جاتا ہوں، فاصلہ بڑھ جاتا ہے، پھر اس فاصلے کو ناپنے کی کوشش کرتا ہوں، دوری کم نہیں ہوتی۔ پیر تھک جاتے ہیں، حوصلہ بے امان ہو جاتا ہے لگن ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔ روح جسم کے اندر کرب سے چیخ اٹھتی ہے اور وہ چیخ جسم کے مساموں سے دھواں بن کر خارج ہوتی ہے اور ساری فضا پر غبار بن کر چھا جاتی ہے مگر اس شہر کی حیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ دوڑتا بھاگتا رہتا ہے اور میں، اکیلا، تنہا، بے امان گلی گلی سڑک سڑک بھٹکتا رہتا ہوں۔ ایک تلاش

کی طلب ہے میری آنکھوں کو۔ میری شناخت، میری پہچان یہیں کہیں کسی گلی کے اندر موجود ہے۔ کسی مکان میں میرا تعا رف پوشیدہ ہے۔ جس کی چھت کویلو پوش ہے۔ جس کی دیواریں مٹی اور گارے سے بنی ہیں۔ ایک دروازہ ہے۔ جس کے پٹوں پر نیلا رنگ کیا ہوا ہے۔ امن اور مسکراہٹوں کا رنگ۔ خلوص اور دوستی کا رنگ۔ اس دروازے پر ایک تختی جڑی ہے جس پر اردو میں میرے ابا کا نام لکھا ہے۔

حافظ اور قاری ۔۔۔۔۔ اور اُس دروازے کے عقب میں ٹاٹ کا پردا ہے۔ اندر صحن ہے۔ جس میں موگرا گلاب اور چمبیلی کے پودے فاصلے فاصلے سے کیاریوں میں اُگے ہیں۔ مغربی سمت میں غسل خانہ ہے اور اس سے ملحق بیت الخلا ہ جس کے دروازے پر بڑا سا تانبے کا لوٹا پانی سے لبریز رکھا رہتا ہے۔ صحن کچا ہے۔ پھر دالان ہے۔ جس پر تین محرابوں کی دیوار ہے اور اس دالان میں تخت پر اماں اپنی مشین پر کپڑوں کی سلائی کرتی ہیں۔ نماز پڑھتی ہیں۔ اور وقت ہونے پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا ہے۔ پھر دو کمرے ہیں۔ ایک ابا کا اور دوسرا اماں کا۔ امان کے کمرے کی دیوار کے ساتھ گلی ہے۔ جس میں نیم کا درخت ہے اور جب ہوا چلتی ہے تو کئی ٹہنیاں چھت پر جڑی ٹین کی چادر پر ردم بجاتی ہیں اور اس دیوار میں ایک کھڑکی بھی ہے

وہ خونی کھڑکی جس نے میرا بچپن مجھ سے چھین لیا۔ وہ کھڑکی جس نے مجھ سے میرا گھر میری اماں اور میرے سب سے اچھے ابا کو چھین لیا۔ کاش اُس دیوار میں وہ کھڑکی نہ ہوتی، وہ گلی بھی نہ ہوتی تو آج میں وہ نہ ہوتا جو بنا دیا گیا ہوں کتنی روئی ہوں گی اماں کتنی راتیں کتنے دن اور عمر کے کتنے ماہ و سال انہوں نے عذابوں میں گذارے ہوں گے مگر نہیں۔ گلاب خان تو کہتا تھا، اماں میرے غم میں جلد ہی چل بسی تھیں۔

تو پھر ان کی قبر کہاں ہوگی؟۔ مجھے تو ان کے قبر کا نشان بھی نہیں معلوم۔ اور میرے ابا؟۔ وہ تو کتنے نیک تھے۔ کیا قصور تھا اُن کا؟ صرف اتنا کہ شریعت اور احکام خداوندی کے خلاف نہ گئے؟

میں گلی گلی جھانک رہا ہوں مگر مجھے وہ مکان نہیں مل رہا ہے۔ وہ مسجد بھی نہیں مل رہی ہے جہاں ابا مجھے لے جاتے تھے نماز کے لئے۔ کلو حلوائی کی دوکان بھی نہیں مل رہی ہے۔ کس سے پوچھوں؟ مجھے

تو محلے کا نام بھی نہیں معلوم۔ مجھے تو ابا کا نام بھی نہیں معلوم اور مجھے تو خود اپنا نام بھی نہیں معلوم اب تو میں وہی ہوں جو بن چکا ہوں۔ وہی نام یاد ہے جو مجھے دیدیا گیا اور جس نام کی دھوم آج اس شہر میں مچی ہوئی ہے۔ جسکے رقص کا چرچا، جسکے ہاؤ بھاؤ اور نخروں کا چرچا مہران پور میں ہر زبان پر ہے۔

ہمیں اس شہر مہران پور میں آئے ہوئے چودہ واں دن ہے۔ ایک بہت بڑا میدان ہے جہاں شامیانے لگا کر بچھات کر دی گئی ہے۔ اس بچھات پر قانات لگا کر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کچھ خاص، اہم اور سینیر خسرے ان حصوں میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ دو میک اپ روم بھی ہیں جہاں ہم اپنا اپنا میک اپ کرتے ہیں بھڑ کیلے لباس پہنتے ہیں اور پھر تیار ہو کر روز سویرے "بزرگوں" کے سلام کو ان کے سامنے مؤدبانہ حاضریاں دیتے ہیں وہ "بزرگ" ہمیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پرکھتے ہیں۔ خامیاں نکالتے ہیں۔ تعریف بھی کرتے ہیں۔ کوئی خوبی نظر آتی ہے تو دعا

ئیں دیتے ہیں۔

''ترقی'' پانے کی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم نو عمر ''لڑکی بالیاں'' اپنی اپنی ٹولی بنا کر ہنسی ٹھٹھا مذاق ٹھٹھولی کرتی ہیں نئے نئے عامیانہ فلمی گیتوں پر اپنے ناچ کی پریکٹس کرتی ہیں تا کہ رات کو جب مجرا ہو تو ہمیں کوئی کھسیانہ کہے

بڑے بڑے دیگوں میں شامیانے کے باہر کھانے پکائے جاتے ہیں اور پھر بڑے بڑے تھالوں میں کھانا ''پروسا جاتا ہے۔ سب ان تھالوں کے ارد گرد ٹولیاں بنا کر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کسی کو کسی کھانے سے کوئی پرہیز نہیں ہے۔ ''بزرگوں'' کو اُن کے حسب مراتب کھلایا جاتا ہے

یہ برادری کا سالانہ جشن ہے جو اس شہر مہران پور میں منعقد کیا گیا ہے اس جشن میں ملک کے سب سے بڑے خلیفہ یا مکھیا کا انتخاب ہوتا ہے۔ اسی لئے ملک کے کونے کونے سے ہزاروں خسرے شریک ہونے آئے ہوئے ہیں

آج چودہ دن پورے ہو گئے۔ کلش یاترا نکل چکی اور شہر کے سب سے بڑے بزرگ شاہ عالی بابا کے مزار پر چادر بھی چڑھائی جا چکی ہے۔

پندرھویں یں شب ہے۔ چاند آسمان پر پوری طرح کھلا ہوا ہے اور اسکی جادوگری کی دھیمی دھیمی کرشمائی کرنیں چاروں طرف سبک اور نرم اجالا کر رہی ہیں۔ آج سارا مہران پور ہی اُمڈ آیا ہے اس جگہ ہر نگاہ آج منتظر ہے اس لحہ کی جب مجرے کا آغاز ہوگا۔ ہر آنکھ، کسی منظر کی طالب ہے۔ آج میرا مجرا ہے دو دن سے اعلان کیا جا تا رہا ہے۔ میرے شباب کے چرچے عام ہیں۔

میرے مجرے کی دھوم مچی ہوئی ہے اور منچلے بے تاب ہیں میرا مجرا سننے کے۔ مجھے دیکھنے کے۔۔

آج ہی صبح خلیفہ کا انتخاب عمل میں آچکا ہے۔ عجیب مرعوب کن منظر رہا وہ بھی۔ انتخاب ہوا اور مہران پور کے بزرگ خسرے کو خلیفہ چن لیا گیا۔ تمام بزرگ خسروں نے اسے بڑی سی مسند پر بٹھایا۔ سات ''سہاگن'' خسروں نے (جن کی ناک میں بلاق، مانگ میں سندور اور جسم پر بنارسی ساڑیاں اور ہاتھوں میں مہندی اور سہاگ کی چوڑیاں تھیں) خلیفہ کی نظر اتاری، بلائیں لیں۔ سہاگ گایا۔ اور پھر اس جشن میں شریک ہزاروں خسروں نے ایک بنارسی ساڑی ایک سونے کی انگوٹھی خلیفہ کو نذر کی۔ اب جشن ختم ہونے کے بعد خلیفہ ہر خسرے کو اپنی جانب سے اس نذر سے الگ مگر اس سے زیادہ نذرانے دے کر رخصت کرے گا اور دعائیں دے گا، جاؤ بیبیو گھر سدھارو۔ سہاگن رہو، سہاگن بنو اور سہاگن ہی کوچ کرو۔

رونق بڑھتی جا رہی ہے لوگ جوق در جوق چاروں طرف مجمع لگائے کھڑے ہیں پولس کی بڑی تعداد اس مجمع کو کنٹرول کر رہی ہے۔ بہت بڑی سی جگہ درمیان میں چھوٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف سازندے بیٹھے ہیں۔ اُن کے نزدیک گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے شاندار قالین پر خلیفہ نصیبن بی بی بیٹھی ہیں اور دیگر بزرگ خسرے ہیں۔ پھر دوسری پکی عمر کی، کچی عمر کی اور نئی عمر کی لڑکیاں بالیاں بنارسی، کامدانی، زری اور ٹشو کی جھلملاتی ساڑیاں اور اُن پر سونے کے

زیورات سے لدی پھندی بیٹھی ہیں۔ چہروں پر نئے فیشن کا غازہ اور بالوں میں گجرے ہیں۔ کچھ ایک نے جینس اور تنگ بلاؤز بھی پہنا ہوا ہے۔

میرے جسم پر سبز اور میرون کلر کی تنگ چولی اور گھیر دار پیش واز ہے جس پر لہریے پڑے ہیں اور ہر لہر پر ستارے اور گوٹے کے نازک تاروں کا کام کیا ہوا ہے۔ سرخ رنگ کا آبی ڈوپٹہ سر پر ہے جسے کسی ماہر کاریگر نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ یہ ڈوپٹہ میرے پورے چہرے کو چھپائے ہوئے ہے اس طرح کہ میں سب کو دیکھوں اور کوئی میرا چہرہ نہ دیکھ پائے دو کم سن خسرے دونوں طرف سے تھامے ہوئے مجھے لائے اور عین درمیان میں بیٹھا کر اپنی جگہ چلے گئے۔ مجمع میں ہلچل ہوئی۔ سیٹیاں بجیں۔ فقرے کسے گئے۔ مگر مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے میری نظریں مجمع کے ایک ایک چہرے کو دیکھ رہی ہیں۔ جائزہ لے رہی ہیں کہ شاید ان چہروں میں کوئی ایسا چہرہ نظر آ جائے جس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوں۔ چہرے پر تازہ دفن کئے ہوئے۔ جنازے کا غم ہو جسم سے اٹھتی خوشبو نہیں کافور کی مہک ہو۔

مگر سارے چہرے ایک ہی تاثر لئے ہوئے تھے۔ شوق کا۔ مزے کا نئے ذائقے کے احساس کا اور اوباش عامیانہ مذاق کا تاثر۔

ڈھولک کھنکی۔ ہارمونیم نے سُر ابھارے اور گھنگھروؤں کی چھنک سے سارا ماحول جیسے مدہوش ہو اٹھا۔ ہارمونیم پر کوئی پھڑکتا ہوا سا فلمی گیت ہے۔ مگر اس دھن سے میرے اندر کوئی ہلچل نہیں ہوتی۔ کوئی امنگ نہیں جاگتی۔ کوئی تھرکن پیدا نہیں ہوتی۔ آج اور آج سے بھی پہلے کئی دن گلی گلی سڑک سڑک کی مسافت نے میرے پیروں میں تھکن بھر دی ہے۔ میرے بدن سے ساری شوخی ساری شرارت چاٹ لی ہے اس شہر کی طلب نے کل تک جو پاؤں معمولی دھن پر تھرک اٹھتے تھے آج اپنی ہی توانائی سے ڈر گئے ہیں۔ ہارمونیم دھن پر دھن بدل رہا ہے۔ لوگوں سے زیادہ برادری میں بے چینی بڑھ رہی ہے میرے چہرے پر اسی طرح گھونگھٹ ہے اور جسم بے حرکت۔ بہت دیر گذر گئی۔ ثریا نے مجھے ٹوکا۔ ''اری کیا ہو گیا تجھے؟۔ کیا پالا کھا گئی۔ لیکن کوئی اثر نہیں ہو۔ شاید پھر بزرگوں کو بھی میری خاموشی ناگوار گذری۔ ایک نے تیز سرگوشی میں تنبیہ کی۔ ''اری شروع کر موڑی۔ ساری خلقت جمع ہے۔

رسوا کرے گی کیا؟۔'' اور رسوا کے لفظ نے گویا تازیانے کا کام کیا ہاں رسوا۔ اس شہر نے ہی تو مجھے رسوا کیا ہے مگر میں اس شہر کو رسوا نہیں کروں گا۔ اس شہر نے تو اندر سے میری ساری نمی چوس لی ہے۔

ایک خول رہ گیا۔ جو دکھائی دیتا ہے۔ اُسی خول کا دیدار کرو میں نے ایک ہاتھ سے گھونگھٹ اٹھایا۔ شاید کوئی بجلی چمکی جو دیکھنے والوں کے حواس پر سیدھے جا کے گری۔ ہائے ہائے۔ مار ڈالا۔ کیا جلوہ ہے۔

کیسی دھلوٹ ہے کے نعرے چاروں طرف گونج اٹھے۔ میں نے سازندوں کو ساز بدلنے کا اشارہ کیا۔ سارنگی نے سُر چھیڑا۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ ڈھولک نے کھنک پیدا کی اور میرے پیروں میں جیسے بجلی بھر گئی۔ میں نے گیت کے بول اٹھائے۔ شہر اور ماحول اور اپنی رسوائی کی مناسبت سے۔ ہر بول اپنا رنگ بول گیا۔ میں نے کب تک گایا۔ کب تک رقص کیا مجھے یاد نہیں۔ ہاں اپنی زندگی کا وہ بہترین رقص کیا میں نے۔

بار بار فرمائش ہوتی رہی اور میں ناچتا رہا مگر کیا واقعی وہ میں ہی تھا؟۔ کیا واقعی وہ میرا ہی جسم تھا؟۔ کیا واقعی وہ میرے ہی پیر تھے جو جانماز سے اُٹھا کر رقص گاہ میں رکھدیئے گئے تھے؟۔ کیا واقعی

وہ میرا ہی اندازِ رقص تھا؟

''شاید۔۔ ہاں

''یا شاید۔۔۔ نہیں

آج پھر اس شہر کی سڑکوں پر ہوں جو کبھی میرا اپنا تھا۔ میرے جسم پر آج برادری کا روایتی لباس نہیں ہے۔ چہرے پر میک اپ بھی نہیں ہے۔ آنکھوں میں سرے کی لکیر بھی نہیں ڈالی ہے میں نے۔

بالوں کی چوٹی نہیں گوندھی، بس انہیں الٹ کر پیچھے کی طرف چھوڑ دیا ہے۔ فٹ پاتھ سے پنٹ شرٹ خرید کر پہن لی ہے۔ آج میری شکل شاید اس شہر کے لئے شناسا ثابت ہو جائے کوئی کھڑکی کھلے اور میرا نام پکارے۔ مگر نہیں کھڑکیوں کو تو بند ہی رہنا چاہئے۔ وہ کھلتی ہیں تو تقدیروں پر سیاہی اُتر آتی ہے۔ اجاڑ شب کی عریاں بسری جاگ اٹھتی ہے۔ چشم وقت کا عذاب وجود پر آتش تحریریں چھوڑ جاتا ہے۔ پیشانیاں سجدوں کے نشان سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جگ کا رنگریز جسموں سے شناخت کھرچ کر بے رنگ نام کی تشدید لگا دیتا ہے۔ نہیں کھڑکیاں بند ہی رہنے دو۔ انہیں کھولنا نہیں

اور پھر جب پیر تھک گئے اور اپنی پہچان کا کوئی نشان نہیں ملا تو میں اُس بنچ پر آکر بیٹھ گیا جو شہر کے وسط میں تالاب کے کنارے چھوٹے سے خوشنما باغیچے میں ڈالی ہوئی ہیں تا کہ ان سنگی بنچوں پر بیٹھ کر تالاب کے پانیوں میں اٹھتی بجتی متی لہروں کا لطف اٹھایا جا سکے۔ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا پر کشش منظر آنکھوں میں حرارت، تازگی اور حلاوت پیدا کر سکے۔ مگر مجھے ان مناظر سے کیا دلچسی؟ میرے اندر تو راگ گاتا سمندر خاموشیاں سمیٹے دور کہیں پانیوں میں اُتر گیا ہے۔ صرف سناٹا چھوڑ گیا ہے رشتوں کے درد کی چبھن میرے اندر گونجتی ہوئی سی لگنے لگتی ہے۔ میں تو ان زرد پتوں کی طرح ہو گیا ہوں جو درخت کی شاخ سے گرتے ہیں، پانی میں بھیگ کر جنہیں ہوا سمیٹ کر کسی درخت کی یا کسی دیوار کی جڑوں میں اکٹھا کر دیتی ہے جہاں وہ اپنی بے آبروئی، بے بسی اور ناقدری کے ستون پر زندگی کی شکست کا پرچم لہراتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔

اچانک میں نے محسوس کیا۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ مڑ کر دیکھا۔ چند پاؤں بنچ کے نزدیک آٹھہرے ہیں۔ ان پیروں کے اوپر چند اوباش اور منچلے چہرے ہیں جو میرا جائزہ لے رہے ہیں۔ خالی خالی۔ ہر جذبے سے عاری نظریں مگر نہیں اُن نگاہوں میں تو شناسائی ہے۔ ایک آواز ابھری۔ ان میں سے ہی شاید کسی نے فقرہ کسا۔'' ارے۔ یہ تو وہی ہے ۔ ماں قسم وہی۔''

'' ارے ہاں۔ رات کو کیا غضب ناچا ہے باپ، کیوں جان اکیلی ہو؟۔'' دوسرا بولا ہاں میں اکیلا ہوں۔ تنہا۔ اپنی ذات کی تلاش ہے مجھے۔ اپنی شناخت کی طلب ہے مجھے۔ اُس کھڑکی کی کھوج ہے مجھے جو کھلی نہ رہ گئی ہو۔ اس کھڑکی نے میرے بچپن کی معصومیت، لڑکپن کی نوخیزی اور جوانی کے تلاطم کو چوس لیا ہے۔

میں نے ان کے جملوں کا برا نہیں مانا ہے۔ زمانے اور حالات نے جو مجھے بنا دیا ہے اسی سے تو پہچانیں گے وہ مجھے ۔میں وہاں سے اٹھ گیا ہوں انہوں نے میرا پیچھا نہیں کیا۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اب کیا رہ گیا ہے اس شہر میں؟ کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں تو پھر۔ مجھے لوٹ جانا ہے وہیں جہاں مجھے بو دیا گیا ہے۔ اگا دیا گیا ہے شاید آپ نے اُن چینی عورتوں کو دیکھا ہوگا جن کے پیروں کو بچپن میں ہی آہنی جوتوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور جب وہ بڑھتی ہیں تو عمر سے ان کے پیر مطابقت نہیں رکھتے یا آپ نے اُن بچوں کو دیکھا ہوگا جنہیں ماں کی کوکھ میں قدرت پورا انسان بنا کر ہی پروان چڑھاتی ہے مگر کسی منت کے زیر اثر ان بچوں کو پیدا ہونے کے بعد مزار پر دان کر دیا جاتا ہے جہاں اُن کے سروں کو آہنی خولی سے ایک خاص وقت کے لئے ڈھک دیا جاتا ہے تا کہ اُن کے دماغ محدود رہیں۔ فکر سے سوچ سے اور ہر باہوش انسان کے ادراک سے پھر وہ بڑے ہو کر پھدکتے پھرتے ہیں اور لوگ عقیدت سے انہیں میاں جی کے چوہے کہتے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا اُن قد آور پیپل برگد آم اشوکا اور یوکلپٹس کے درختوں کو جن کو زمین کی کشادگی ملتی ہے تو کیسے اونچائی تک پہونچ کر چاروں طرف پھیل جاتے ہیں اُن کی چوٹیوں کو دیکھنے کے لئے چہرے کو بہت اونچا اٹھانا پڑتا ہے ۔دیکھنے والے کی آنکھوں میں مرعوبیت آجاتی ہے لیکن۔۔

لیکن ان اونچے اور قد آور درختوں کی نسل کو آپ نے بنگلوں کی انیکسی میں نرسری میں یا پھر کسی ٹری فلاور ایگزی بیشن میں دیکھا ہوگا۔ یہ نسل بون زائی کہلاتی ہے۔ ان مرعوب کن درختوں کی برہنہ شاخ کو نمک، پتھریلی مٹی، راکھ اور کچھ کیمیکل کے آمیزے گملے میں بھر کر ٹوم دیا جاتا ہے تا کہ اُن کے قد مختصر ہو جائیں اور اس گملے کی حد میں ہی محدود رہیں۔

میری خواہشات، امنگوں، آرزؤں، مردانہ وجاہتوں جوانی کی تلاطم خیز ٹہنوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ میرے وجود کی برہنہ شاخ کو پتھریلی مٹی، نمک، راکھ اور کیمیل کے آمیزے میں بو دیا گیا ہے

آج اُس کھڑکی نے مجھے بون زائی میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں اب ایک بون زائی ہوں۔۔

طوفان کے بعد

اُس کی آنکھ طوفان کی گرج کے ساتھ ہی کھلی تھی۔ کچھ لمحے وہ غنودگی میں آوازوں کا تعین کرتا رہا اور پھر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ چراغ کی لو جھلملا رہی تھی اور جھونپڑی تیز ہواؤں اور بادلوں کی گرج سے یوں لرز رہی تھی کہ مانو ہوا اُسے اُڑا لے جائے گی! رکما نے اُٹھ کر چراغ کی لو درست کی اور اُسے محفوظ جگہ رکھ دیا تا کہ وہ بجھ نہ جائے۔ چراغ کی لو سے دیوار پر ٹنگی تصویر بھی لو دے اٹھی۔ رکما نے اپنی مرحوم بیوی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ بہت پہلے بھاگونتی نا معلوم بیماری سے زندگی تیاگ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ تب سنتا اور سرجا چھوٹے ہی تھے۔ سرجا سنتا سے دو سال ڈھائی مہینے بڑا تھا۔ رُکما کھیتی ہر مزدور تھا۔ جو کچھ ملتا اس سے اپنا اور اپنے دونوں بیٹوں کا پیٹ پالتا۔ روکھی سوکھی کھا کر رات کی تاریکی کو اوڑھ کر باپ بیٹے سو رہتے اور پھر سویرا ہوتے ہی رُکما مزدوری کے لئے نکل جاتا اور دونوں بیٹے کھیت کھلیان ندی نالے ایک کرتے رہتے۔ تعلیم کا تو دور دور تک تصور ہی نہیں تھا۔ بستی شہر جاتی سڑک سے بھی کوسوں دور دریا کے کنارے آباد تھی۔ کچھ زمین کے مالک اور زیادہ اُن زمینوں پر کام کرنے والے غریب کسان۔ بوائی، ندائی جتائی اور پھر کٹائی۔۔ سینکڑوں من غلہ زمین کے مالکوں کے گودام میں چلا جاتا اور مٹھی مٹھی غلہ، چند روپے اور کبھی کبھی مالکوں کی اُترن اِن غریبوں کے ننگے تن ڈھانپنے کو مل جاتی تھی۔ اوپری جسم تو ہمیشہ ننگا ہی رہتا تھا۔ بس ستر پوشی کے لئے ایک چادر کافی ہوتی تھی۔ پاؤں تو مٹی، کیچڑ اور کانٹوں سے بھری دھرتی پر چلنے کے اسقدر عادی ہو چکے تھے کہ اب اگر انہیں جوتا چپل دی جاتی تو وہ اُسے سونگھ کر اور منہ بنا کے پرے ڈال دیتے۔ بس زندگی انہیں ڈھروں پر بیت رہی تھی۔ سرجا اور سنتا بھی بڑے ہوئے اور جوان ہو کر باپ کے ساتھ کھیتی ہر مزدور نہیں بنے بلکہ دریا کا سینہ چیرنے لگے۔ انہوں نے مچھیروں کے ساتھ مچھلی پکڑنے کا پیشہ اختیار کر لیا تو رُکما بھی ان کا ساتھ دینے لگا۔ تینوں باپ بیٹے اپنی ناؤ لے کر منہ اندھیرے دریا کے پانیوں پر نکل جاتے پھر شام ہوتے ہی لوٹتے۔ کبھی کبھی کئی کئی دن انہیں دریا میں رہنا پڑتا پر جب لوٹتے تو مچھلیوں کا ڈھیر ان کی ناؤ میں لگا ہوتا تھا۔

رکما نے بیوی کی تصویر کو دیکھا اور اُسے محسوس ہوا جیسے بھاگونتی کے ہونٹ ہلے ہوں اور اُن ہونٹوں نے کچھ کہا ہو۔ بھاگونتی رکما کی تنہائی کی آج بھی ساتھی تھی۔ آج بھی وہ جب ہر روز شام کو اسکی تصویر کے آگے چراغ روشن کرتا اور جنگلی پھول کی دو کلیاں اسکے سامنے رکھتا تو تصویر اُسے مسکرا کر دیکھتی اور کبھی کبھی سرگوشی میں اسکا نام بھی لیتی۔ نہیں، اُسے ایسا محسوس ہوتا۔ زندہ رہی تب تک تو اُس نے کبھی اپنے شوہر کا نام نہیں لیا۔ پھر اُسے کیوں لگتا جیسے بھاگونتی کی تصویر کے ہونٹ لرزے ہوں اور اُن سے رُکما کا نام ادا ہوا ہو۔ آج بھی بھاگونتی کی تصویر اُس سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ شکوے بھی تھے اور کچھ سوال بھی۔ ہاں تصویر کے دھندلے پڑے رنگوں میں یہ سب واضح طور پر رکما محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے اُس نے تصویر کو دیکھا۔ طوفان کی گھن گرج سے جھونپڑی پھر کانپ اُٹھی۔ اور اُس نے شکوہ کرتی بھاگونتی کی تصویر پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ انگلیوں میں لرزش تھی۔ کسی جذبے کے تحت۔۔ اُسے یاد آیا۔ کچھ سال قبل ایسا ہی طوفان آیا تھا۔ ایسی ہی گھن گرج تھی۔ لگتا تھا زمین کو آسمان نگل جائے گا اور ساری زمین پانی پانی ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے گی!

''بھاگونتی۔۔'' رُکما کی آواز اُبھری۔ ''تو تو جیون کی ناؤ منجدھار کے بیچ ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ تُو کیا جانے میں نے اس

ٹوٹی ناؤ کو کتنے جتن کر کے پار لگایا ہے۔ جیون کا سارا رس انگلیوں کی پوروں سے پسینہ بن کر بہہ نکلا۔ ہر آس، ہر اُمنگ کچے دھاگے کی طرح توڑ دینی پڑی۔ صرف ایک خواب پورا کرنے کے لئے۔ ہاں بھاگونتی تیرے بیٹوں کو بڑا کرنے کا خواب اور تو نے دیکھ لیا تیرے بیٹوں کو جوان کرتے کرتے میں بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ وقت نے کتنے ہی دھبے اس بدن پر چھوڑ دیئے۔ پر بھاگونتی یہ بوڑھا مچھیرا جس نے طوفانوں کا منہ موڑ دیا۔ جس نے بپھری ہوئی موجوں کو اپنے حوصلوں سے پست کر دیا۔ سے اور ہونی سے ہار گیا۔ ہاں بھاگونتی۔۔ ہاں تیرا ایک بیٹا، میرا سرجا۔۔ اُف ! وہ بھی آج ہی کی طرح اماوس کی کالی سیاہ رات تھی اور ایسا ہی طوفان ہماری بستی کو نگلنے اپنے پیروں میں موت کے اژدہے لپیٹے گھس آیا تھا۔ تب تیرا بیٹا سرجا اُن معصوم بچوں، عورتوں اور معذوروں کو بچانے نکل گیا تھا جو بستی چھوڑ کر نہیں جا سکے تھے۔ ہاں۔ چودھری آیا تھا اور سرجا نے اُسکی آواز پر لبیک کہا تھا۔ مجھے یاد ہے"۔۔ پس منظر سے طوفان کی گرج کے ساتھ چودھری اور رکما کی آوازیں اُبھرتی ہیں۔۔ دروازے پر دستک کی بھاری آواز پر رُکما پوچھتا ہے۔

"کون ہے؟"۔

"دروازہ کھولو رکما، میں چودھری ہوں"۔

رکما نے دروازہ کھولا۔ چودھری تیزی سے اندر آ گیا۔ سارا جسم بھیگا ہوا تھا۔

"چودھری۔۔ تم اس وقت؟۔ اتنی رات گئے۔؟"

"ہاں رکما۔۔ یہ باتوں کا وقت نہیں۔ دریا نے اپنا رُخ پلٹ دیا ہے۔ ساری بستی موت کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنی رات گئے ان بدنصیبوں کو کیسے بچایا جائے۔ رُکما ! سرجا کہاں ہے؟"۔

"اندر۔۔ سو رہا ہے"۔

"اُسے جگا دو رکما۔ سرجا اس سنکٹ کی گھڑی میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

اور پھر سرجا چودھری کے ہمراہ چلا گیا تھا۔ نہ جانے کب تک، طوفان کا بھیانک تانڈو جاری رہا۔ سورج نکلتا تو شاید وقت کا اندازہ ہوتا۔ گھڑیوں اور دنوں سورج نے بادلوں سے نہیں جھانکا۔ آسمان اور زمین ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے رہے۔ باہر نکلتے ہی خوف آتا تھا۔ جو کچھ تھا اس سے پیٹ کی آگ بجھائی جاتی رہی اور پھر فاقوں کا لامتناہی سلسلہ۔ راحت کے نام پر انسانیت کا اڑتا مذاق !

قدرت نے آدمی کو اسکے کردہ گناہوں کی جو سزا دی وہ مشیتِ ایزدی تھی لیکن خود آدمی کی ہاتھوں آدمی کی موت کا سودا ہوتے رُکما نے پہلی بار دیکھا تھا اور تب اُسے اپنے آپ سے اور اپنے اُس معاشرے سے گھن آئی تھی جس میں اُس نے زندگی کے معصوم دن گذارے تھے۔ لوگوں نے چتا کی لکڑی اور کفن کا کپڑا تک نہ چھوڑا تھا۔ شہر کے درندے انسان کا چولا پہنے بستی میں گھس آئے تھے اور یہ سب رکما نے اس وقت اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا جب دنوں کے بعد سورج نے اس بستی پر روشنی اور دھوپ پھیلائی تھی۔ اُف وہ دھوپ وہ روشنی کتنی خوفناک تھی۔ لاشیں در لاشیں۔ انسان جانور ایک ہی قطر میں پڑے سڑتے ہوئے۔۔ چیل اور گدھ اُنہیں نوچ نوچ کر کھاتے ہوئے اور انسانیت اور راحت کے نام پر دُہائی دینے والے عورتوں کے گلے اور ہاتھوں سے زیور نوچتے ہوئے۔ جن لاشوں پر چند مخیّر حضرات نے کفن ڈال دیا تھا کچھ ہی دیر بعد وہ لاشیں پھر برہنہ ہو چکی تھیں۔۔ وہ دن رُکما نے اپنے چھوٹے بیٹے سنتا کے ساتھ کن عذابوں میں گزارے تھے، یہ وہ ہی جانتا تھا۔ چودھری کے ساتھ سرجا جو گیا تو پھر لوٹا نہیں۔ کیچڑ اور دلدل میں پھنسی لاشوں کو تب پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مگر باپ

کی محبت اور بھائی کی اُنسیت انہیں سرجا کی کھوج میں بتائے رکھتیں۔۔ایسے ہی ایک دوپہر جب باپ اور بیٹا صاف سی جگہ دیکھ کر ستانے بیٹھے تو چودھری اُن کے قریب آ ٹھہرا تھا۔بے حال۔کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے۔چہرہ وحشت ناک۔ اسکے ہاتھ میں کیلے کے لمبے اور چوڑے پتے تھے۔اس نے ایک ایک پتہ دونوں کے آگے رکھ دیا۔رُکما نے دیکھا پتوں پر چند لقمے اُبلے ہوئے چاول رکھے تھے۔رُکما کی بھوک پیاس سب اُڑ چکی تھی۔اُسے تو صرف ایک ہی خبر زندگی سے سکتی تھی۔کوئی آئے اور کہے سرجا زندہ ہے۔نہ ہو یہاں کہیں اور ہو۔مگر حیات ہو۔!

"لو۔یہ کھالو۔تم دونوں نے کب سے کچھ نہیں کھایا۔"چودھری نے باری باری دونوں کو دیکھا۔"دیکھو! سب کا یہی حال ہے۔جو بچ گئے وہ بھی اور جو نہ بچے ان کو دوسرے جیووں نے اپنی خوراک بنالیا"۔دور کیچڑ میں دھنسے لاشوں کے ڈھیر کی طرف چودھری نے اشارہ کیا تھا جن پر گدھ منڈلا رہے تھے !

"تم اور ہم ابھی زندہ ہیں۔قدرت نے ہمیں زندہ رکھا ہے اور زندگی تم جانو بڑی نعمت ہے"۔

"اور سُرجا؟"۔رُکما نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔وہ چودھری کے چہرے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔مبادا چودھری کے چہرے سے مایوسی عیاں ہو !

"وہ۔۔اب کبھی نہیں لوٹے گا"۔چودھری کی آواز میں اس کے چہرے سے زیادہ کاٹ اور مایوسی تھی۔۔تب رکمانے محسوس کیا۔۔خون کا رشتہ ساگر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔سانس کے سارے بندھن اِس ایک جملہ سے ٹوٹ گئے۔ آہ! سُرجا اُس نے اپنے خون سے تعمیر کیا تھا،اُسے بوڑھا کر گیا۔سنتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب سنتا رہا۔منہ سے کچھ نہیں بولا۔تب چودھری نے اپنے ہاتھوں سے چند لقمے اُن کو زہر مار کرائے تھے !

آج پھر اماوس کی رات تھی۔تاریک سیاہ اُسے یاد آیا۔سائرن دو دن سے بستی والوں کو خبردار کر رہا تھا۔دریا میں اُٹھتے اور کچھ دم میں اس بستی تک پہونچنے والے طوفان کے واضح اشارے سرکار کی جانب سے دئے جا رہے تھے۔ہوائیں تیز اور تیز ہوتی جارہی تھیں۔پرندے اپنا مسکن چھوڑ کر پناہ گاہوں میں روپوش ہو چکے تھے۔بہت لوگ جو دریا سے زیادہ نزدیک تھے، محفوظ جگہوں پر اپنے ساز و سامان اور اپنی جانوں کے ساتھ منتقل ہو چکے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو قدرت کی جانب سے نازل کی جانے والے مصائب کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر چکے تھے۔ہمت،جرأت اور جواں مردی کے جذبات قدرت نے اسی لئے انسان کو ودیعت کئے ہیں کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔اُن نہ جانے والوں میں رُکما اور اس کا بیٹا سنتا بھی تھے۔۔نیند بھی انسان کی اہم ضرورت ہے۔موت کو قریب دیکھ کر بھی آدمی کی آنکھیں نیند کا بوجھ اُٹھانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔تمام سرکاری اعلانات اور تیز ہواؤں کے باوجود دونوں اپنی جھونپڑی میں سرِ شام ہی سو گئے تھے اور جب طوفان نزدیک آپہونچا تھا تب رُکما کی نیند ٹوٹی تھی اور طوفان کی گھن گرج نے چند سال پہلے گذرے روح فرسا واقعات اسکے ذہن میں تازہ کردئے تھے اور جوان بیٹے کی جدائی کا زخم ایسا تھا جو برس گذرنے کے بعد بھی مندمل نہیں ہوا تھا۔لاش مل جاتی تو شاید رُکما کی سوچیں ٹھہر جاتیں۔بے چین جذبوں کو قرار آجاتا اور زخم مندمل ہو کر اُسے سکون دے جاتے مگر سرجا کا نہ ملنا اُسے آج تک بے چین رکھتا رہا البتہ سنتا کو جب دیکھتا تو اُسے کسی حد تک صبر آجاتا مگر اگلے ہی پل ایک نامعلوم خلش اور ایک نامعلوم خوف اسکے اندر تک اُترتا چلا جاتا۔دریاؤں کے نزدیک آباد بستیاں کبھی محفوظ نہیں ہوتیں۔ہمیشہ موت کی آہٹیں ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو بے قابو کئے رکھتی ہیں۔رُکما نے کئی بار سوچا،جب بھی دریا نے اپنا مزاج تھوڑا سا بھی بدلا۔ذرا بھی دریا کے رویئے میں اُس نے بے رُخی محسوس کی،سنتا کو لے کر کسی شہر میں جا کر آباد ہونے کا ارادہ کر لیا۔سنتا ہی تو

اب اس کا سرمایہ اسکی رگوں میں گردش کرتے خون کی طرح اسکی زندگی کا ضامن تھا۔ سنتا کے لئے ہی اُس نے بارہا بستی چھوڑنے کا ارادہ کیا مگر جب بھی اُس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ چودھری اور بستی کے لوگوں سے زیادہ خود سنتا نے اسے روک دیا۔ اسکے فرار کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ اور رُکما بے بس ہو گیا!

بادل پھر تیزی سے گرجے۔ اس باران کی گرج پہلے سے کئی گنا زیادہ تھی۔ رُکما خیالات سے چونک کر چند قدم پیچھے ہٹا اور اسکا پیر کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کئی بھیانک سائے اسکے قریب سے گذر کر سنتا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سنتا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ آنے والے وقت کی دہشتناک رفتار بھی اُسے جگا نہیں سکی تھی۔ وہ اُن سایوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اسکا سارا جسم لرز اُٹھا اور بے اختیار اسکے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اتنی گرجناک اور ہواؤں کی وحشت زدہ آوازیں جو کام نہ کر سکیں وہ باپ کی چیخ کر گئی۔ سنتا ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ تیزی سے وہ باپ کے قریب آیا۔ اس نے محسوس کیا باپ سارے جسم سے لرز رہا ہے!

"کیا ہوا بابا پو؟ تم کس پر چلائے تھے"۔

"ایں۔۔ آں۔۔" رُکما نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنتا کو دیکھا۔ اسکے جوان جسم کی گرمی محسوس کی تو اسے قرار آ گیا!

"تو ٹھیک تو ہے نا؟"۔

"ہاں۔۔ مجھے کیا ہوا؟"۔

"نہیں۔ تجھے کچھ ہوگا بھی نہیں۔۔ تجھے کچھ ہونا بھی نہیں چاہئے"۔ رُکما نے اسکا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آج پھر طوفان آ رہا ہے۔ ویسا ہی جیسا برسوں پہلے آیا تھا۔ تب سُر جا ہمارے بیچ تھا۔ پھر۔۔ پھر جو گیا تو لوٹا نہیں"۔

"بھیا نے دوسروں کے لئے اپنا بلیدان دیا تھا۔ کتنے مہان تھے وہ۔ اگر مجھے بھی۔۔"

"نہیں سنتو۔ نہیں"۔ رُکما نے تڑپ کر اسکے منہ پر اپنا بوڑھا ہاتھ رکھ دیا!

"تو کہیں نہیں جائے گا۔ کہیں نہیں"۔

"پر بابا پو۔۔ ساگر کی گود میں رہنے والوں کو ان سنکٹوں کا مقابلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔

"سنکٹ کا مقابلہ انہیں کرنے دے جو اسکے نزدیک رہتے ہیں۔ ہم تو ساگر سے بہت دور ہیں"۔

"پر بستی سے الگ تو نہیں"۔۔ سنتا کی آواز میں جوان ارادوں کی پختگی تھی۔

"مرنا جینا، ہنسنا بولنا ہمارا انہیں کے سنگ تو ہے"۔

"میں نے کہا آفت آئے یا بلا۔ تو کہیں نہیں جائے گا"۔

"اچھا بابا پو۔۔ جیسا تم کہو"۔ اُس نے رُکما کو کھٹیا پر بٹھایا اور حقہ لا کر اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ رُکما حقہ پینے لگا۔ سنتا باہری دروازے کو مضبوطی سے بند کرنے جب دروازے کے نزدیک پہنچا تو اُس نے محسوس کیا کوئی دروازے کو اندر ڈھکیل رہا ہے۔ اُس نے دروازے کی سانکل گرائی اور اُسے کھول کر دیکھا۔ کچھ لوگ تھے۔ پانی میں شرابوران کے درمیان بستی کا بوڑھا چودھری بھی تھا۔ سنتا سب کو پہچانتا تھا۔ دروازے پر ہی وہ اُن سے باتیں کرنے لگا۔۔ رُکما نے حقہ گڑگڑایا اور ڈھیر سارا دھواں حلق سے خارج کر کے فضا میں چھوڑ دیا اچانک بجلی چمکی۔ لمحہ بھر کی تیز روشنی سرا منظر واضح کر گئی۔ رُکما کی بوڑھی آنکھوں نے دیکھا، سنتا اکیلا نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تھا اور کئی ہیولے اُسے دکھائی دے گئے۔ وہ حقہ رکھ کر تیزی سے دروازے پر آیا!

"کون۔۔ سنتو تو کس سے باتیں کر رہا ہے؟"۔

"باپو بستی والے ہیں۔ بچاؤ کام ہو رہا ہے۔ سرکاری امداد بھی نہیں آئی ہے۔۔"

"تو۔۔ تو یہاں کیوں آئے ہیں؟۔۔ یہ سرکاری دفتر تو نہیں ہے"۔

"یہ بات نہیں ہے رُکما"۔۔ بوڑھا چودھری آگے بڑھا اور رُکما نے چراغ کی آتی روشنی میں چودھری کو پہچاننے میں دیر نہیں لگائی۔ یہی تو وہ شخص ہے، جو اسکے بڑے بیٹے کو لے گیا تھا۔۔

اور ہاں یہی تو وہ شخص بھی ہے۔ جس نے سُرجا کے کبھی واپس نہ آنے کی خبر کے ساتھ اُن کے فاقہ زدہ پیٹ کو چاول کے چند لقموں سے راحت بخشی تھی۔ مگر رُکما نے پہلی بات کو یاد رکھتے ہوئے رُخ پھیر لیا!

"رُکما! قدرت کی ان دیکھی طاقت نے ہمیں پھر ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ساگر کی منہ زور موجیں بستی کو تباہ کرنے بڑھی چلی آ رہی ہیں"۔

"تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔

"وہی جو تم نے پہلے کیا تھا"۔

"ایک بیٹے کی بھینٹ چڑھانے کے بعد اب دوسرے کی بلی لینے آئے ہو؟"۔

"نہیں رُکما۔۔ سرجا تو بہت بہادر تھا۔ وہ بھینٹ نہیں چڑھا تھا۔ دوسروں کو بچا کر خود کو قربان کیا تھا اس نے"۔

"بیٹے کی بہادری کا تمغہ مجھے نہ دکھاؤ۔ تم میرے گھاؤ نہیں بھر سکتے"۔ رکما نے سخت لہجہ اختیار کر لیا۔

"دن روشن ہے یا رات کالی یہ دیکھنے کے لئے آنکھوں کی نہیں، جوت کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"اِدھر دیکھو۔۔ یہ نوجوان جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں، سنتا کی ہی طرح کسی کی سنتان ہیں۔ اپنے گھروں کے اُجالے ہیں مگر آج یہ اپنے چراغ سروں پر اُٹھائے تاریکیوں کا مقابلہ کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا تم اپنا چراغ دھیمے دھیمے ہی جلنے دو گے۔ اسکی لو تیز نہیں ہونے دو گے"۔

"نہیں۔۔ کبھی نہیں"۔

"باپو۔۔ زندگی ودھاتا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے ان کے ساتھ جانے دو باپو۔ جو بھیا کے ساتھ ہوا کیا ضروری ہے کہ تمہارے اس بیٹے کے ساتھ بھی ہو؟"۔

"نہیں سنتا۔ تو کہیں نہیں جائے گا۔ جاؤ چودھری! کوئی اور دروازہ کھٹکھٹاؤ"۔ رکما نے سنتا کا بازو پکڑ کر اندر ڈھکیلا۔

چودھری اور نوجوان مایوس ہو کر ابھی پلٹے بھی نہیں تھے کہ سنتا کی آواز سن کر ٹھہر گئے!

"رُکئے چودھری جی"۔ سنتا نے رُکما سے بازو چھڑا کر اسکے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ سنتا کی آواز گلوگیر ہو اُٹھی۔ "تم نے ہی تو مجھے آگے بڑھنا سکھایا ہے اور آج تم ہی مجھے۔۔۔"

"ہاں میں ہی تجھے پیچھے ہٹنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تجھے کھونا نہیں چاہتا سنتو"!

"میرے کھونے سے اگر دو جانیں بھی بچ گئیں تو تمہارے لئے اس سے بڑی خوش بختی کیا ہوگی"۔ سنتا نے رُکما کے دونوں ہاتھ چوم کر اپنی آنکھوں سے لگائے!

"زندگی تو چلتے رہنے کا نام ہے۔ رُکنے کا نام موت ہے۔ میرے رکنے سے کل تم ہی شرمندہ ہو گے باپو۔ سوچو! آج ساری بستی تمہیں تعظیم دیتی ہے۔ تمہارا سنکار کرتی ہے کیوں؟ کس لئے؟ وہ اسلئے کہ تمہارا بڑا بیٹا بے ڈر تھا۔ بے خوف تھا۔ اس نے پیٹھ دکھا کر زندگی نہیں اپنائی تھی۔۔ سینہ ابھار کر موت کی آغوش میں جا سمایا تھا"۔

یہ تو کبھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اتنی تعظیم، اتنا احترام، اتنی عزت۔ ہاں آج جو کچھ اسکے پاس ہے وہ سرجا کی قربانی کا صلہ ہی تو ہے۔ اُس نے ایک نظر چودھری اور نوجوانوں پر ڈالی اور جب بولا تو اسکی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی نہ لہجے میں ممتا بھری بزدلی۔

"جا میرے بیٹے۔۔۔ جا۔۔ سیکھ اپنے بھائی اور اپنے باپ کو شرمندہ نہ ہونے دینا"۔

اور سنتا ان سب کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کب تک کتنی دیر رُکما دروازہ کھولے کھڑا رہا تھا خود اُسے بھی یاد نہیں۔۔

اُس نے شہر نہیں دیکھے۔ شہر کیسے ہوتے ہیں؟ ان کی سڑکیں، سڑکوں پر دوڑتی موٹریں فلک بوس عمارتیں، ان عمارتوں میں رہتے کنبے اُن کنبوں میں بنتے مٹتے رشتے، مسکراہٹیں، زندگی لٹاتے جسم۔۔ ہاں کبھی اس نے سنا تھا کہ شہروں میں طوفان نہیں آتے۔ ساگر دیوتا شہر والوں سے ناراض ہو کر کبھی اُن پر اپنا قہر نہیں برساتے۔ اُس نے یہ بھی سنا تھا کہ شہروں میں عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہیں۔ شرم وحیا کی جگہ بے حجابی ان کے معاشرے کی پہچان بن گئی ہے۔ مگر یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ ضرور کام کرتی ہیں مگر ان کے گھونگھٹوں میں آج بھی حیا کے چاند روشن رہتے ہیں اور ان روشن چاندوں کو اُن کے گھر والے ہی رات کی تنہائی میں اپنے وجود میں اتارتے ہیں۔۔۔ پھر ساگر دیوتا اپنا رُخ اُدھر ہی کیوں نہیں موڑتے؟۔۔ کیوں حیوان نما انسانوں کے گھروں کو تباہ نہیں کرتے جو معصوم بے ضرر انسانوں کی اچھائیوں پر اپنی برائیوں کے قصر تعمیر کرتے ہیں؟۔۔ ہر بار قدرت ہم بے بسوں پر ہی کیوں اپنی بلائیں نازل کرتی ہے؟۔۔ محنت سے حلال کمانے والوں پر ہی آسمان کیوں اپنا جلال برپا کرتا ہے؟۔ کیوں اور کیوں؟ اور اِن کیوں کا کوئی مثبت جواب اسکے محدود ذہن نے نہیں دیا۔۔ تعلیم، تمدن، تہذیب اور ترقی یافتہ خوشبو کے قدم اسکی دھرتی نے نہیں لئے تھے۔ آسمان کو روشن کرتی بجلیوں نے آج بھی اسکی بستی کو بے رونق ہی رکھا تھا!

اپنی تمام گرجناک قوتوں اور ہولناک عفریتی طاقتوں کے ساتھ وقت گذرنے کا اُسے احساس نہیں ہوا۔ باہر کی بوچھاروں نے اسکا وجود پانی سے شرابور کر دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے بارش کا پانی اندر کے فرش کو گیلا کرتا گیا۔ اسکا ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پکڑے شل ہو چکا تھا۔ جسم ہر احساس کھو چکا تھا۔ سنتا کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاید سال بیت گئے یا شاید صدیاں۔ وہ تو اس وقت چونکا جب کل کل بہتے پانی کی آواز اسکی سماعت سے ٹکرائی۔ اُس نے غور سے سنا۔ بارش تھم چکی تھی۔ کوئی گرج کوئی چمک نہیں تھی۔ طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا سناٹا لامتناہی سناٹا ہر سو طاری تھا۔ صرف تیزی سے بہتے پانی کی آواز اس سناٹے کو منقطع کر رہی تھی۔ اُس نے غور سے سنا۔ ہاں کچھ اور آوازیں بھی بہتے پانی کی آوازوں میں شامل ہو گئی تھیں۔ ہاں یہ قدموں کی آوازیں تھیں۔ چھپ چھپ چھپ چھپ۔ لمحہ در لمحہ اس کی طرف بڑھتی آوازیں اُس نے تاریکی میں نگاہیں گاڑھ دیں۔ کچھ ہیولے تھے جو اسکی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ ہیولے آہستہ آہستہ انسانی جسم اختیار کرنے لگے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ کچھ ہاتھ ایک انسانی وجود کو اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر گنگ ہو گیا۔ نہ ٹھہرا گیا نہ آگے بڑھا گیا اُس سے۔ وہی نوجوان تھے جو سنتا کو لے گئے تھے اور سنتا؟۔۔ انہوں نے جھونپڑی میں داخل ہو کر اس جسم کو چارپائی پر ڈال دیا۔ رُکما لرز گیا۔ اسکا جسم ساری توانائی کھو گیا۔ اس نے متوحش نگاہوں سے دیکھا۔ یہ تو اسکا بیٹا سنتا ہے۔ اس کا بیٹا۔ تو کیا یہ بھی؟۔

"کیا ہوا اسے" اس نے وحشت ناکی سے پوچھا۔ "چودھری۔ تم سر جھکائے کیوں ہو؟ بولو۔ میرے سنتا کو کیا ہوا؟۔

"یہ بے ہوش ہے کاکا"۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر رُکما کو دلاسہ دیا۔ کاکا۔ وہ مضطرب ہو گیا مگر اس اضطراب میں

بھی ایک ٹھہراؤ اس نے محسوس کیا۔

"کاکا۔ سنتا نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کئی جانیں بچائی ہیں"۔

"پر یہ بے ہوش کاہے کو ہے؟"۔

"ساگر کی لہریں اسے بہالے گئی تھیں"۔ اُسی نوجوان نے بتایا۔ رکما نے چودھری کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"سنتا کے بچنے کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی تھیں پر۔ جانتے ہو کاکا؟"۔ اس کا دوسرا ساتھی بولا۔

"سنتا کی جان کیسے بچی؟"۔ رُکما منتظر تھا کہ وہ خود ہی سب کچھ بتادے۔

"چودھری جی کے بیٹے نے سنتا کی جان بچائی"۔

"اور چودھری۔۔تمہارا بیٹا؟"۔

رکما نے تڑپ کر سوال کیا۔ تب سب کی گردنیں جھک گئیں۔ نگاہیں فرشِ راہ ہو گئیں۔ یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ فرش زیادہ گیلا تھا یا آنکھیں زیادہ نمناک تھیں۔ رکما نے متوحش ہو کر چودھری کو دیکھا۔ چودھری نے بھی رکما کو دیکھا لیکن اب اسکی آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ ایک چمک تھی ایسی چمک جو انسان کو آدمیت کا درجہ عطا کرتی ہے۔ رکما مضطرب ہو گیا مگر اس اضطراب میں بھی ایک ٹھہراؤ اُس نے محسوس کیا جیسے قدرت نے اس کا قرض چکا کر اسے چودھری کا مقروض کر دیا ہو!

صبحیں جب ساگر کے پانیوں کی اوٹ سے طلوع ہوتی ہیں تو بے حد سہانی ہوتی ہیں۔ ایسی صبحیں بستی والے ہر روز ہی دیکھتے تھے۔ ایسی صبحیں زندگی کو حرارت اور حرکت دے کر مضبوط ارادوں کی طرف گامزن کرتی رہتی آئی تھیں لیکن یہ صبح ہر صبح سے الگ تھی۔ ایک دم الگ۔ خوفناک، بھیانک، ہتک آمیز اور نفرت خیز۔ زندگی سے جن کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا، اُن کی لاشوں کو قدرت نے درندوں کی خوراک بنا دیا تھا تاکہ وہ اپنی زندگی کی توانائی پا سکیں!

چار دن بیتنے کے بعد بھی سرکار کی طرف سے کوئی راحت مہیا نہیں کی گئی تھی۔ سب بے امان تھے۔ گھر ٹوٹے تو زندگی کا سارا اساسہ بھی ساگر اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔ گیلی کیچڑ بھری زمین اور اوپر تاریک کھلا آسمان اب ان کا مسکن تھا۔ سرد ہوائیں ننگے جسموں کی پرتوں میں ننھی ننھی سوئیاں چبھو کر اپنی برتری کا احساس دلا رہی تھیں۔ سورج تو شرمندگی سے چہرہ کہیں چھپائے کہیں دور پنی کرنیں سمیٹ لے گیا تھا۔ سڑکوں کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ بھیانک گڑھے جا بہ جا نمودار ہو گئے تھے۔ بجلی کے کھمبے، تار سب ٹوٹ کر دور تک بکھرے پڑے تھے۔ ناریل، کھجور اور بڑے درخت زمین بوس ہو گئے تھے اور ان کی جڑوں میں اندھیرے غار اپنا منھ کھولے بیٹھے تھے۔ پانی کیچڑ اور کیچڑ دلدل بن گئی تھی۔! بھوک نے پیٹوں کو پیٹھ سے چپکا دیا تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی نہریں بھوک نے چوس لی تھیں۔ آنکھیں بصارت کو سمیٹ کر حلقوں میں جا بیٹھی تھیں۔ ننگے بدن کمر کمر دلدل نما کیچڑ میں غذا کی تلاش کرتے دور تک نکل گئے تھے مگر۔۔۔ کیوں ہوتا ہے ایسا؟۔ یہ سیلاب، یہ زلزلے، یہ آگ زنی، یہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے ذریعہ ہوتی قتل و غارتگری، یہ سارے قدرتی عذاب ہم نردھن، محنت کش اور غریب انسانوں پر ہی کیوں بپا ہوتے ہیں؟ متمدن، دولت مند اور گناہوں کو غذا کی طرح استعمال کرتے انتہائی مہذب ملکوں اور شہروں پر کیوں نازل نہیں ہوتے؟ کیوں صرف ہمارے لئے وقت ستم پیشہ بنتا ہے؟ کیوں جیون کی وناش لیلا صرف ہمارا مقدر ہے؟ آسمانی آسنوں پر بیٹھا وہ خدا۔۔ وہ آب و آتش اور ہر شے پر قادر وہ خدا صرف ہمارے مقدرات میں سارے عذاب، سارے مصائب، سارے دکھ اور ساری کلفتیں لکھ کر

تماشبین کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔ یہ تضاد کیوں؟۔۔ یہ فرق کس لئے؟ ایک کے لئے عذاب ہی عذاب، دوسرے کے لئے راحت بھی اور راحت کا سامان بھی !

رُکما کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔۔ معدے میں جیسے یہ سب سوچ کر اینٹھن جاگ اٹھی، اس سے پہلے کہ یہ اینٹھن معدے سے باہر آئے، اُس نے اس کڑواہٹ کو تھوک دیا !

اعلان بہت ہوئے مگر صرف تسلی کے لئے۔ کیمرہ ٹیمیں اپنے کیمرے سنبھالے سارے مناظر کو کیمروں میں قید کرتی پھر رہی تھیں۔۔ میڈیا بہت فاسٹ ہو چکا ہے۔ لحہ لحہ کی تصاویر شہروں شہروں اور دنیا کے گوشے گوشے تک پہونچ رہی ہوں گی مگر۔۔ رُکما نے سوچا، اس عظیم الشان دنیا میں جہاں کوئی ہتھیاروں کے ذخائر انسان کی پوری خلقت سے زیادہ ہیں کیا ان ذخیروں میں ایسا کوئی ہتھیار نہیں جو گولی اور بارود کے بدلے غذا اُگل سکے؟

اسکے حلق میں کڑواہٹ گھلتی چلی گئی۔۔ طبیعت میں تکدر آ گیا۔۔ یہ کیا نظامِ بنی نوع انسان ہے جہاں موت سے لڑتے نبرد آزما ہوتے، بھوک سے موت کی آغوش تک پہنچتے، گھر، دوار چھت دیوایں، جسم، کپڑے اور ضرورت کی بھی تباہ کاری پل بیتنے متمدّن، مہذب اور طاقتور ملکوں تک پہونچ جاتی ہیں لیکن ان سے ہم تک غذا کا معمولی ذخیرہ بھی نہیں پہونچ سکتا۔ امریکہ اپنی تباہی پر افغانستان کو زمین بوس کرنے کے لئے اپنی تمام تر جنگی قوت سے پلک جھپکتے ہزار ہا میل کا سفر طے کر لیتا ہے مگر دہلی سے اس بستی تک چند سیکڑہ کلومیٹر خوراک کا کوئی قافلہ طے نہیں کر پاتا؟۔۔ کیوں؟ آخر کیوں؟۔۔ شاید کسی نے اسی لئے کہا ہے کہ ہنوز دہلی دور است !

سڑک سے کسی کے آنے کی امید حسرت میں بدل گئی آنکھیں آسمان پر پانی سے بھری بدلی کی خواہش کے لئے نہیں بلکہ کسی امدادی ہیلی کاپٹر کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں۔۔ شاید کوئی ہیلی کاپٹر آسمانوں کی وسعتوں میں نمودار ہو اور کھانے کے پیکٹ گرا دے جو ہوا میں قلابازی کھاتے ان کی پہونچ سے بھلے ہی دور گریں لیکن یہ تو امکان ہو کہ کچھ دیر سے سہی ان کے ہاتھ پیکٹوں تک پہونچ جائیں گے !

مگر آسمان اسی طرح صاف رہا۔ میڈیا کے ساتھ کچھ نیتا بھی آ گئے تھے۔ جنھوں نے سروں پر گاندھی کیپ اوڑھ رکھی تھی۔ ان کی حفاظت کے لئے کچھ پولس والے بھی تھے جو تسلی دیتے پھر رہے تھے۔ رُکما نے انہیں دیکھا اور نفرت سے اپنی تلخی کو تھوک دیا۔ اس نے اپنی نظریں ان پر سے ہٹا لیں۔ بہتر سمجھا کہ ان کے مقابلے میں ان لاشوں کو دیکھنا آسان اور اچھا ہے مگر اس نے محسوس کیا کہ اُس نے کچھ اور بھی دیکھا ہے۔ شام کے اُترتے دھندلکے میں اس نے کچھ دیکھا تھا۔۔ ہاں یقیناً۔۔ یہ اسکی نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ کسی نیتا کے اشارے پر پولس والوں نے سفید ساڑی میں لپٹا ایک جسم اٹھا رکھا تھا۔ جسم احتجاج کر رہا تھا۔ کسمسا رہا تھا مگر غالباً اسکا منہ باندھ دیا گیا تھا جس سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ جسم اُٹھائے ان درختوں کی طرف جا رہے تھے جو تھے تو زمین بوس مگر زمین کے ایک وسیع قطعے کو انسانی نظر سے چھپا لیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیزی سے درختوں کی اوٹ میں گم ہو گئے۔ اب رُکما کے لئے ٹھہرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے ایک موٹی لکڑی نظر آ گئی۔ اس نے لکڑی ہاتھ میں تھامی اور درختوں کی طرف چل پڑا۔

اس نے درختوں کے دوسری جانب دیکھا۔ شام کا ہلکا اُجالا ابھی معدوم نہیں ہوا تھا مگر دور دور تک کسی کے آثار نہیں تھے۔ رُکما کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس نے آس پاس ساری جگہ چھان ماری لیکن۔۔ اچانک اسکی سماعت نے کچھ محسوس کیا۔ یہ کسی کی سرگوشی ہی تھی جو اسکے کانوں تک پہونچی تھی۔ اندازے سے وہ آواز کا تعین کر کے آگے بڑھا۔ ایک بڑے سے گڑھے

میں اس نے وہ منظر دیکھ لیا جسے دیکھنے کے لئے اسکا سارا جسم آنکھ اور سماعت بن چکا تھا۔

نازک اور کامنی سا جسم زمین پر پڑا تھا۔۔سفید ساڑی سینے سے ہٹی ہوئی تھی۔ سینے پر بلاؤز نام کا کوئی کپڑا نہیں تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور کالی سیاہ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔۔قانون اور اقتدار کے پنڈت راج ہنسوں کی شکل اختیار کئے تین شیطان درندے اپنی ہوس پوری کرنے اس بے بس ناتواں عورت پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک سرہانے بیٹھا اسکے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ دوسرا اپنی باری کا منتظر تھا اور تیسرا تقریباً اپنی ہوس کی شیاہ پر بیٹھ چکا تھا۔۔رُکما نے لمحے بھر کو سوچا۔ گدھ اور جنگلی درندے ان درندوں سے بہت کم تر ہیں جن کی غذا قدرت نے انسان کے مرنے کے بعد مقدر کی ہے اور جسکے مردہ گوشت سے وہ اپنی توانائی بحال رکھتے ہیں لیکن یہ انسان حیوان۔۔اس نے آگے نہیں سوچا۔ سارا جسم جیسے آتش فشاں بن گیا اور لاوا اُبلنے کو بیتاب ہو گیا۔ وہ بوڑھا ضرور ہوا تھا مگر ساگر پر ناؤ کھینچتے اور جال ڈالتے ہوئے اسکے بازو آج بھی توانا تھے۔ ایک ہی جست میں وہ گڑھے میں کود گیا۔ اسکا چجا نپا تلا ہاتھ پہلے شخص کے سر پر پڑا۔ چٹاخ کی آواز اُبھری۔ اس نے اسے دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ دوسرا اور تیسرا اور دونوں کو زمین بوس کر گیا۔۔تینوں کے سر دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور ایک ایک وار میں ہی قانون اور اقتدار کے یہ "پاسبان" بے امان ہو چکے تھے۔!

رکما نے جلدی سے آگے بڑھ کر زمین پر پڑی لڑکی کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ اسکی ساڑی سے اُسے ڈھکا اور منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا نکال دیا۔ لڑکی چیخ مار کر رُکما کے سینے سے آ لگی۔

"کاکا۔"

"تو کون ہے بیٹی؟"۔

"بہو ہوں کاکا۔۔تمہاری"۔

"میری بہو؟ لیکن؟" وہ الجھ گیا۔۔ابھی تو سنتا کے بیاہ کا تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"میں منسی ہوں کاکا۔۔چودھری جی کے بیٹے کی ودھوا"۔

"اوہ۔۔" پل بھر میں رُکما سب سمجھ گیا اور اُسے ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ یہ سوچ کر مسرور ہو گیا کہ آج وہ چودھری کے قرض سے آزاد ہو گیا ہے !

اُردو ادب کے رستوں پر جو اہلِ قلم خموشی کے ساتھ سرگرم سفر ہیں ان میں رشید انجم کا نام پہلی صف میں شامل ہونا چاہیے۔ تخلیق و اشاعت کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جس شاعر یا ادیب نے تھوڑا بہت بھی لکھ لیا ہے، اُسے طباعت کے لئے کسی نہ کسی اکیڈمی سے جزوی یا کلی مالی تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ رشید انجم کا معاملہ مختلف ہے۔ اول تو انہوں نے تھورا بہت نہیں بہت زیادہ لکھا ہے، دوسرے یہ کہ نہ کسی اکیڈمی کے آگے دست طلب دراز کیا اور نہ انعام واکرام کے لئے سفارشیں کروائیں۔ نتیجے کے طور پر انعام اور مالی تعاون دونوں ہی ان سے خفا خفا اور دور دور رہے۔ اس کے باوجود رشید انجم نے ان دونوں کو راضی کرنے کی وہ تدبیریں نہیں کیں جو رائج الوقت ہیں۔ مگر تخلیق و اشاعت کا سفر اُسی طمطراق سے جاری رکھا۔

رشید انجم کے ذوق و شوق کا میدان خاصا وسیع رہا ہے۔ ان کے فلمی مضامین شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ جن اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ، فلمی اسکرپٹ اور ترجمہ بھی کچھ شامل ہیں۔ صحافت میں دلچسپی لی تو ''فلم دیش''، ''سمجھوتہ'' اور ''گل مہر'' اُردو ویکلیز جاری کئے (اور اب پندرہ روزہ ''صدائے اُردو'' ان کے قلم کی جولانیاں سہہ رہا ہے)

ڈرامے سے انہیں گہری اور خصوصی دلچسپی ہے۔ اس صنفِ ادب سے ان کا تعلق صرف قلم کی حد تک محدود نہیں ہے، انہوں نے ڈرامے اسٹیج بھی کئے ہیں اور ان میں اداکاری بھی کی ہے۔ وہ بڑی صلاحیتوں کے فن کار ہیں۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ وہ ایک فطری رقاص بھی ہیں۔ رقص کی باریکیوں پر نگاہ رکھنے والے باذوق ناظرین نے ان کا اندازِ کتھک دیکھا ہے۔ وہ اس دقیق فن کی نزاکتوں کے اظہار پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدے، تجربے اور ذوق و شوق کے تمام سرچشموں سے ڈرامے کی آبیاری کی ہے۔ ان کے کردار تاریخی ہوں یا معاشرتی، زندگی کی تلخ و شیریں صداقتوں کے آئینہ دار ہیں اور اپنے قول و عمل سے اپنا تعارف کراتے ہیں۔ مکالمے برجستہ اور کرداروں کی ذہنیت، علم، عمر اور جنس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

فکشن سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے شاعری کی جانب انہوں نے بہت کم توجہ دی ہے، حالانکہ ان کی شاعری بھی خاصے کی چیز ہے۔

پروفیسر خالد محمود
شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی